حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

دعواتِ عبدیت

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون ۲۷۷۶۲۰ - ۲۷۰۰۹۴

کتب خانہ اشرفیہ
قاسم سینٹر، دوکان نمبر ۳۳، اردو بازار کراچی
فون ۲۲۱۳۰۵۸

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد سوم کا

پہلا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ الاعتناء بالدین

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبدالمنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

متصل مسافرخانہ۔ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی نمبر ۱

دعوات عبدیت جلد سوم کا

پہلا وعظ مقلب بہ ضرورۃ الاعتناء بالدّین

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد	۳ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹہ	بیٹھکر	ضرورۃ اہتمام دین	مولوی سعید احمد تھانوی	۱۰۰۰ تقریباً	عربی طلبہ اور عوام الناس کا زیادہ مجمع تھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (ترجمہ) اے رب ہمارے اور بھیجئے ان میں ایک رسول جو انہیں میں سے ہو۔ پڑھے ان پر آیتیں آپ کی اور سکھا دے ان کو کتاب آپ کی اور حکمت اور پاک کرے ان کو آپ قدرت والے ہیں حکمت والے ہیں۔

یہ ایک آیت ہے جس کے نظائر قرآن میں اور بھی ہیں یعنی دوسرے مقامات پر بھی یہ مضمون قرآن میں آیا ہے۔ اس مقام پر یہ مضمون حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنائے کعبہ کے وقت جو دعائیں ان دونوں صاحبوں نے کی ہیں اُن میں

ایک دعاء یہ بھی ہے کہ جس کا نفع اُن کی اولاد کو پہنچا. ان حضرات نے اوّل اپنے لئے دُعاء کی اُس کے بعد اپنی اولاد کے لئے دُعاء کی منجملہ دعا للاولاد کے یہ بھی ہے. حاصل اُس دعا کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسمٰعیل علیہما السّلام نے اپنی اولاد کو ایک دینی نفع پہونچایا اس دعا کے طرز سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امرِ اصلی قابلِ التفات نفعِ دینی ہے اور نفع دینوی اُس کے تابع اور اُس کے ساتھ ملحق. ہم کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے سبق لینا چاہیئے کہ اُنھوں نے جہاں اپنی اولاد کے لئے نفعِ دنیاوی کی دعا کی کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُن کی اولاد میں جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اُس کو پھلوں سے رزق پہونچائیے. وہاں اس دینی نفع کی بھی دعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ الخ تو نفع دنیاوی کے لئے دعا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ضروری ہے اور ظاہر بھی ہے کہ اگر دنیا کا نفع نہ ہو تو دنیا میں بہت کم طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوں. پس اپنے رزق کی وسعت کے لئے اپنی صحت کے لئے بھی خدا تعالےٰ سے دعا کرنی چاہیئے اور یہ ہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب ایک صحابی کو دیکھا کہ بہت لاغر ہو رہے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم نے کچھ دعا تو نہیں کرلی کہنے لگے کہ ہاں دعا تو کی تھی آپ ؐ نے فرمایا کیا دعا کی تھی کہنے لگے کہ یہ دُعا کی تھی کہ جو کچھ عذاب ہونا ہو دنیا ہی میں ہو جاوے آپؐ نے اُن کو متنبہ فرمایا. تو یہ غلطی کی بات ہے کیونکہ انسان ضعیف ہے اور احتیاج اُس کے خمیر میں ہے. ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ میرے لئے دس؁ روپے کا انتظام کردیجئے کیونکہ مجھے سخت ضرورت ہے اس کے بعد اِدھر اُدھر کا تذکرہ کرکے لگے فقیری کا دم بھرنے لگے کہ جنّت کی کیا پرواہ ہے اور دوزخ کا کیا ڈر ہے میں نے کہا میاں بیٹھو تم سے دس روپے سے تو صبر ہو نہیں سکا جنّت سے کیا صبر کرسکو گے اگر ایسے مستغنی تھے تو دس روپے ہی سے صبر کرلیا ہوتا. تو واقعی ایسا انسان محتاج ہے کہ دُنیا اور آخرت دونوں کی اس کو ضرورت ہے اور آخرت کا دنیا سے زیادہ محتاج ہے اسی لئے ابراہیم علیہ السّلام نے جیسے دنیا کے لئے دُعا کی ایسے ہی آخرت کے لئے بھی دُعا کی تو گویا ہم کو

سبق سکھلاتے ہیں اور اولاد عام ہے خواہ اولاد حقیقی ہو یا مذہبی بلکہ اولاد حقیقی بھی جب اولاد ہوتی ہے کہ اتباع کرے چنانچہ ارشاد ہے مَنْ سَلَكَ طَرِيْقِيْ فَهُوَ اٰلِيْ جو میرے طریقے پر چلا وہ میری اولاد ہے گو بعض لوگوں نے مَنْ سَلَكَ طَرِيْقِيْ کو عام لیا ہے کہ جو شخص بھی متبع ہو وہ آل میں داخل ہے خواہ نسبتاً آل ہو یا نہ ہو مگر میرے خیال میں اتنا عام نہیں بلکہ صرف آل کو عام ہے پس مطلب یہ ہے کہ اولاد نسبتی میں متعد بہ آل وہ ہے کہ اتباع کرے یعنی شرف تو صرف اولاد ہونے سے بھی ہوگا لیکن پورا شرف اُسی وقت ہوگا کہ جب اتباع ہو. تو مَنْ سَلَكَ آل ہی کے لئے ہے مگر آل ہی میں ایک قید معتبر ہے کہ معتد بہ درجہ میں شرف اُسی وقت ہوگا بہرحال انبیاءؑ کی اولاد بھی وہی مقبول ہے کہ جو متابعت رکھتی ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے غلط لکھا ہوا قرآن کہ اُس کا نہ ادب ہے نہ بے ادبی۔ ادب تو اس لئے نہیں کہ وہ صحیح قرآن نہیں ہے اور بے ادبی اس لئے نہیں کی جائے گی کہ کچھ تو قرآن کے اجزا ہیں تو انبیاءؑ کی زیادہ نظر اس پر ہے کہ دین کا نفع ہو اور آل ہو تو ایسی ہو کہ وہ اُن کے قدم بقدم ہو. تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریۃ کے لئے یہ دعا کی اور اس سے گویا ہم کو یہ سبق سکھلایا کہ اپنی اولاد کے لئے دنیا سے زیادہ اہتمام دین کا کرنا چاہئے۔ اَب ہم کو سبق لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ ہم کہاں تک اپنی اولاد کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلتے ہیں. میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ اپنی اولاد کے حقوق ادا نہیں کرتے لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ توجہ محض دنیا پر ہے اس کی زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ اولاد چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاوے اور جب اس قابل بنا دیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے حقوق واجبہ ادا کر چکے آگے اپنی اصلاح یہ خود کرلیں گے اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے دین کی وقعت بالکل نکل گئی ہے اس لئے ہمہ تن دُنیا پر جھک پڑے ہیں. اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہ تھی اس لئے ان کو دنیا کی طرف توجہ نہیں ہوئی تو عقل اور نقل دونوں اس شبہ کی تکذیب کر رہی ہیں. نقل تو یہی سابق دُعاء جو اپنی اولاد کے لئے انہوں نے فرمائی وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ ۔ اور عقل اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حق سبحانہ وتعالےٰ کے نائب ہیں اور جیسے حق سبحانہٗ وتعالےٰ معاش اور معاد دونوں کی تربیت

فرماتے ہیں حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے نائب بھی دونوں کی تربیت فرماتے ہیں کیوں کہ ان حضرات کو اصلاح کیلئے بھیجا جاتا ہے اور اصلاح اُسوقت تک ممکن نہیں جب تک کہ معاش اور معاد دونوں کی اصلاح نہ کی جاوے نیز تاریخ اور انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاءؑ کو عقل معاش بھی کامل ہوتی ہے مگر لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں عقلِ معاش ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نوکریوں اور صنعتوں کے طریقے بتلادیں لوگ یہ ہی سمجھ کر بزرگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں. باوجودیکہ دنیا کی ضرورت یقینی ہے مگر یہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے. صاحبو یہ تسلیم ہے کہ دنیا کی ضرورت ہے لیکن اوّل تو یہ غور کیجئے کہ ضرورت کس کو کہتے ہیں دوسرے معاش کے طریقے بتلانا اور اس پر ترغیب دینا یہ علماء کا کام نہیں ہے. دیکھو حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالمجید اپنے فن کے ماہر تھے اور اُن کا کام یہ تھا کہ وہ امراض کی تشخیص کریں اب فرض کرو کہ ایک مریض اُن کے پاس آیا حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر تپ دق تجویز کی اور اس کے لئے نسخہ لکھدیا جب وہ نسخہ لے کر چلا تو رستے میں ایک موچی ملا اور اس مریض کی کیفیت دریافت کی اُس نے کہا کہ حکیم صاحب نے تپ کہنہ تجویز کیا ہے کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے جوتے کے متعلق کچھ کہا اس نے کہا کہ جوتے کے متعلق تو کچھ نہیں کہا کہنے لگا کہ وہ حکیم نہیں ہے اُن کو اتنی ضرورت کی تو اطلاع نہیں یہ نہ دیکھا کہ ایک شخص جوتے لئے بیٹھا ہے اور یہ ننگے پیر ہے آخر اس کو جوتہ پہننا چاہیئے یا نہیں اب میں پوچھتا ہوں کہ اس موچی کی نسبت آپ کیا فتویٰ دیں گے کیا اُس کو عقلاء میں شمار کیا جاوے گا ہرگز نہیں بلکہ پاگل کہا جاوے گا اور کہا جاوے گا کہ اس نے طبابت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور اُس کے فرائض منصبی پر اُس کو اطلاع نہیں. البتہ حکیم پر اُس وقت الزام تھا کہ وہ نسخے کے اندر بلا وجہ یہ کہدیتے کہ جوتہ نہ پہننا اور جب کہ وہ اس سے سکوت کرتے ہیں تو اُن پر کوئی الزام نہیں وہ اپنے فرضِ منصبی کو ادا کر چکے. تو علماء پر دنیا کی ترغیب نہ دینے کا الزام اس وقت ہو سکتا تھا کہ جب اُن کا فرضِ منصبی ترغیب دینا ہوتا یا وہ دنیا حاصل کرنے اور اُدھر متوجہ ہونے سے روکتے اور اگر کہیئے کہ علماء تو روکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یہ روکنا بلا وجہ نہیں اس روکنے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے حکیم عبدالمجید کسی کو دیکھیں کہ اس نے

اس طرح جوتی سلوائی کہ ٹانکے کھال کے اندر سے نکالے گئے ہیں تو وہ اس طرح سے جوتہ سلوانے کو ضرور روکیں گے کہ زخم کی سمیت تمام بدن میں دوڑ جانے کا احتمال ہے آپ لوگ بھی دنیا کی جوتیاں اس طرح سلوار ہے ہیں کہ آپ کا دین برباد ہورہا ہے لہذا اب اُن پر فرض ہے کہ وہ آپ کو منع کریں تو یہ منع کرنا بے وجہ نہ ہوا ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

اگر نابینا کے سامنے کنواں دیکھ کر بیٹھ رہوں تو گناہ ہے۔

غرض علماء کی نسبت یہ تجویز کرنا کہ وہ دنیا کی ترغیب دیں غلط ہے اور مبنیٰ اس کا یہ ہے کہ سلف کو اپنی طرح معاش و معاد کا جامع سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ بتلائیے کسی نبیؑ نے کسی رفادمر نے کہیں دنیا کے حاصل کرنے کے طریقے لکھے ہیں ایک جگہ بھی نہیں۔ البتہ اخلاق اعمال معاشرت پر گفتگو کی ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتلایا کہ یوں ہل چلتا ہے اور اس طرح بویا جاتا ہے انبیاءؑ اور سلف کا یہ کام نہ تھا۔ ہاں معاش کا وہ حصہ جو مضر معاد ہو اُسکو بتلا کر منع فرما دیا ہے اور اُس میں گفتگو کرنا ایسا ہے جیسے طبیب کسی مریض کو گوشت کھانے سے منع کرے تو حکیم کا کام بحالتِ ضرر منع کرنے کا تو ہے لیکن گوشت کے پکانے کا طریقہ بتلانا یہ حکیم کا کام نہیں پس معاش کے متعلق انبیاءؑ کی جو گفتگو ہے وہ یہ ہے کہ نافع کو مجملاً بتلا دیا اور مضر کو منع کر دیا غرض انبیاء علیہم السّلام نے اپنی اولاد کے لئے اس کی رعایت کی ہے کہ دینی نفع اُن کو زیادہ پہونچے اور دنیاوی نفع کے واسطے جو رعایت رکھی ہے اُس سے اُن حضرات کا مذاق معلوم ہوتا ہے ابراہیم علیہ السّلام فرماتے ہیں مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اے اللہ میرے اہلِ بلد کو ثمرات دے مگر سب کو نہیں بلکہ اہل ایمان کو تو فرمانبردار اولاد کے لئے دعا کی اس سے اندازہ کیجئے کہ اُن کی نظر میں دین کس قدر عزیز ہے کہ باغی کے لئے دعا بھی گوارا نہیں اگرچہ خدا تعالےٰ نے تخصیص نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا جس نے کفر کیا اُسے تھوڑا نفع پہونچاؤں گا۔ یعنی کچھ دنوں کے لئے دنیا میں کفار کو بھی عیش دوں گا تو اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت کو عام فرمایا مگر حضرت

ابراہیم علیہ السّلام نے بوجہ کفار کے باغی ہونے کے اُن کے لئے دعا نہیں فرمائی اس سے حضرات انبیاء علیہم السّلام کے مذاق کا پتہ چلتا ہے یہی اہل اللہ کا ذوق ہے اور ہونا چاہئے کہ باغیوں پر کچھ رحم نہ کریں نہ اُن کے لئے دُعا کریں اور خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا قول نقل فرما کر چونکہ کفار کے لئے دُعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ ذوق مقبول ہے تو یہی مذاق ہونا چاہئے کہ مطیعین کے لئے دعا کریں اور باغیوں کو خدا کے سپرد کریں خیر یہ جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام نے جو دُعا کی ہے اُس کا مضمون قابل غور ہے اور اس وقت اس کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا. چونکہ ہم میں اس وقت ایک بہت بڑا مرض ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے وہی اصلی مرض پیدا ہو گیا ہے یعنی قلتِ اہتمام دین اور یہ وہ مرض ہے کہ اسکی بدولت آج ہم مسلمان کہلانے کے قابل نہیں رہے اسکی بدولت اکثر حصہ دین کا ہم سے نکل گیا دیکھو مالدار وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس کافی سے بھی کچھ زیادہ مال ہو اور جس کے پاس دو چار پیسہ ہوں وہ مالدار نہیں کہلاتا ورنہ چاہئے کہ ساری دنیا مالدار کہلانے لگے. حالانکہ ایسا نہیں بلکہ دو قسمیں کہی جاتی ہیں ایک غریب ایک امیر تو جیسے مالدار وہ شخص ہے جس کے پاس وافر روپیہ ہو اسی طرح ایماندار بھی وہی ہے جو عقائد اور اعمال وغیرہ میں پوری طرح شریعت کا متبع ہو اور یہ ایمان کچھ ایمان نہیں جس کو اکثر لوگوں نے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ سے سمجھ رکھا ہے اگرچہ یہ کلمہ واقع میں صحیح ہے لیکن اس وقت اس کو پیش کر کے جو مقصود ثابت کیا جاتا ہے اُس کے اعتبار سے کَلِمَۃُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِہِ الْبَاطِلُ بات تو ٹھیک ہے لیکن اس سے باطل کا قصد کیا جاوے۔ کہا جاسکتا ہے تو پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اعمال کو نا قابل شمار سمجھتے ہیں دوسرے یہ کہ خود ایمان کے کلمہ میں بھی اختصار کیا ہے یعنی اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے کی بھی ضرورت نہیں (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) میں نے خود یہ تقریریں چھپی ہوئی دیکھی ہیں کہ رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے مجھ سے ایک سفر میں اس کے متعلق ایک صاحب نے دریافت کیا کہ وہ بھی اس مرض میں مُبتلا تھے میں نے کہا آپ یہ بتلائیے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں یٰسین پڑھتا ہوں تو اس یٰسین پڑھنے کے کیا معنی ہیں آیا یہ کہ صرف یہ کلمہ

پڑھتا ہوں یٰسین یٰسین یا یہ کہ ساری سورت پڑھتا ہوں کہنے لگے کہ یٰسین پڑھنے کے معنی تو ساری سورۃ پڑھنے کے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے کے معنی سارا کلمہ پڑھنے کے ہیں دلالت کے لئے صرف ایک جز کا اطلاق کافی ہے دوسرے جز پر بوجہ ملازمت خود دلالت ہو جائے گی ان لوگوں کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے کے معنی سمجھنے پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا ریاست رامپور سے ایک طالب علم نے میرے پاس خط بھیجا کہ مجھ کو فلاں تردد ہے اس کے لئے کوئی دعا بتلا دیجئے میں نے کہا لاحول پڑھا کرو چند روز کے بعد وہ مجھ سے ملے اور پھر شکایت کی میں نے پوچھا اس سے قبل میں نے کیا بتلایا تھا کہنے لگے کہ لاحول پڑھنے کو بتلایا تھا سو میں پڑھتا ہوں اتفاقاً میں نے یہ سوال کیا کہ کس طرح پڑھا کرتے ہو کہنے لگے یوں کہا کرتا ہوں لاحول لاحول لاحول لاحول وھلم جرا۔ تو جیسے یہ بزرگ لاحول پڑھنے کے یہ معنی سمجھے کہ صرف لفظِ لاحول کو پڑھ لیا جائے حالانکہ لاحول اس پورے کلمہ کا لقب ہے۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے صرف یہ ہی جملہ سمجھا حالانکہ لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے وہی مراد ہے جس کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بھی ہو لہٰذا اس سے استدلال نہیں ہو سکتا نیز دوسرے دلائل پر بھی تو نظر ہونی چاہیئے مشکوٰۃ میں کتابُ الایمان کی پہلی حدیث میں ہے شَہَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ تو اس انہماک فی الدنیا کے سبب سے اس قسم کی غلطیاں کر رہے ہیں۔ بس اس کا علاج یہ ہے کہ دین کی طرف توجہ کریں اور علوم دینیہ حاصل کریں اسی خیال کے ایک اور صاحب مجھے ملے کہنے لگے کہ رسالت کے اقرار کی ضرورت نہیں ہے صرف توحید کا اقرار نجات کے لئے کافی ہے میں نے کہا کہ اوّل تو دلائل عقلیہ و نقلیہ جو رسالت کے ضروری ہونے پر قائم ہیں وہ تمہاری مکذب ہیں۔ دوسرے رسالت کا انکار کرنے سے خدا تعالیٰ کی خدائی کا بھی انکار ہو جاتا ہے۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے ماننے کے یہ معنی نہیں کہ ان کو صرف موجود مان لیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ اُن کو کمالِ ذات و صفات میں یکتا سمجھے کیونکہ یہ مسئلہ اجماعیہ ہے کہ اگر ذات کا قائل ہو لیکن صفات کا قائل نہ ہو تو وہ کافر ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص بادشاہ کو بادشاہ تو مانے لیکن اُس کے اختیاراتِ شاہی نہ مانے تو کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہا جاوے گا کہ اس نے بادشاہ کو مانا کبھی نہیں تو خدا تعالیٰ کے ماننے اور

توحید کے مقرر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر صفتِ کمال کے ساتھ علیٰ وجہ الکمال اتصاف سمجھے کہنے لگے کہ بیشک یہ تو ضروری ہے میں نے کہا کہ صفاتِ کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے اس کے ساتھ بھی متصف ماننا ضروری ہوگا کہنے لگے کہاں ضروری ہوگا میں نے کہا کہ قرآن شریف میں موجود ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ پس اس کا ماننا ضروری ہوا اور جو اس کو نہ مانیگا وہ موحد بھی نہ ہوگا کیونکہ اُس نے خدا تعالیٰ کے صدق کو نہ مانا جسکا ماننا ضروری تھا اور میں نے کہا کہ دس برس کی مہلت جواب کے لئے دیتا ہوں۔ یہ تو عقائد میں اختصار تھا جس کی مثالیں آپنے سُن لیں۔ اسی طرح اعمال میں بھی اختصار کرلیا ہے کہ بعض تو اعمال کی فرضیت ہی کے منکر ہوگئے اور بعض منکر تو نہیں مگر عملاً مثل منکرین کے ہیں تو ان دونوں قسم کے لوگوں کی غلطی قرآن کی آیات سے ثابت ہوتی ہے رہا مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ سو اس کے معنی کے لئے ایک مثال عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح کرے تو نکاح میں محض ایجاب وقبول دو لفظ ہوتے ہیں پس اگر اس ایجاب وقبول کے بعد بیوی اپنے خورد ونوش کے لئے طلب کرے اور شوہر کہے کہ میں نے ان چیزوں کا دینا قبول نہیں کیا تھا تو وہ اس کا کیا جواب دے گی ظاہر ہے کہ یہ ہی جواب دیگی کہ اگرچہ تم نے ہر ہر چیز کو علیٰحدہ علیٰحدہ قبول نہیں کیا لیکن میرا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے۔ اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں اگر آپ بھی اُس مجلسِ گفتگو میں موجود ہوں تو کیا کہیں گے ؟ کہ یہ ایک قبول ہی سب کا قائم مقام ہے تو جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ لیا تو سارے عقائد اور اعمال کا ذمہ لے لیا تو اس حدیث کا یہ مدلول ہے اب چاہے ایمان کو جزو اعمال کہا جائے یا اُس سے خارج مگر لازم لیکن ایمان میں اختصار سخت غلطی ہے ایمان جب ہی کہلائے گا کہ جب اُس کی شان پائی جائے۔ ہم لوگ مسلم کہلاتے ہیں مگر غور کرنے کے قابل یہ ہے کہ ہماری حالت اسلام سے کس قدر قریب اور اُس کے کتنی مناسب ہے۔ جیسے میں نے مثال دی ہے کہ مالدار اُسی کو کہتے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا سامان ضرورت سے زیادہ ہو یہ ہی حالت اسلام کی ہے تو ہم کو اپنی حالت دیکھنی چاہیئے کہ کس قدر بے اعتنائی ہوگئی ہے کہ نہ عقائد کی پروا نہ اعمال کی فکر نہ حُسنِ معاشرت کا خیال نہ بد اخلاقی پر رنج۔ یہ حالتِ موجودہ دیکھ کر اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے۔ اور میں نے حضرت ابراہیم علیہ السَّلام سے اس کو نقل کیا تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ مدت سے تجویز شدہ بھی ہے اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی لیکن اس وقت مذاق کچھ ایسا

بدل گیا ہے کہ اپنی شریعت میں خواہ کسی امر کی کتنی بھی تحسین کی گئی ہو لیکن اُس وقت اُس کو نہیں مانا جاتا جب تک کہ گذشتہ تاریخ میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہ ہو اس لئے میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کر دیا. سو دیکھ لیجئے کہ دعائے ابراہیمی میں کن کن اجزائے ایمان کو ضروری کہا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ ہماری اولاد میں ایک رسول بھیجئے جن کی یہ صفت ہو کہ ان لوگوں کو آپ کے احکام سُنا دیں اور یہ شان ہو کہ ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں اور ان کا تزکیہ کریں رزائل سے بیشک آپ قادر ہیں اور حکیم ہیں کہ موافق حکمت کے کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے. تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ رسول کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں اور ان رسول سے مراد ہمارے حضور انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں اس لئے کہ داعی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ہیں لہٰذا ضرور ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیئے اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے علاوہ بھی متعدد انبیاءؑ ہوئے مگر وہ بسلسلۂ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ہوئے ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے سلسلے میں صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی ہیں لہٰذا آپ ہی مراد ہوئے اور دعاء کے درمیان میں بعثت رسول کی دعا کرنا ایک بڑی رحمتِ کاملہ کا مانگنا ہے ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے ان کو پاک کیجئے اور ان کو کتاب دیجئے اور ان کو قبول کیجئے لیکن تعلیم بواسطۂ وحی اُس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلا واسطہ وحی کے بذریعہ الہام کے ہو اگر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم بلا واسطہ زیادہ قرب کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے اکثر عوام اور بعض خواص کی یہی رائے قائم ہو گئی ہے اور یہاں تک اس کا اثر ہوا ہے کہ انبیاءؑ کی تعلیم کی وہ قدر نہیں کی جاتی جس قدر کسی بزرگ کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے. میرے اُستاد مولانا فتح محمد صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور اپنی عُسرت اور قرض کو بیان کیا اور کہا کہ کوئی دُعا بتلا دیجئے کہ قرض ادا ہو جائے مولانا نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو اَللّٰهُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ اے اللہ مجھے حلال کو

کافی فرما دے اور اپنے فضل سے سوال سے زیادہ عطا فرما۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ یہ حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ حدیث کا نام سُنکر اُس شخص کی یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے سرد پڑ گیا اور کہنے لگا کہ حدیث میں تو بہت سی دُعائیں ہیں آپ اپنے پاس سے کوئی چیز بتلائیے جو سینہ بسینہ چلی آتی ہو۔ یہ فاسقانہ کلمہ سُنکر مولانا کو بہت ہی غصہ آیا اور فرمایا کہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر دوسروں کی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے تو یہ اُسی خیال کا اثر ہے جس کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر کفایت نہ ہوئی آپ نے دیکھا ہوگا کہ جاہل عابد جس شوق سے وظیفہ یا نفلیں پیر کی بتلائی ہوئی پڑھتے ہیں قرآن شریف اور پانچ وقت کی نماز اُس شوق سے نہیں پڑھتے۔ ایک شخص نے مجھ سے فخراً کہا اگرچہ کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے لیکن پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ کبھی قضا نہیں ہوتا اُس کے معنی یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس قدر تعلق نہیں ہے جس قدر کہ پیر سے ہے اگرچہ یہ ضرور ہے اگر پیر سے تعلق نہ ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کم تعلق ہوگا لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سے بھی بڑھ جائے۔ ؎ گر فرق مراتب نہ کُنی زندیقی

اگر فرق مراتب نہ کرو گے تو زندیقی ہو

غرض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الہام بلا واسطہ ہے اور وحی بواسطہ ہے تو جس میں واسطہ کم ہوگا اُس میں زیادہ قرب ہوگا مگر شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ تعلیم بواسطہ تعلیم بلا واسطہ سے زیادہ افضل ہے وجہ یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعلیم بواسطہ میں واسطہ کس کا ہے اگر واسطہ کسی معمولی شخص کا ہو تو بیشک بلا واسطہ تعلیم افضل ہے لیکن جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ہے تو اتنے بڑے واسطہ کے ذریعے سے جو تعلیم ہوگی وہ افضل ہوگی اور راز اس میں یہ ہے کہ جو علم بلا واسطہ وحی کے ہے اس میں غلطی کا احتمال بوجہ نقصان استعداد کے زیادہ ہے اور بواسطہ وحی تعلیم میں غلطی کا احتمال نہیں ہے رہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تک پہنچنے کا واسطہ سو اُس میں چونکہ ثقات ہیں اُن میں غلطی کا احتمال نہیں ہے ایک تو یہ تفاوت ہے دوسرے ایک

لطیف تفاوت ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالےٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے تو جو تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے ہوگی اُس میں ابتلاء کا احتمال نہیں ہوگا برخلاف بلا واسطہ کے کہ اُس میں احتمال ابتلا کا ہوتا ہے۔ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کو فرمارہے ہیں کہ شراب پی اُس نے علماء سے کہا انہوں نے کہا کہ شراب حرام ہے تجھ کو خواب پورا یاد نہیں رہا میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ شراب سے مُراد محبّت الٰہی ہو تو دیکھئے چونکہ بلا واسطہ یہ تعلیم تھی اُس میں ابتلاء ہوا کہ دیکھئے یہ سمجھتا ہے یا نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے جو علوم ہوتے ہیں اُن میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو شخص خواب میں دیکھے تو اُس میں یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ یہ شیطان ہوگا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محض ہدایت کی ہے لہٰذا اس میں یہ اختلاط نہیں ہوسکتا بزرگوں نے لکھا ہے کہ شیطان خواب میں آکر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں خدا ہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں وجہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ حکمتِ ابتلا کے لئے صفتِ مضل کے ساتھ بھی متصف ہیں دوسرے اوّل صورت میں متنبہ ہو جانا ممکن ہے کیوں کہ خدا تعالےٰ منزّہ ہے اور جس کو خواب میں دیکھا منزّہ نہیں اور دوسرے میں ممکن نہ تھا اس لئے آپ کے واسطے کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ایک بڑی نعمت ہے لہٰذا ابراہیم علیہ السّلام نے بجائے کتاب وغیرہ براہ راست مانگنے کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واسطہ قرار دیا نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کی طبیعت اس پر مجبول ہے کہ اپنے بنی نوع کو دیکھ کر اقتدا کرتے ہیں یعنی اُن کو ایک نمونے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہی فرق ہے اس میں اور جانور میں کہ جانوروں کو ضروریات کی تعلیم کی حاجت نہیں غرض جانوروں میں جو کچھ کمالات ہیں وہ سب طبعی ہیں اکتسابی نہیں ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے اور ایک بڑے سے بڑے تیراک شخص کا بچہ

تیراک نہ ہوگا کیوں کہ کمالات انسان کے طبعی نہیں بلکہ ان کو ایک نمونہ دیکھنے کی ضرورت ہے اور ضرورتِ نمونہ ہی باعث ہے کہ انسان کو تعلیم کتب سے بھی اس قدر نفع نہیں ہوتا جس قدر کاملین کی صحبت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اسکی ضرورت ہے۔اکثر لوگ اپنی اولاد کے لئے تمام آسائشوں کی فکر کرتے ہیں مگر اس کی ذرا پروا نہیں کرتے کہ صحبت بھی نیک ہو بلکہ اکثر بد اخلاق معلموں کے سپرد کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگرچہ یہ ناقص ہیں لیکن ابھی بچپن ہے کیا حرج ہے حالانکہ یہ تجربہ ہے کہ اگر مبادی خراب ہوں تو مقاصد بھی خراب ہوتے ہیں یاد رکھو کہ خاک از تودۂ کلاں بردار یہ ضرور ہے کہ اگر کامل سے سیکھے گا تو کامل نہ ہوجائے گا لیکن ذی استعداد ہوجائے گا کیونکہ کامل آدمی فن کی حقیقت کو ظاہر کر دیتا ہے بخلاف ناقص کے اور یہ تو علمی ضرر ہے جس پر کم وبیش توجہ بھی ہے مگر بڑا ضرر یہ ہے کہ ناقص کی صحبت میں اخلاق بالکل برباد ہوتے ہیں اس پر لوگوں کو ذرا توجہ نہیں۔ ہمارے ہاں ایک معلم ہیں اُن کی نسبت سُنا گیا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو دوسرے معلم کے ہاں بھیجتے ہیں کہ جاکر اُس کے مکتب کی چٹائیاں توڑ ڈالیں بتلایئے جب بچپن ہی سے یہ حالت ہوگی تو بڑے ہوکر اُن کی کیا اصلاح ہوگی مگر اس پر بالکل خیال نہیں بلکہ اکثر کہتے ہیں کہ بچہ وہی ہے جو کہ شوخ ہو حالانکہ شوخی دوسری چیز ہے اور شرارت دوسری چیز ہے۔ غرض انسان اپنے ابنائے نوع سے سبق لیتا ہے جو حالت دوسرے کی دیکھتا ہے وہی خود اختیار کرتا ہے مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے گھر کے لوگوں کو علاج کرانے کے لئے ایک طبیب کے پاس لے گیا اُن کو میں نے دیکھا کہ بے حد متحمل تھے باوجودیکہ بیحد نازک مزاج تھے تو میں چونکہ اُن کے پاس جاتا تھا اس لئے میرا غصہ کم ہوگیا تھا میں نے غور کرکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ محض پاس بیٹھنے کا اثر ہے تو بہت اچھا طریقہ تربیت کا صحبت ہے۔اب لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی عمر کو پہنچ کر خود ہی سنبھل جائیں گے یہ غلط ہے بلکہ جب بچہ بولنے پر بھی قادر نہیں ہوتا اُسی وقت سے اُس کے دماغ میں دوسروں کی تمام حرکات منقش ہوتی ہیں اور وہ اُن سے متاثر ہوتا ہے اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ بچہ کے سامنے کوئی حرکت خلافِ تہذیب نہ کرنی چاہیئے۔ راز اس میں یہ ہی ہے کہ

انسان کے دماغ کی مثال پریس کی سی ہے کہ کاپی لکھ کر جب لگاؤ تو چھپ جائے گا اسی طرح جو چیز دماغِ انسان کے رو برو ہوتی ہے وہ اس میں منقش ہوجاتی ہے اگرچہ اُس وقت شعور نہیں ہوتا لیکن اس انتقاش کے لئے شعور کی ضرورت نہیں ہے. اگر ہم پریس میں انگریزی چھاپ لیں اور پھر انگریزی سیکھ لیں تو چند روز کے بعد ضرور پڑھ لیں گے علیٰ ہذا بچّہ اگرچہ اُس وقت نہیں سمجھ سکتا لیکن بڑا ہوکر سمجھے گا چنانچہ ایک عاقل عورت نے یہ کہا ہے کہ پانچ چھ برس کے بعد بچّہ قابل تربیت نہیں رہتا ہے بلکہ ہر حالت پختہ ہوجاتی ہے وہ کہتی تھی اگر پہلے بچّے کو درست کردے تو اس کے بعد کے سب بچّے اُسی سانچے میں ڈھل جائیں گے. غرض معلوم ہوا ہوگا کہ صحبت کا کیا اثر ہے تو جناب باری تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام سے یوں دُعا کرائی کہ ان میں ایک پیغمبر بھیجے اور پھر آپ کو مبعوث فرمایا کہ آپ نمونہ ہوں سو بعض نے آپ کو دیکھا اور بعض نے آپ کی سیرت دیکھ کر آپ کی حالت معلوم کی اور اسی طرح آپ ہمارے بھی پیش نظر ہیں اور اس اعتبار سے اگر فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ عالم لیا جاے تو درست ہوگا۔ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سِیَر کو دیکھ کر جس قدر آسانی سے ہم اتباع کرسکتے ہیں قوانین کلیّہ کو دیکھ کر نہیں کرسکتے تھے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں تو ہم سے یہ ہی باز پُرس ہوگی کہ تم اس نمونے کے موافق بن کر کیوں نہیں آئے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ہم کسی درزی سے اچکن سلوائیں اور نمونے کے لئے اپنی اچکن اُس کو دیدیں تو اس اچکن دینے کے معنی یہ ہی ہوتے ہیں کہ جدید اچکن کی کاٹ تراش سلائی وغیرہ سب اس پہلے کے مطابق ہو اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ تراشں وغیرہ میں فرق ہوجائے تو درزی کو مستحقِ عتاب سمجھا جاتا ہے اس عتاب کے جواب میں اگر وہ یہ کہنے لگے کہ زیادہ تر تو موافق نمونے کے ہے اور لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ. تو ہرگز یہ جواب مسموع نہیں ہوتا تو جو برتاؤ آپ نے اُس درزی سے کیا اُسی کے لئے آپ خدا تعالیٰ کے سامنے تیار ہوجایئے اور سوچ لیجئے کہ جب آپ خدا تعالیٰ کے سامنے

کھڑے ہوں گے اور نمونۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پورے نہ اتریں گے تو کس سخت عتاب کے سزاوار ہوں گے اسی کو خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ تم میں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے لئے نمونہ ہے کہ بالکل اُس نمونے جیسے بن جاؤ۔ نماز ایسی ہو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی روزہ وہی ہو۔ نکاح شادی کا طرز وہی ہو وضع وہی ہو علیٰ ہذا ہر چیز میں وہی طرز ہو جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز تھا یہ تو نمونہ ہے لیکن یہ خدا تعالےٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے اس نمونے میں وسعت کردی یہ ایک شبہ کا جواب ہے یعنی آج کل اکثر لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں نے اعتراض تو کردیا کہ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ جس شخص نے کسی قوم کی شکل وصورت بنائی وہ انھیں میں سے ہے۔ مگر اب یہ بھی تو بتلائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹوپی کیسی تھی کرتہ کیسا تھا اور مقصود اس سے علماء کو خاموش کرنا ہوتا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے کہ جو چاہو پہنو نیز اس کی تائید میں "درعمل کوش و ہرچہ خواہی پوش" بھی پیش کیا کرتے ہیں میں اس شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وضع وہی ہونا ضروری ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وضع تھی لیکن اس میں کچھ وسعت ہے شرح اُس کی یہ ہے کہ ہمیشہ سلاطین میں یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ قوانین لباس میں وردی والوں کے لئے مَا ذُوْنٌ فِیْہِ کے اَفْرَاد مَنْھِیٌّ عَنْہُ کے افراد سے کم ہوتے ہیں مثلاً پولیس کی وردی ہے کہ افراد لباس کے بہت ہیں مگر اس قانونِ مجوزہ کی وجہ سے پولیس کو صرف ایک کی اجازت ہے کہ اس قسم کا لباس ہو اور مَنْھِیٌّ عَنْہُ زیادہ ہے کیونکہ اس کے سوا سب لباسوں کی ممانعت ہے چنانچہ اگر کسی کی وردی میں عمامہ نہ ہو تو وہ معتوب ہوگا کیونکہ وہ بھی وردی کا جزو ہے۔ اب ہمارے بھائی یہ چاہتے ہیں کہ قانونِ خداوندی بھی ایسا ہی تنگ ہوجائے کہ ایک ہی لباس اُس میں رہے یعنی خاص قسم کی ٹوپی اور خاص طرز کی ازار وغیرہ وغیرہ اور جب یہ بات نہیں ہے تو اُن کے نزدیک ہر لباس جائز ہے تو صاحبو! وردی تو متعین ہے لیکن یہاں تعین کی

یہ صورت ہے کہ مَنْھِیْ عَنْہُ کم ہے اور مَاذُوْنْ فِیْہِ زیادہ ہے یعنی جو لباس ناجائز قرار دیا گیا اُس کو شمار کرا دیا اور اُس کے ماسوا سب جائز رکھا گیا۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کیونکہ اگر یہ حکم ہوتا کہ ایک قبا ہو ایک کرتہ ہو ایک عمامہ ہو تو جس شخص کے پاس اتنا کپڑا نہ ہوتا وہ کیا کرتا آج کل بعض اسکولوں میں خاص وضع کی پابندی ہوگئی ہے لیکن یہ سخت مصیبت ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم تو بہت امیر ہیں تو میں کہوں گا کہ کیا قوم کو ان ہی افراد میں حصر کیا جائے گا۔ لوگ اس میں بھی سخت غلطی کر رہے ہیں کہ قوم کے افراد امراء کو سمجھتے ہیں حالانکہ غرباء شمار میں زیادہ ہیں تو قوم غرباء کا نام ہوگا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے گیہوں کا ڈھیر کہ اُس میں جَو اور چنے بھی ہوتے ہیں مگر کثرت پر نظر کر کے اُس ڈھیر کو گیہوں کا ڈھیر کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ قومی ہمدرد وہ ہوسکتا ہے جو کہ غرباء کے ساتھ ہمدردی کرے اس زمانہ میں جو لوگ اپنے کو اپنے منہ سے ہمدرد قوم کہتے ہیں وہ صرف اُمراء کے ساتھ ہمدرد ہیں نہ کہ غرباء کے ساتھ حالانکہ جب تک غرباء کے ساتھ ہمدردی نہ ہو اُس وقت تک قومی ہمدردی کا دعویٰ بالکل غلط دعویٰ ہے تو چونکہ یہ لوگ قوم کے معنی نہیں سمجھے اس لئے اپنی اس تجویز میں دقت اور تنگی اُن کو محسوس نہیں ہوئی اور خدا تعالےٰ نے اسی پر نظر کر کے ماذونات کو زیادہ اور منہیات کو کم فرمایا کہ حریر نہ ہو زری نہ ہو ٹخنے ڈھکے نہ ہوں تشبّہ نہ ہو علیٰ ہٰذا اور ان کے ماسوا عام اجازت ہے کہ اِلْبِسْ مَا شِئْتَ تو وردی تو متعیّن ہوئی لیکن رحمت اور وسعت کے ساتھ لہٰذا وہ اعتراض کہ اگر تشبّہ ناجائز ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص لباس بتلانا چاہیئے مُندفع ہوگیا پس معلوم ہوا کہ ہم کو لباس میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مشابہ ہونا ضروری ہے لیکن اس طرح کہ اُن منہیات میں سے ہمارے بدن پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ پس جب ہمارے پاس یہ نمونہ موجود ہے تو خدا تعالےٰ ہم سے باز پرس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالےٰ نے شادی کا ایک نمونہ (یعنی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی) ہم کو دکھلا دیا ہے کہ اُس میں

نہ مہمان آئے تھے نہ لال خط گیا تھا نہ ڈوم گیا تھا نہ نائی نہ واسطہ سے پیغام پہونچا بلکہ پیغام خود دولہا صاحب لے کر گئے تھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بھیجے ہوتے تھے۔ اوّل حضرت فاطمہ زہرا رضہ سے حضرات شیخین نے پیغام دیا تھا لیکن ان کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر فرمادیا اللہ اکبر۔ صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو کیسے کیسے گہرے امور پر مطلع فرما دیا ہے۔ یعنی حضراتِ شیخین سے انکار فرماکر آپ نے یہ بتلا دیا کہ اپنی اولاد کے لئے شوہر کی ہم عمری کا لحاظ بھی ضرور کرو۔ ایک نوجوان عورت کی شادی ایک بوڑھے مرد سے ہوگئی تھی وہ کہتی تھی کہ جب میرے سامنے آتے ہیں تو مجھ کو بہت شرم آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دادا آگیا اور اکثر عورتیں عمروں میں تفاوت ہونے کی وجہ سے آوارہ ہوجاتی ہیں کیوں کہ ان کا دل نہیں ملتا بتلایئے حضرات شیخین سے زیادہ کون ہوگا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض عمر کے تفاوت کی وجہ سے انکار فرما دیا۔ جب دونوں صاحبوں کو اس شرف سے مایوسی ہوئی تو ان دونوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں سے تو اس خاص وجہ سے انکار فرمادیا ہے تم کم عمر ہو بہتر ہے کہ تم پیغام دو جو لوگ شیخین پر حضرت علی کے ساتھ عداوت رکھنے کا الزام رکھتے ہیں اُن کو اس واقعہ میں غور کرنا چاہیئے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ تشریف لے گئے اور جاکر خاموش بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جس غرض سے تم آئے ہو اور مجھے خدا تعالےٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح تم سے کردوں۔ منظوری کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ چلے آئے ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو چار اصحاب کو جمع کرکے خطبہ پڑھا اور نکاح پڑھا دیا چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجلسِ نکاح میں موجود نہ تھے اس لئے یہ فرما دیا کہ اگر علی رضی اللہ عنہ منظور کریں حضرت علی رضہ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے منظور کیا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمِّ ایمن کے ساتھ حضرت فاطمہ رضہ

کو حضرت علی رضؓ کے گھر روانہ کردیا نہ ڈولہ تھا نہ برات تھی۔ اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لائے اور حضرت فاطمہ زہرا رضؓ سے پانی مانگا انہوں نے اُٹھ کر پانی دیا آج ہم نے اس سادگی کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے نکاح کے بعد ایک مدت تک دلہن منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے میں کہا کرتا ہوں کہ بجائے منہ پر ہاتھ کے ہاتھ پر منہ رکھنا چاہیئے بہرحال جو کچھ بھی کہا جائے منہ ڈھکا جاتا ہے اور وہ اس قدر پابند بنائی جاتی ہے کہ نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتی جس طرح بندے کو خدا کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے تھا اس طرح وہ نائن کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کس قدر بے حیائی ہے کہ عورتیں منہ دیکھ کر فیس دیتی ہیں تو آج کل پابندی کی یہ حالت ہے اور حضرت فاطمہؓ نے اگلے ہی دن کام کیا اور پھر حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ پانی لاؤ وہ بھی لائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضؓ پانی لائی تھیں حضرت علی رضؓ بھی موجود تھے اب عورتیں اس فعل کو بالکل ناجائز سمجھتی ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی جہالتیں ہیں چنانچہ عورتوں کا یہ بھی خیال ہے کہ شوہر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور شوہر کا نام لینا گویا بالکل ناجائز ہے مگر عورتوں کو نام لینا تو بے ادبی ہے زبان چلانا اور گستاخی کرنا بے ادبی نہیں ہے شوہر سے لڑنا یا عورتوں کو گالیاں دینا گویا ناجائز نہیں ہے بعض عورتیں تو اس کی یہاں تک پابند ہیں کہ اگر قرآن میں وہ لفظ آجائے تب بھی اُس کو نہیں پڑھتیں گویا قرآن میں ان کے شوہر ہی کا نام لکھا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض عورتیں اُس کے شہر کا نام بھی نہیں لیتیں اور شوہر کے نام کے ہم وزن الفاظ بھی نہیں کہتیں لیکن معلوم نہیں کہ یہ ساری باتیں ناجائز ہو کر گستاخی کرنا کیسے جائز ہوگیا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کر کے بھی دکھلادی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غمی کر کے بھی دکھلادی کہ آپ کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا آپ نے نہ جزع فزع کیا نہ کسی کو اجازت دی صرف آنسو نکلے اور یہ فرمایا کہ اَنَا بِفِرَاقِكَ يَآاِبْرَاهِيمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ ابراہیم تیری جدائی سے ہم بڑے مغموم ہیں۔ اور ایک جگہ

تشریف فرما رہے لوگ آکر تعزیت کرتے رہے پس ہم کو بھی چاہیئے کہ تسلّی دیں اور ثواب بخشیں یہ دونوں امر مسنون ہیں اور باقی سب لغو ہیں مثلاً دور دراز کے مہمانوں کا آنا اور دسویں چالیسویں میں شریک ہونا پھر عدّت کے ختم کے بعد اُس عورت کو عدّت سے نکالنے کے لئے جمع ہونا گونا وہ کسی کوٹھری میں بند تھی کہ یہ سب مل کر اُس کا قفل توڑیں گی. ضلع بلند شہر کے ایک رئیس کا انتقال ہوا اُن کے صاحبزادے نے رسم چالیسویں کو توڑنا چاہا لیکن اس کی یہ صورت اختیار نہیں کی کہ کچھ نہ کریں بلکہ یہ کیا. حسب رسم تمام برادری کی دعوت کی اور بہت سے عمدہ عمدہ مُرغن کھانے پکوائے بڑے لوگوں پر ایک یہ بھی آفت ہے کہ جب تک وہ گھی کی نہر نہ بہادیں اُس وقت تک اُن کا کرنا کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا. غرباء بحمداللہ اس سے بَری ہیں میں جب ڈھاکہ گیا تو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی کھاتے ہیں. میں نے کہا کہ صاحب گھی کوئی زیادہ کھانے کی چیز نہیں ہے ورنہ جنّت میں گھی کی بھی ایک نہر ہوتی جیسے دودھ شہد کی نہریں جنّت میں ہیں. غرض جب سب لوگ جمع ہوگئے تو ہاتھ دھلوا کر کھانا چنوادیا اور سب کو بٹھلا دیا اجازت شروع سے پہلے کہنے لگا کہ صاحبو آپ کو معلوم ہے کہ میرے والدِ ماجد کا انتقال ہوگیا ہے اور والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ جانا جیسے عظیم الشّان صدمہ کا باعث ہوتا ہے ظاہر ہے. تو صاحبو کیا یہ ہی انصاف ہے کہ ایک تو میرا باپ مرے اور اوپر سے تم لوگ مجھ کو لوٹنے کے لئے جمع ہو تم کو کچھ شرم بھی آتی ہے اسکے بعد کہا کہ کھائیے لیکن سب لوگ اُسی وقت اُٹھ گئے اور یہ رائے ہوئی کہ ان رسوم کے متعلق علیٰحدہ بیٹھ کر غور کرنا چاہیئے چنانچہ بہت سے آدمی جمع ہوئے اور باتفاق رائے ان کو موقوف کردیا اور وہ کھانا سب فقراء کو تقسیم کردیا گیا. ہمارے جوار میں ایک قصبہ کیرانہ ہے وہاں ایک حکیم صاحب فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک گوجر آیا اُسکا باپ بیمار ہو رہا تھا. کہنے لگا کہ حکیم صاحب جس طرح ہوسکے ابکی مرتبہ تو اس کو اچھا ہی کردیجئے کیوں کہ قحط بہت ہو رہا ہے اگر بُڈھا مرگیا تو مرنے کا تو چنداں غم نہیں مگر چاول

بہت گراں ہیں برادری کو کس طرح کھلاؤں گا خیر غنیمت ہے۔ آج کل ان رسوم کا مذموم ہونا تو اکثر نوجوان سمجھ گئے ہیں اور منع بھی کرتے ہیں تو گویا زندوں کا غم مُردے کے غم سے زیادہ ہوا ان کی روک ٹوک زیادہ قابل مدح نہیں کیوں کہ ان کی غرض اس روک ٹوک سے یہ ہوتی ہے کہ اگر بیوی کے خرچ سے بچے گا تو ہم کو ہارمونیم اور میز کرسی میں خرچ کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ تو جس روک کا منشاء یہ ہو وہ قابل مدح نہیں ہے لیکن خیر پھر بھی ان کی حالت اس خاص اعتبار سے دوسروں سے غنیمت ہے اس وقت واقعی عُقول میں گونہ روشنی آ گئی ہے لیکن یہ روشنی ناکافی ہے کافی اُس وقت ہوگی کہ جب ضَمِّ ضمیمہ بھی ہو یعنی ایک عاقل کی عقل بھی ان کی عقل کے ساتھ اور اُس کی رہبر ہو اور عاقل وہ ہیں کہ جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؎

خلق اطفال اند جُز مستِ خدا　　　　نیست بالغ جُز رہیدہ از ہوٰی

مستِ خدا کے علاوہ تمام مخلوق بچے ہیں جو بڑائی اور ہوس سے خالی نہیں وہ بے عقل ہیں

تو عاقل وہی ہے جو رہیدہ از ہوٰی ہو بہر حال کہاں تک تفصیل کروں۔ خلاصہ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے نمونہ ہیں لہٰذا ہر ہر حالت میں ہم کو غور کرنا چاہیے کہ ہم اُس نمونے کے موافق ہیں یا نہیں۔ سلف صالحین نے تو یہاں تک کیا ہے کہ ایک درزی کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تھی درمیان میں ایک جملہ معترضہ یاد آیا کہ ہماری شان خدا جانے کیا بڑھ گئی ہے کہ ہم غریبوں کے ہاں جاتے ہوئے عار کرتے ہیں بلکہ اُن کو بلاتے ہوئے بھی عار آتی ہے اکثر دیکھا گیا کہ جو لوگ ذرا معزز عہدوں پر ہیں وہ اپنی برادری کے غریب لوگوں کو اپنے پاس بُلاتے ہوئے اور اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے عار کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھئے کہ آپ ایک غریب آدمی کے ہاں تشریف لے لئے۔ اور اگر کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غریب تھے (نعوذ باللہ) تو سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقر اختیاری تھا اضطراری نہ تھا۔ فقیر وہ ہے کہ جس کا فقر اضطراری ہو ؎

شریف گر متواضع شود خیال مبند　　　　کہ پائگاہ رفیعش ضعیف خواہد شد

شریف متواضع نہ ہو تو خیال مت کر کہ اس کا بلند مقام کمزور ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحؒ نے سلطنت چھوڑ دی تھی تو کیا اُن کو فقیر کہا جائے گا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے اختیار سے فقر اختیار کیا تھا اور اختیاری بھی کیسا کہ حضرت جبریل علیہ السّلام نے فرمایا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو خدا تعالےٰ آپ کے لئے جبلِ اُحد کو سونا کردیں کہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلا کرے۔ شاید کوئی کہے کہ جبلِ اُحد کیوں کر چلتا تو صاحبو آپ کے نزدیک زمین متحرک ہے یا نہیں تو جب زمین حرکت کرسکتی ہے تو جبلِ اُحد کے حرکت کرنے میں کیا محال لازم آتا ہے اگر کہئے کہ زمین کششِ آفتاب کی وجہ سے چلتی ہے تو میں کہوں گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک میں اگر کشش ہو تو کیا قباحت ہے سائنس کے مسئلے ابھی ختم نہیں ہیں کشش کے لئے جسم کا بڑا ہونا کچھ ضروری نہیں۔ اور کشش تو محض آپ کی خاطر سے تنزل کرکے مان لی ہے ورنہ کشش کیا چیز ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے اُس کو کشش وغیرہ کے ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے جبریلؑ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دِن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ اور اگر غور کیجیئے گا تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تجویز میں کتنی عظیم الشان حکمت پنہاں ہے بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ میری اُمت مجھ سے محبت کرے گی اگر میں دنیا لوں گا تو تمام اُمت تحصیل دنیا کو سنّت قرار دے گی اور دنیا کے مفاسد سے بچنے کی قوت ہوگی نہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ اُمت ہلاک ہوجائے گی اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک کامل آدمی جو کہ سانپ پکڑنے کا منتر جانتا ہو وہ باوجودیکہ اپنے ضرر سے بالکل مطمئن ہے لیکن اس خیال سے کہ مجھے پکڑتے دیکھ کر بچہ بھی سانپ کے منہ میں اُنگلی نہ دیدے خود بھی سانپ کو نہیں پکڑتا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے تکلیف برداشت کی تو کیا آپ کا فقر اضطراری فقر ہوگا ہرگز نہیں بلکہ فقر اختیاری تھا۔

مجھے حضرت شاہ ابوالمعالی رحمہ اللہ کی حکایت یاد آئی۔ آپ کے ہاں اکثر فقر وفاقہ ہوا کرتا تھا ایک مرتبہ اُن کے پیر اُن کے ہاں آکر مہمان ہوئے اُس روز بھی اتفاق سے فاقہ تھا اور حضرت شاہ ابوالمعالی رحؒ مکان پر نہ تھے گھر کے لوگوں نے پڑوس سے قرض منگانا چاہا لیکن وہاں سے قرض نہ ملا کئی جگہ آدمی کو بھیجا لیکن سب جگہ سے جواب ملا۔ جب ان کے پیر نے کئی

بار آدمی کو آتے جاتے دیکھا تو دریافت فرمایا معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے۔ آپ نے کچھ نقد اپنے پاس سے دیا اور فرمایا کہ جاکر بازار سے اناج لے آؤ اور جب لاؤ تو مجھے دکھلانا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ نے ایک نقش لکھ کر اُس اناج میں رکھدیا۔ نقش کا رکھنا ایک پردہ تھا ورنہ یہ آپ کا تصرف تھا اور یہ اوپر سے ہوتی چلی آئی ہے خدا تعالےٰ جب کوئی خارق پیدا کرتے ہیں تو اس کو ناسوت کے پردے میں پیدا کرتے ہیں جیسے بارش وغیرہ کا ہونا۔ اسی کے موافق انہوں نے بھی وہ تعویذ لکھ کر اناج میں رکھ دیا اور فرمایا کہ اس میں سے لے کر پکایا کرو چنانچہ مدّت تک پکتا رہا اور ختم نہ ہوا۔ حضرت شاہ ابو المعالی صاحبؒ سفر سے واپس تشریف لائے اور یہ حالت دیکھی تو ایک روز فرمایا کہ مدّت سے فاقہ نہیں ہوا اس کی کیا وجہ ہے۔ صاحبزادی نے یہ سارا واقعہ عرض کیا۔ اب اِس وقت حضرت پر سخت تنگی کا وقت ہے کہ اگر تعویذ سے کام لیں تو مذاق کے خلاف اور نہ کام لیں تو پیر کے تعویذ کی بے ادبی ہوتی ہے۔ واقعی یہ حضرات جامع اضداد ہوتے ہیں۔ اس جامع بین الاضداد پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔ ہمارے حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مَرْقَدَہٗ بیٹھے ہوئے تھے اور یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ جس طرح راحت و آرام نعمت ہے اُسی طرح بلا بھی نعمت ہے کہ اُسی وقت ایک شخص آیا اُس کا ہاتھ زخم کی وجہ سے خراب ہورہا تھا اور سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور کہا کہ میرے لئے دُعا فرمایئے اُس وقت میرے قلب میں یہ خطرہ گزرا کہ حضرت اس کے لئے کیا دعا کریں گے اگر صحت کی دعا کریں تب تو اپنی تحقیق سے رجوع لازم آتا ہے اور اگر دعا نہ کریں تو اس شخص کے مذاق کی رعایت نہیں ہوتی اور یہ شیخ کامل کے لئے ضروری ہے آپ نے فرمایا کہ سب لوگ دعا کریں کہ اے اللہ اگرچہ ہم کو معلوم ہے کہ یہ تکلیف بھی نعمت ہے لیکن ہم لوگ اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کے متحمل نہیں ہوسکتے اس نعمت کو مبدل بہ نعمتِ صحت فرمادیجئے۔ اسی طرح حضرت شیخ ابو المعالیؒ نے فرمایا کہ نقش حضرت کا تبرک ہے میرا سر اس کا زیادہ مستحق ہے یہ کہکر اُس کو تو اپنے سر میں باندھ لیا اور اناج کے لئے حکم دیا کہ اس کو صدقہ کردیا جائے تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ادنیٰ خدام کی یہ حالت تھی تو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کو کون فقیر کہہ سکتا ہے۔ اور جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی اسکے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک مرتبہ حضرت نے سَو اونٹ بھی اپنی طرف سے ذبح فرمائے تھے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریب تھے اور غریب ہونے کی وجہ سے تشریف لے گئے بلکہ آپ سُلطان تھے اعتقاداً بھی اور واقعتہً بھی کیوں کہ صلح جنگ قتال وغیرہ سب آپ کے حکم سے ہوتی تھی اور باوجود اس کے پھر آپ درزی کے گھر تشریف لے گئے اب ہم کو اُن کے گھر جاتے بلکہ اُن کو سلام علیکم کی اجازت دیتے بھی ننگ آتا ہے۔ کسی قصبے میں ایک حجام نے ایک رئیس صاحب کو السّلام علیکم کہدیا تو رئیس صاحب نے اُٹھکر ایک چپت رسید کیا اور کہا تو اس قابل ہو گیا ہے کہ ہم کو السّلام علیکم کہے۔ حضرت سلامت کہا کر۔ جب نماز کا وقت ہوا تو اس نے نماز پڑھی اور ختمِ نماز پر بجائے السّلام علیکم و رحمۃ اللہ کے پکار کر کہا حضرت سلامت و رحمۃ۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا کہ آج میں نے السّلام علیکم کہا تھا تو ایک چپت لگا مجھے ڈر ہوا کہ نماز میں فرشتوں کو بھی سلام کیا جاتا ہے اور اُن میں حضرت عزرائیل بھی ہیں اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو میرا دم ہی نکال دیں گے۔ تو جب ہمارے روٗسا کو سلام سے عار آتی ہے تو کھانا پینا تو بہت بڑی بات ہے۔ لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ وہاں کے ایک عالم ایک سقّے کے گھر تشریف لے جاتے تھے کہ ایک رئیس ملے پوچھا کہ مولانا کہاں جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس سقّے نے دعوت کی ہے رئیس نے کہا لَاحَوْلَ وَلَا قوۃ۔ آپ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی سقّے کے گھر دعوت کھانے جاتے ہیں مولوی صاحب نے کہا ہاں صاحب ٹھیک ہے اور سقّے سے کہا کہ اگر تو ان کو لے چلے تو میں بھی چلتا ہوں ورنہ میں بھی نہیں جاتا وہ رئیس کے سر ہوا اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر لے چلا مولوی صاحب نے اس تدبیر سے یہ بات دکھلا دی کہ ان غرباء کا اصرار کس طرح کا ہوتا ہے اور ان کو کس درجہ خلوص ہوتا ہے حقیقت میں امراء کو خبر نہیں ورنہ اگر اُن کو بھی معلوم ہو جائے کہ غرباء کو اہل اللہ وعلماء سے کتنی محبت ہے تو ان کو مجبور و معذور سمجھیں جیسے خود تھوڑے سے اصرار سے یہ رئیس مجبور ہو گئے۔ محبت وہ چیز ہے کہ ؎

عشق را نازم کہ یوسف را بباز ار آورد ہمچو صنعا زاہدی را او بزنار آورد

میرے عشق کو ناز ہے کہ یوسف علیہ السلام کو سرے بازار لے آیا۔صنعا جیسے زاہد کو زنار پہنا دیا۔

تو اگر کسی بڑے شخص کو غریب کے گھر پہونچادے تو کیا تعجب ہے اس کے عجیب غریب تصرفات ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ امراء کو ان کی اطلاع نہیں کیونکہ لوگوں کو اُن سے محبت ہی نہیں ہے اُن کی اگر تعظیم بھی کرتے ہیں تو ایسی جیسے کہ بھیڑیئے کی تعظیم کرتے ہیں یا اگر کھڑے ہوتے تو جیسے سانپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ متکبرین سمجھتے ہیں کہ ہماری تعظیم کی۔ حالانکہ یہ تعظیم نہیں ہے بلکہ خوف ہے۔ تو چونکہ اُن سے کسی کو محبت نہیں ہوتی اس واسطے اُنکو محبت کا اندازہ نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ساتھ محبت ہو تو اُس کے ساتھ اُن کا وہی برتاؤ ہوتا ہے جو کہ علماء کا عوام سے۔ غرض وہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دو سو تین سو سقے کھڑے ہیں اور اُن کو دیکھتے ہی سب کے سب تعظیم کے لئے بڑھے رئیس صاحب نے یہ عظمت و محبت کبھی عمر بھر میں بھی نہ دیکھی تھی آخر کھانا آیا تو مولوی صاحب نے سقوں کو اشارہ کیا انہوں نے نہایت اصرار و خوشامد سے کھلانا شروع کیا آخر اس رئیس نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ مولانا واقعی میں نے آج دیکھا اور آج مجھ کو معلوم ہوا کہ عزت رئیسوں میں جانے سے نہیں بلکہ غریبوں کے گھر جانے میں ہے۔ تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی غرباء کی دعوت منظور فرما لیتے تھے چنانچہ ایک درزی کے ہاں چلے گئے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھ تھے آخر وہ درزی کپڑا سینے بیٹھ گئے آج کل اس کو بے تہذیبی سمجھتے ہیں کہ مہمان کے سر پر مُسلّط کیوں نہ ہوا۔ صاحبو! یوں سمجھ میں آتا ہے کہ جن اُمور کا نام آج تہذیب رکھا ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کو کوئی کام نہ ہو یا ہو تو دماغی کام نہ ہو ورنہ اگر کوئی دماغی کام ہو تو یہ آج کل کی تعظیم و تہذیب مثلاً میزبان کا مہمان پر مُسلّط ہو جانا اس قدر گراں گذرتا ہے کہ جس کی حد نہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سر پر کوئی پہاڑ رکھدیا لیکن اس زمانے میں لوگوں کو یہ حرکتیں گراں نہیں گذرتیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کے متعلق کوئی فکر کا کام نہیں اگر کوئی فکر کا کام ہو تو ممکن نہیں کہ اس سے گرانی نہ ہو اسی طرح اکثر لوگ اپنے نوکروں کو حکم کرتے ہیں کہ تم کھڑے رہو میں کہتا ہوں کہ اس طرح کھڑے رہنے سے اُن اُمراء

کا دل نہیں گھبراتا دوسرے اگر وہ بیٹھ جائیں تو کیا مضائقہ ہے اُن کی شان ریاست میں کیا کمی آئی جاتی ہے اور ان حرکتوں کا اثر یہ ہے کہ ان سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور تکبر خدا تعالےٰ اور بندے کے درمیان ایک بڑا حجاب ہے خدا تعالےٰ نے کلام مجید میں ایک جگہ اپنے بندوں کی مدح فرمائی ہے تو سب سے پہلے صفت یہ فرمائی ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ۔ اللہ کے نیک بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔ اس کے بعد نماز اور اس کے بعد معاملات اُسکے بعد عقائد وغیرہ کو فرمایا ہے اس ترتیب میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب میں اوّل تواضع کی صفت کو فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ اگر تواضع نہ ہو تو ایمان نہیں ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر خدا تعالےٰ نے کفار کی مذمت فرمائی ہے تو اُس میں ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ا۔ظلم و زیادتی۔ فرمایا ہے۔ غرض خدا تعالےٰ کو یہ بات بالکل ناپسند ہے کہ انسان بُت کی طرح بیٹھا رہے اور نوکر اُس کے سامنے کھڑے رہیں۔ اب چونکہ کھانے میں بھی اس قسم کے تکلفات اور تصنّعات ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی ایسا کرے جیسا اُس درزی نے کیا تو لوگ اُس کو بے تہذیب بتلادیں تو حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کدو کے ٹکڑے تلاش کرکے کھا رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتے دیکھکر اُس روز سے مجھے کدو سے محبت ہوگئی ہے آپ نے دیکھا محبت ایسی چیز ہے ہم کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ہم کو محبت نہیں ہے ورنہ محبت وہ چیز ہے کہ محبوب کی ہر ہر ادا محبوب ہوجاتی ہے اس سے اس زمانہ میں عظمت۔ اسکی مثال سمجھو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ایک حاکمِ اعلیٰ لنگڑا کر چلتا تھا تو دلدادگان فیشن نے اُس کی تقلید میں لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک بادشاہ کی ڈاڑھی گاؤدم تھی تو لوگ مدت تک اُسی قسم کی ڈاڑھی رکھتے تھے بلکہ شاید دعا کرتے ہوں کہ ہماری ڈاڑھی اُسی قسم کی ہوجائے اور ہم لنگڑے ہوجائیں تو دیکھئے عظمت سے اس زمانے میں تشبہ کا مسئلہ ایسا چلا کہ علماء منع کرتے کرتے عاجز آ گئے لیکن لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا حالانکہ اس میں کوئی معذوری بھی نہیں ہے بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر اُس میں معذوری بیان کی

جاسکتی ہے جیسے رشوت کا دینا یا بعض اوقات میں لینا اگرچہ واقعیت کے اعتبار سے اس میں بھی کوئی معذوری نہیں ہے لیکن وضع میں تو کوئی مجبوری وہمی بھی نہیں مگر وضع کا چھوڑنا دشوار ہو رہا ہے وجہ اس کی یہی ہے کہ عظمت نے اس کو محبوب بنا دیا ہے۔ تو اہلِ دنیا کی عظمت نے جب یہ رنگ دکھلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کیوں یہ رنگ نہ دکھلاتی۔ صاحبو! اس کا کوئی شافی جواب دیجئے کہ اطمینان ہو ورنہ اپنی حالت درست کیجئے کیا جواب ہے اس کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت سے تو ذرا بھی رنگ نہ بدلے اور ایک بے دین کی ایسی عظمت ہو کہ اس کی تقلید میں حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہے میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عذاب بھی نہ ہو صرف خدا تعالیٰ اپنے روبرو کھڑا کر کے یہ پوچھ لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت تمہارے دلوں میں زیادہ تھی یا شاہانِ دنیا کی تو کیا جواب دو گے۔ اگر کہو کہ یہ اتباع عظمت کی وجہ سے نہیں تو میں کہوں گا کہ بالکل غلط ہے بلکہ محض عظمت ہی کی وجہ سے ہے پس معلوم ہوا کہ لباس میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہیے اور معاملات میں بھی اور یہ ہی معنی ہیں اس حدیث کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے ۷۳ فرقے ہوں گے سب دوزخ میں جائیں گے مگر ایک اور وہ مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں مَا اَنَا عَلَيْهِ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بعینہ وہی لباس ہو بلکہ اگر قولی اجازت ہو تو اس پر عمل کرنے والا بھی عامل بالسنت ہے تو یہ حکمت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد میں وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا بھیج ان میں رسول یعنے یہ کہ آپ ایک نمونہ ہوں گے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ضرورت کو محسوس فرما کر دعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الخ یہ تو تمہید تھی اب صرف یہ مضمون رہ گیا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت تھی اور وہ مہتم بالشان ہے کہ اس میں یہ بتلایا جائے گا کہ ہم میں اہتمام بشانِ دینی نہیں رہا سو اس کو کسی دوسرے وقت بیان کر دیا جائے گا۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہماری اصلاح فرمائیں۔ اور ہمیں توفیقِ عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِی

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

دوسرا وعظ مسمّٰی بہ

ضرورۃ العلم بالدّین

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

دعواتِ عَبدیت جلد سوم کا دوسرا وعظ مسمّٰی بہ
ضرورۃ العلم بالدین

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھکر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
الٰہ آباد مدرسہ احیاء العلوم	۵ر ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ہجری	۲ گھنٹے	کھڑے ہوکر	ضرورت علم دین	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تقریباً ۲۰۰۰	انگریزی خواں طلبہ اور عوام اہل شہر اور عہدہ داران شہر زیادہ تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ۔ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۵

(ترجمہ) اے رب ہمارے اور بھیجئے اُن میں ایک رسول جو انہیں میں سے ہو پڑھے ان پر آیتیں آپ کی اور سکھا دے ان کو کتاب اور حکمت، اور پاک کرے اُن کو آپ قدرت والے ہیں اور حکمت والے ہیں یہ وہی آیت ہے جس کی تلاوت جمعہ کے روز کی گئی تھی اور اس کے متعلق بطور تمہید کے کچھ عرض کیا گیا

تھا۔ اور اس کا خلاصہ یہ عرض کیا گیا تھا کہ اِس حکایت میں یہ بات سُنادی ہے کہ تمہاری یہ خصلت کہ اعتناء فی الدین میں قلت ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں جتنی حکایتیں ہیں اُن سے مقصود جُمل اِنشائیہ ہیں اگرچہ عنوان خبر کا ہے یعنی صرف حکایت مِنْ حَیْثُ ھِیَ حکایت مقصود نہیں ہے اس لئے کہ قرآن شریف کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ ایک روحانی مطب ہے جس میں امراضِ باطنی کا علاج بتلایا گیا ہے اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ آج کل لوگوں نے قرآن کے مَا وُضِعَ لَہٗ کو بالکل نہیں سمجھا قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن میں نہیں ہیں. کوئی اس میں سائنس ڈھونڈھتا ہے کوئی جغرافیہ تلاش کرتا ہے اور بہت زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو اُس کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں. کیونکہ ڈھونڈھتا وہ شخص ہے جو کہ جانتا نہیں تو اُس پر تو یہی تعجب ہے کہ اُس نے ناواقفی سے غلطی کی مگر جو لوگ ثابت کر رہے ہیں اُن پر زیادہ تعجب ہے کہ جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی فلسفے کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اُس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھوس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے تیرہ سو برس پہلے اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے اور ان علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ افسوس اِن علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے. میں بقسم کہتا ہوں کہ اِن صاحبوں کو اسلامی علوم کی ہوا بھی نہیں لگی. صاحبو صنعت اور سائنس سے انکار نہیں کیا جاتا مگر گفتگو یہ ہے کہ قرآن کو اس سے کیا تعلق قرآن میں اگر اس کا ذکر ہے تو محض تبعاً قرآن میں صرف ایک مضمون ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس میں خدا تعالیٰ کے ساتھ قرب کے طریقے بتلائے گئے ہیں اِن طریقوں سے جس چیز کو تعلق ہے اُس کا ذکر مقصوداً یا تبعاً آگیا ہے مثلاً اعتقادات اور اعمال مقصود بالذات ہیں کیوں کہ قرب کا طریقہ یہی ہیں اور بعض چیزیں جن کو مِنْ وَجْہٍ دخل ہے وہ تبعاً آگئی ہیں مثلاً قرآن نے توحید کا دعویٰ کیا اس کی دلیل میں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ آسمان اور زمین پیدا کرنے

ہیں. فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ ان کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں تو ان کائنات میں چند حیثیتیں ہیں اوّل ان کا دلیل توحید ہونا. دوسرے اُن کے پیدا ہونے کے طریقے اور تیسرے اُن کے تغیرات کے ڈھنگ. قرآن کو صرف پہلی حیثیت سے اِن سے تعلق ہے اِس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیوں کر ہوتی ہے اور اِسی قسم کے حالات. تو قرآن سے اِس کا تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ خود اِس کی فکر میں پڑنا لغو ہے. حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو ترک کردے یہ ایسی کام کی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بتلائی ہے کہ اگر اس پر کاربند ہوجائیں تو ہم بہت سی مشکلات سے نجات پا جائیں. اور اِس کا ذرا عنوان بدل دیا جائے تو اس کی حقیقت منکشف ہوجائے گی. خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اضاعتِ وقت سے منع فرمارہے ہیں. اِس وقت لوگ علی العلوم اضاعتِ اوقات کی قباحت اور حفاظتِ اوقات کے استحسان پر متفق اللسان ہیں لیکن اس پر عمل اگر کیا ہے تو شریعت نے کیا ہے. دوسرے محض دعوے ہی دعوے کرتے ہیں تو جس چیز میں کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو وہ لایعنی ہے. اَب فرمایئے کہ اگر کسی طرح یہ ثابت بھی ہوگیا کہ بادل اس طرح بنتا ہے اور بارش یوں ہوتی ہے تو کیا نفع ہوگا اور اگر نہ معلوم ہوا تو اس پر کونسا کام اٹکا ہوا رہ جائے گا محض ایک تحقیق ہے کہ جس میں نفس کو حظ ہے دوسرے اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ان تحقیقات میں کوئی دنیاوی نفع ہے تو گفتگو اس میں ہے کہ قرآن جس امر کے لئے ہے اُس کے ساتھ بھی اس کو کوئی تعلق ہے یا نہیں موٹی بات ہے کہ قانونِ شاہان میں تجارت اور زراعت سے بحث کی جاتی ہے مگر اس طرح کہ کونسی تجارت جائز ہے اور کون سی ناجائز تاکہ امن قائم رہے یہ کسی قانون میں نہیں ہے کہ تجارت اس طرح کرنی چاہیئے اور نفع کی فلاں فلاں صورتیں ہیں

اگر قانون کی کتاب میں ساری باتوں کا ہونا ضروری ہے تو دکھلا یئے کہ قانونِ گورنمنٹ میں یہ سب چیزیں کہاں ہیں بس قرآن بھی ایک قانون ہے امن اور نجات کا اور وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں امن قائم رہے اور آخرت میں نجات ہو غرض قرآن ایک قانون ہے تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ حکام ظاہری کے قانون میں تو ان مسائل سائنس کو تلاش نہ کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے قانون میں ان تمام باتوں کو تلاش کیا جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں تو اس تقریر سے ثابت ہوا کہ جغرافیہ وغیرہ مقصود نہیں ہیں البتہ اگر اُن کا ذکر ہوگا تو تبعًا ہوگا کسی ضرورت کی وجہ سے اور بقاعدہ اَلضَّرُوْرِیُّ یَتَقَدَّرُ بِقَدَرِ الضَّرُوْرَۃِ ۔ ان کا ذکر بھی اسی قدر ہوگا جس قدر سے کوئی ضرورۃ متعلق ہے چنانچہ سائنس وغیرہ کے متعلق جو گفتگو ہے محض اِس قدر کہ یہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لئے ایک صانع کی ضرورت ہے لہذا اِن کے لئے بھی کسی صانع کی ضرورت ہے سو اِس استدلال کے لئے اِس کی ضرورت نہیں ہے کہ اِن چیزوں کی حقیقت بھی دریافت ہوجائے بلکہ مجملاً اُن کا علم ہونا کافی ہے۔ بلکہ اِن مسائل کو موقوف علیہ کہنا مُضر ہے راز اس میں یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ مقدمات دلیل کے یا نظری ہوتے ہیں یا بدیہی اور نظری کا مرجع مقدماتِ بدیہیہ مسلمہ ہونگے جب یہ سمجھ میں آگیا تو سمجھو کہ قرآن ہُدًی لِلنَّاس ہے اور ہُدًی للمتقین ہے۔ لیکن ہدًی للمتقین سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض متقیوں کے لئے ہے اور غیر متقی کے لئے نہیں اس آیت سے اکثر لوگوں کو دھوکہ ہوجاتا ہے نیز دوسری آیات میں بھی غلط سمجھ لیتے ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قرآن کو فلسفی نظر سے دیکھا جاتا ہے چنانچہ اس سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے اِس کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں یہ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ متقی نظر آتے ہیں یہ اسی کی بدولت متقی بنے ہیں اِس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اَب بالکل صاف

ہوگیا. تو اس میں کوئی توجیہہ یا تاویل نہیں ہے صرف بات یہ ہے کہ لوگ محاورات سے قطع نظر کرکے فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں اِسی واسطے ضروری ہے کہ قرآن کو تمام علوم فلسفیہ سے پہلے کسی محقق عالم سے پڑھ لیں باقی نِرے ترجمے کا خود مطالعہ کرنے سے قرآن حل نہیں ہوتا مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک وکیل میرے ہاں مہمان ہوئے اُن کے پاس قانون تھا میں نے اُس کو دیکھا اور اُن کے سامنے اُس کی تقریر کی تو کہنے لگے کہ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے. اب اس سے اندازہ کرلیجئے کہ جب ہم اپنے ابنائے جنس کے تجویز کردہ قانون کی اُردو عبارت کو مطالعہ سے بدون اِس کے کہ کسی ماہر سے حاصل کریں حل نہیں کرسکتے تو قرآن شریف کو محض اُس کا اُردو ترجمہ دیکھ کر کیسے حل کرلیں گے. پس وہ لوگ جو محض ترجمہ کو دیکھ کر قرآن کے مطالب حل کرنا چاہتے ہیں کیسی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں اور پھر غضب پر غضب یہ ہے کہ ترجمہ بھی وہ دیکھا جاتا ہے جو بحیثیتِ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے. ترجمہ میں یہ ضروری بات ہے کہ قرآن کا مدلول باقی رہے اور آج کل کے ترجموں میں اُن کو بامحاورہ کرنیکے درپے ہوکر اِس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن کے ترجمے میں بامحاورہ کے اتباع کی ضرورت نہیں کیوں کہ قرآن کوئی ادب کی کتاب نہیں ہے. اِس کا فیصلہ علماء سے کرانا چاہیئے. ترجمہ قرآن کی ایسی مثال ہے جیسے نسخہ لکھنا اگر کوئی غیر فصیح الفاظ میں نسخہ لکھے لیکن ادویہ سب ٹھیک ہوں تو نسخہ کارآمد ہے اور اگر نہایت فصیح بلیغ الفاظ میں لکھے لیکن ادویہ کا نام غلط لکھدے تو نسخہ بیکار ہے تو لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ترجمے میں محض محاورے کا اِتباع کرتے ہیں گو اصل مدلول محفوظ نہ رہے. اِس وقت اِس قسم کے بہت سے ترجمے ہوگئے ہیں تعیین کی ضرورت نہیں ہے. البتہ آپ لوگوں کو اتنا ضرور کرنا چاہیئے کہ جب تک علماء سے دریافت نہ کرلو اس وقت تک کسی ترجمے کو بھی نہ دیکھو اور دریافت کرنے کے بعد بھی اپنے دیکھنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ کسی سے پڑھ لو یہ صورت قرآن مجید کے صحیح سمجھنے کی ہے غرض یہ ہے کہ اس وقت یہ غلطی عام ہو رہی ہے کہ قرآن کو

پڑھتے ہیں لیکن سمجھ کر نہیں پڑھتے اِسی واسطے اشکالات ہوتے ہیں ورنہ کوئی بھی اشکال نہیں ہے مثلاً هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہی میں یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف متقی کے لئے ہدایت ہے اور کسی کے لئے نہیں حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ تعلیم اس کی عام ہے اور دلائل بھی عام فہم ہیں۔ بیچ میں ایک جملہ معترضہ کہتا ہوں وہ یہ کہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کے دلائل عام فہم ہیں تو ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہونی چاہیئے چنانچہ آج کل اجتہاد کا ایسا زور ہے کہ لوگ محض ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس ایک مرتبہ ایک مؤذن آیا اور کہنے لگا کہ قرآن شریف سے مسح ارجل بھی ثابت ہے اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ لاکر دکھلایا وہ ترجمہ اگرچہ صحیح اور با محاورہ ہے لیکن اُس کو بھی خود دیکھ کر سمجھنا مشکل ہے اُس میں لکھا تھا کہ دھوؤ اپنے مُنہ اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو اس کے بعد ہے وَاَرْجُلَكُمْ اُس کا عطف ہے اَيْدِيَكُمْ پر اور وہ معمول ہے اِغْسِلُوْا کا ترجمے میں یہ لکھا تھا کہ اور پیروں کو۔ آپ کو بوجہ صرف نحو نہ جاننے کے یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ یہ کس کے ساتھ متصل ہے آپ نے اُس کو قریب کے ساتھ متصل کیا اور ظاہر ہے کہ جو شخص صرف ونحو سے واقف نہ ہوگا وہ قریب ہی کے ساتھ متصل کرے گا اور جاننے والا یہ دیکھ لیگا کہ اَرْجُلَكُمْ ہے منصوب لہٰذا مجرور کے ساتھ نہیں ہو سکے گا یہ دوسری بات ہے کہ قراءت بھی دوسری لی جائے اس وقت دوسرے قواعد سے اس عطف کا پتہ چلے گا۔ مجھکو سخت پریشانی ہوئی کہ اِس کو کیوں کر سمجھاؤں اور کیوں کر کہوں کہ اِس کا عطف اَيْدِيَكُمْ پر ہے کیونکہ یہ عطف ہی کو نہیں جانتا آخر میری سمجھ میں یہ آیا کہ اِس کے ساتھ دماغ تھکانا فضول ہے کیوں کہ یہ اِس کی استعداد سے بالکل باہر ہے۔ یہ بھی آجکل مرض ہو گیا ہے کہ لوگ اپنی استعداد سے زیادہ سوال کرتے ہیں۔ ایک انجینئر ملے اور مجھ سے سوال کیا میں نے کہا کہ یہ بلاغت کے متعلق ہے آپ اس کو نہ سمجھ سکیں گے کہنے لگے کہ واہ صاحب عالم تو وہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے فہم کے مطابق سمجھا دے میں نے کہا کہ بہتر مجھے آپ اُقلیدس کے مقالۂ اوّل کی

پانچویں شکل سمجھا دیجئے لیکن اِس طرح کہ نہ تو اصول موضوعہ کا حوالہ ہو نہ علوم متعارفہ کا واسطہ ہو اگر اس طرح سمجھانا ممکن ہے تو میں اُس تقریر کے سُننے کا بہت زیادہ مشتاق ہوں اور اگر کہئے کہ اس طرح سمجھانا ممکن نہیں تو میں کہوں گا کہ عالِم اقلیدس وہی ہے جو کہ ہر شخص کو اُس کے فہم کے موافق سمجھا دے کہنے لگے کہ اچھا تو ہم کو کیا کرنا چاہیئے میں نے کہا کہ اگر شوق ہے تو انجینئری کو طاق پر رکھیئے اور ہمارے پاس آکر میزان سے کتابیں شروع کیجئے جب اس مقام تک تعلیم پہنچے گی تو ہم بتلائیں گے کہنے لگے کیا ہم اب بڈھے ہو کر پڑھنے بیٹھیں گے میں نے کہا اگر تحقیق کا شوق ہے تو اس کی تو یہی صورت ہے اور اگر یہ صورت منظور نہیں تو ہماری تقلید کیجئے اور جو کچھ ہم کہیں اُس کو مان لیجئے اور یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ ہر شخص اِس کو جانتا ہے اور رات دن اسی کے موافق کارروائی ہوتی ہے مثلاً اگر ایک شخص بوڑھا آپ کے پاس عنـــہ روپیہ ماہوار کی تنخواہ چھوڑ کر آیا اور سولہ دن کی تنخواہ کی مقدار آپ سے پوچھے اور آپ نے حساب کر کے بتلادی تو اگر وہ یہ کہے کہ سولہ دن کی تنخواہ کی یہ مقدار کیونکر ہوگئی تو آپ اُس کو کیا جواب دینگے ظاہر ہے کہ یہی کہا جائے گا کہ تو فنِ حساب سے ناواقف ہے تیری سمجھ میں یہ نہ آئے گا اور اگر تو یہ سمجھنا چاہتا ہے تو ابتدا سے جمع تفریق ضرب تقسیم وغیرہ سیکھ اُس کے بعد اس کی وجہ دریافت کرنا اِس پر اگر وہ یہ کہے کہ کیا میں بڑھاپے میں حساب سیکھوں گا تو آپ یہی جواب دیں گے کہ وجہ سمجھنے کے لئے تو اِسی کی ضرورت ہے اگر اس کی ہمّت نہیں تو جو کچھ ہم کہتے ہیں اُس کو سچ سمجھو علی ہذا اور ایسے ہی واقعات روز مرّہ ہوتے رہتے ہیں دیکھئے دنیوی امور میں کبھی کوئی نہیں اُلجھتا ہمیشہ تقلید کی جاتی ہے اور دینی امور میں ہر شخص خود مجتہد ہے طبیب کے پاس جاتے ہیں اور جو کچھ وہ کہدیتا ہے اُس کو بلا چون وچرا مان لیا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ نسخے میں یہ دوا کیوں لکھی اور اس دوا کا یہ وزن کیوں لکھا وجہ یہ ہے کہ اُس پر عمل کرنا منظور ہوتا ہے جان کو عزیز سمجھتے ہیں کھود کرید میں اندیشہ ہوتا ہے کہ طبیب بگڑ نہ جائے اور دین پر عمل کرنا منظور نہیں۔ واللہ

اگر دین پر عمل کرنا ہوتا تو غنیمت سمجھتے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو ہم کو سیدھا رستہ بتلا سکتے ہیں کیوں کہ جب انسان کو کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اُس کے متعلق عمل کے موافق علم ہو جانے کو بہت غنیمت سمجھا کرتا ہے یہ چون وچرا وہیں ہوتی ہے جہاں کام کرنا مقصود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کو اسٹیشن جانا ہے اور رستے سے واقفیت نہیں تو اگر کوئی معمولی آدمی بھی کہے کہ آؤ میں اسٹیشن پر پہنچا دوں تو بے تامل اُس کے ساتھ ہو لیتے ہیں کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ اِس امر پر کہ جس رستے کو تم جا رہے ہو یہ اسٹیشن پر پہنچا دے گا۔ اور اسٹیشن سے زیادہ دور نہ کردے گا کیونکہ جانتا ہے کہ اِس میں چون وچرا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خفا ہو کر یہ مجھے یہیں چھوڑ دیگا اور پھر میں نہ پہنچ سکوں گا اسی طرح اگر کسی بڑے اسٹیشن پر یہ معلوم نہ ہو کہ دِلّی اور لکھنؤ کی جانے والی گاڑی کونسی ہے تو ایک قلی کے کہنے پر یقین آجاتا ہے اور بغیر کچھ پس وپیش کئے ہوئے اُس کو مان لیا جاتا ہے اور اِس مفت کے علم کو غنیمت سمجھ کر قلی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ہاں اگر جانا ہی نہ ہو تو اُس میں نکتہ چینیاں نکالی جاتی ہیں اور اس کو بتایا جاتا ہے کہ ہاں جناب تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کانپور کو یہی گاڑی جائے گی اور میں یہ کیونکر مان لوں کہ یہ دسؔ بجے ہی چھوٹ جائیگی علیٰ ہذا غرض جب تک استعداد محققانہ نہ ہو اُس وقت تک تقلید کرنی چاہیئے اور جب ایسی استعداد ہو جائے تو وہ مبارک ہے اُس وقت جس قسم کے سوالات بھی (بشرطیکہ لغو نہ ہو) چاہیں پیش کریں لیکن اس کی کچھ عادت ہو گئی ہے۔ چنانچہ اُس مؤذن نے مسح ارجل کے متعلق سوال کیا میں نے کہا کہ یہ کونسی کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہے کہنے لگا کہ قرآن ہے میں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قرآن ہے کہنے لگا کہ علماء کے کہنے سے میں نے کہا کہ جب قرآن کا قرآن ہونا علماء کے کہنے سے مان لیا تو اس کو بھی علماء کے کہنے سے مان لو کہ پیروں کا مسح نہیں ہے بلکہ غسل ہے اور واقعی یہ موٹی بات ہے کہ جب علماء کے کہنے سے ایک عربی کتاب کو خدا کا کلام مان لیا تو ایک مسئلے کو علماء کے کہنے سے ماننے میں کیا تامل ہے۔ ایک شخص پرتاب گڑھ میں ملے اور فاتحہ خلف الامام کے متعلق

سوال کیا۔ میں نے کہا کہ آپ کو دوسرے سب مسائل محقق ہو گئے انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں پھر میں آپ سے دلیل پوچھوں گا اور دُنیا بھر کے مذاہب کو پیش کر کے سب کی تردید کراؤں گا اگر آپ ایک جگہ بھی جھجکے تو آپ مقلّد ہیں اور جب کہ آپ اصل مذہب میں مقلّد ہیں تو فرعی مسائل میں تقلید کرتے کیوں عار آتی ہے بات وہی ہے کہ اس وقت لوگوں کو کام کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ کام کرنے والوں کی صورت ہی اور ہوتی ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ترجمہ اس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کسی عالِم سے اس کو پڑھ نہ لیا جائے۔ اگر خود پڑھنے کا شوق ہو تو لفظاً ہی پڑھنے چاہئیں کیونکہ خود مطالعہ کرنے سے مطلب حل نہیں ہو سکتا اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر قانون میں امتحان دینا چاہیں اور کسی سے پڑھا نہ ہو تو ہرگز پاس نہ ہوں گے اور جب لکھنے بیٹھیں گے بیسیوں شبے پڑیں گے اور اپنی سمجھ کو ہرگز کافی نہ سمجھا جائے گا۔ تو جب ایک معمولی قانون میں یہ حالت ہے تو قرآن ہی اس قدر سستا کیوں ہو گیا کہ ہر شخص اس میں محقق ہے اور اپنی ساری تحقیقات اِس میں ختم کر دی گئی ہیں علماء سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قرآن بہت آسان ہے تو ہر شخص کو محقق بننے کی اجازت کیوں نہیں دیجاتی تو بات یہ ہے کہ الفاظ اور ترجمہ آسان ہے لیکن اخذ اور استنباط بہت مشکل ہے اس کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور اس کیلئے کچھ سامان کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہے تو قرآن کا یہ جزو مشکل ہے باقی آسان۔ اور دلائل توحید بھی اس اعتبار سے آسان ہیں کہ جو شخص مجتہد بھی نہ ہو وہ بھی اُن کو سمجھ سکتا ہے۔ اب سمجھئے کہ اگر دلائلِ توحید میں سائنس کے مسئلے مذکور ہوتے تو توحید کا سمجھنا اُن کے علم پر موقوف ہوتا اور وہ خود نظری ہیں تو توحید بدون اُن کے سمجھے ہوئے ثابت نہ ہوتی اور مخاطب اُن دلائل کے عرب کے بادیہ نشین تک ہیں تو وہ توحید کو کیسے جانتے۔ تو یہ نقصان ہے قرآن میں مسائلِ سائنس کو داخل کرنے کا کہ اصل مقصود ہی اُڑا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے

کہ گو قرآن میں جگہ جگہ سمٰوٰت اور ارض ہیں لیکن سمٰوٰت بہ صیغۂ جمع اور ارض بہ صیغۂ واحد لایا گیا تاکہ مقدمات میں شغب نہ ہونے لگے پھر مستقل دلیل سے بتلادیا کہ زمین بھی سات ہیں چنانچہ بعض کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ کہ ہم تو سب جگہ پھرے ہم کو تو کوئی دوسری زمین نہیں ملی اور ارض کا ترجمہ حدیثِ تعدّدِ ارض میں اقلیم کا کیا اور غضب تو یہ ہے کہ بعض اہلِ علم نے بھی یہ لکھا ہے۔میں کہتا ہوں کہ جب قرآن شریف میں بعد سبع سمٰوٰتٍ طباقاً کے مِنَ الارض مثلھن فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ اور حدیث میں صاف آگیا ہے کہ سات آسمان ہیں اور ہر دو آسمان کے درمیان ۵۰۰ برس کی راہ ہے۔پانچسو برس سے مُراد کثرت ہے اس کے بعد زمین کے متعلق یہی فرمایا اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے رہا یہ اِشکال کہ ہم کو دوسری زمین نظر نہیں آتی۔ سو اِس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ نے اُس کو کب سمجھا ہو۔مثلاً اِن ہی ستاروں میں سے چند ستارے ہوں۔افسوس ہے کہ مُسلمان اگر ایک بات کو اپنے لوگوں کے مُنہ سے سُنتے ہیں تو یقین نہیں کرتے اور اگر اُسی بات کو دوسری قومیں کہدیتی ہیں تو صحیح سمجھا جاتا ہے۔چنانچہ اِسی زمین کے مسئلے کے متعلق علماء مدّت سے کہہ رہے ہیں اور لوگ یقین نہیں کرتے اور اب چند روز سے جو دوسری قومیں مرّیخ کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کر رہی ہیں جن سے بعض اُمور میں اُس کا مشابہ اِس زمین کے ہونا معلوم ہوتا ہے اُن کا یقین کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دیکھئے کتنی بڑی اور کتنی نئی تحقیق ہے غرض ممکن ہے کہ یہ ستارے ہی وہ زمین ہو اور کوئی دوسری مخلوق وہاں رہتی ہو جس کی تعیین ہم نہیں کرسکتے نہ ہم کو بتلایا گیا اور نہ اس کی ضرورت۔ اور ہم کو اپنی تو خبر ہی نہیں دوسری مخلوق کی کیا خاک خبر ہوسکتی ہماری وہ حالت ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

زمین کے کام کو تو نے خوب کرلیا ہے جو آسمان کی طرف چلے۔

ہماری وہ حالت ہے کہ جیسے ایک شخص ہے کہ اُس پر فوجداری کے بہت سے مقدمات قائم ہیں مگر وہ احمق اپنی فکر کو چھوڑ کر سارے الہ آباد کے مقدمات کی تحقیق کرتا پھرے ظاہر ہے کہ اگر اُس کو ذرا بھی عقل ہوتی تو وہ ان سب کو چھوڑ کر اپنے مقدمات کی فکر کرتا اِسی طرح جو لوگ دنیا بھر کی تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ ان پر تعزیراتِ الٰہیّہ کی بہت سی دفعات عائد ہو رہی ہیں یہ اُن کی سخت نادانی اور غفلت ہے غرض ہم کو بتلایا نہیں گیا لیکن ممکن ہے کہ کچھ مخلوق چاند اور مرّیخ وغیرہ میں ہو پس نصوص کی تکذیب کی کوئی ضرورت نہیں تو باوجودیکہ یہ بات ثابت تھی مگر پھر بھی قرآن میں ارضین نہیں فرمایا بلکہ ارض بصیغۂ واحد ارشاد فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف یہ ہے کہ اِن مصنوعات سے توحید پر استدلال کیا جائے اور استدلال مقدماتِ مسلمہ سے ہوا کرتا ہے تو اگر ارضین فرماتے تو اصل مقصود تو ثابت نہ ہو سکتا اور یہ مسئلہ گفتگو کے قابل ہو جاتا اور اب یہ ہوا کہ جو لوگ واقف ہیں وہ لفظِ ارض ہی سے جو کہ اسمِ جنس ہے قلیل کثیر سب کو شامل سمجھ لیتے ہیں اور جو لوگ واقف نہیں وہ بھی بوجہ ایک ارض کے محسوس ہونے کے نفسِ استدلال کو بخوبی سمجھ گئے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں کسی ایسے مسئلے سے کام نہیں لیا گیا جس سے سامع کو اُلجھن ہو تو اگر سائنس کے مسئلے اِس میں ہوتے تو سامعین اُنکی تحقیق میں پڑ جاتے اور ہر شخص کو اُس کے آلات و ذرائع کی تحصیل ممکن نہ تھی تو ہر شخص ایک اُلجھن میں پڑ جاتا نیز ان میں اختلاف اس قدر ہے کہ آج تک بھی کوئی بات محقق نہیں ہوئی دیکھئے قطب تک پہنچنے میں جو کہ محسوس ہے کس قدر اختلاف ہے پس مسائلِ حقہ کی بناء ان پر کیوں کر ہو سکتی ہے تو واجب ہے کہ قرآن کو سب سے خالی کیا جائے یہی قرآن کی خوبی ہے اور ہر فن کے لئے یہی بات خوبی کی ہوتی ہے۔ نحو کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں طب کے مسئلے نہ ہوں۔ طب کی خوبی یہ کہ اس میں زراعت تجارت کے مسئلے نہ ہوں اگر طب کی کتاب میں ہر ورق کے بعد زراعت اور تجارت

کا بھی ایک ایک مسئلہ ہو تو تمام عقلاء اُس کو ہنسیں گے اِس لئے کہ طب کی کتاب میں اُن مسائل کا ہونا بے موقع ہے اِس موقع پر مجھے یاد آیا ہمارے وطن میں ایک شاعر تھے اب انکا انتقال ہوگیا ہے انہوں نے اپنا ایک دیوان مرتب کیا تھا. نہایت ہی بیہودہ اُس میں ردیف ضاد نہ تھی لوگوں نے کہا جناب اِس میں ردیف ضاد نہیں ہے کہنے لگے کہ دوسری کسی ردیف میں سے ایک غزل لے کر ہر شعر کے آخیر میں لفظِ مقراض بڑھا دو اور ردیف ضاد میں لکھدو۔ اب غور کیجئے کہ اُن کی اس حرکت کو کس نظر سے دیکھا جا رہا ہے کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن بھی ایسا ہی دیوان ہو کہ اُس میں تمام ردیفیں ہوں گو بے ربط ہوں قرآن شریف نے صرف دو چیزوں کا اہتمام کیا ہے ایک امنِ عام کہ اِس دنیا میں رہ کر یہ حالت ہو کہ کسے را با کسے کارے نباشد۔ میں کہتا ہوں کہ جو امن قرآن نے سکھلایا ہے کسی قانون نے نہیں سکھلایا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت لوگ مسلمانوں کو شورش پسند کہتے ہیں حالانکہ اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے تو مسلمانوں سے زیادہ امن پسند اور عافیت جو کوئی قوم دنیا میں نہیں ہے مثال کے طور پر ایک ایک جزئی بیان کرتا ہوں جمعے کے متعلق فرماتے ہیں اِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ جب نماز ہوچکے تو پھیل جاؤ زمین میں وہ مجمع جو کہ محض خدا تعالےٰ کی عبادت کے لئے اور خدا تعالےٰ کے سامنے سر جھکانے کیلئے جمع ہوا ہے اُس کو بھی یہ حکم ہو رہا ہے کہ جب اپنا کام کر چکو تو جمع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں سب منتشر ہو جاؤ کیوں کہ ممکن ہے فضول اجتماع سے کوئی خرابی پیدا ہو آگے فرماتے ہیں وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ تلاش کرو فضل خدا کا جس سے مقصود یہ ہے کہ منتشر ہو کر بھی اِدھر اُدھر مارے مارے نہ پھرو کیونکہ اُس میں پھر فساد کا احتمال ہے بلکہ رزق حلال کی تلاش میں لگو پھر فرماتے ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا یعنی خدا تعالےٰ کو بہت یاد کرو کیونکہ اصل مقصود یہی ہے کہ خدا تعالےٰ کا قرب حاصل ہو. تو حق تعالیٰ کے اِس کلام سے معلوم ہوا کہ مجمع بلا ضرورت نہ ہونا چاہیئے اور اگر کسی ضرورت سے ہو تو ضرورت کے ختم ہو جانے پر سب کو منتشر ہو جانا چاہیئے. غور کیجئے کہ نمازیوں کا مجمع جس میں شورش و فساد کا احتمال ہی نہیں ہے مگر چونکہ خدا تعالےٰ جانتے ہیں کہ

انسان ضعیف ہے عجب نہیں کہ اس میں تُوتُو مَیں مَیں ہوجائے اگرچہ جُوتی پیزار نہ ہو اس لئے حکم فرمادیا کہ سب منتشر ہوجاؤ۔ غرض ایک تو قرآن میں امن کی رعایت ہے دوسرے خدا تعالےٰ کی رضا جوئی اِن دو امر کے سوا اگر کوئی تیسرا مسئلہ آگیا ہے وہ اُس کے تابع ہوکر آیا ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اِس کے سوا اور کوئی مسئلہ نہ ڈھونڈھنا چاہیئے۔ علیٰ ہذا اگر حکایتیں قرآن میں ہیں تو وہ بھی ان ہی کی خادم ہوکر ذکر کی گئی ہیں کہ فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اُن کو یہ سزا ملی اور فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اُن کو یہ اجر مِلا ہم اگر ایسا کرینگے تو ہم کو بھی ایسی ہی سزا یا اجر ملے گا اِس سے معلوم ہوا کہ جہاں جُملِ خبر یہ ہیں اُن سے مقصود جملِ انشائیہ ہی ہیں چنانچہ اِس مقام پر بھی یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام کی دُعا نقل فرمائی جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اعتناء فی الدین نہایت ضروری ہے جس کی تفصیل آیت میں ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہماری اولاد میں ایک رسول پیدا کر کہ وہ اُن کو تیری آیات سُنادے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے اور اُن کو پاک کرے اِس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اے سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے کیا اور سمجھ کر ہم سے دُعا کی۔ اب سمجھنا چاہیئے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں سو وُہ مفصلاً تو تین چیزیں ہیں یَتْلُوْا اور یُعَلِّمُ اور یُزَکِّیْ اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں اس لئے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم اور دوسرا عمل جیسے فنِ طب کہ اُس میں اوّل علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی۔ تو قرآن بھی حقیقت میں طبِ رُوحانی ہے کہ اُس میں روحانی امراض کے علاج کے قواعد اور جزئیات بتلائے گئے ہیں امراض خواہ متعلق قلب کے ہوں یا جوارح کے اور امراضِ قلب کا مرض ہونا حواس سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ وجدان سے معلوم ہوتا ہے اور جب تک وجدان صحیح نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی اطلاع بالدلیل ہوتی ہے وہ دلیل یہ ہے کہ اطاعتِ خداوندی صِراط مستقیم ہے اور صراطِ مستقیم سے خارج ہونا اعتدال سے خارج

ہونا ہے کیونکہ خطِ مستقیم ایک ہی خط ہوتا ہے یعنی اگر دو نقطوں کے درمیان بہت سے خطوط سے اتصال کیا جائے تو اُن خطوط میں خطِ مستقیم ایک ہی ہوگا جو کہ سب سے اقصر ہو باقی سب ٹیڑھے ہوں گے۔ اور اعتدال سے خارج ہونا مرض ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنا مرض ہوا اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ سب طریقوں سے مختصر طریق اور اقصر طریق شریعتِ اسلامی ہے تو اس اعتدال سے جب کوئی خارج ہوگا وہ مریض کہلاوے گا اور قرآن میں اِس کو مرض کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ اِس کی تفسیر جب تک کہ وجدان صحیح نہ ہو سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کے مرض ہونے کی صفت اَمرِ مُبطن ہے جو حواس سے ادراک نہیں ہوتا لیکن جب وجدان صحیح ہوجاتا ہے تو اُس کا مرض ہونا وجدان سے معلوم ہوجاتا ہے۔ جیسے امراضِ ظاہری کی حالت ہے کہ بعض اوقات وجدان سے معلوم ہوجاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔ تو جیسے امراضِ طبیہ میں بعض امراض وجدانی ہیں اسی طرح امراضِ باطنی بھی وجدانی ہیں کہ جب وجدان صحیح ہوتا ہے تو اُن کا ادراک ہوتا ہے اور اس کا ایک امتحان بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب کبھی کوئی گناہ ہوجائے تو دیکھئے کیسی تکلیف اور رنج ہوتا ہے اور اپنے نفس کو انسان کیسی ملامت کرتا ہے اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی نہیں ہوتا دن رات گناہ کرتے ہیں لیکن کچھ بھی تکلیف و رنج کا احساس نہیں ہوتا تو میں کہوں گا کہ اس کا سبب یہ ہے ابتدا سے آج تک یہ شخص مرض ہی میں مبتلا ہے صحت کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی کہ اس کی راحت کا ادراک ہو اور اس سے مرض گناہ کی کلفت کا احساس ہو اِس شخص کی ایسی مثال ہے جیسے ایک اندھا مادر زاد کہ اُس کو یہی ادراک نہیں ہوسکتا کہ میں اندھا ہوں کیوں کہ عمی عدم البصر کو کہتے ہیں تو جس کو بصر کا ادراک نہ ہوگا اُس کو عمی کا ادراک کیوں کر ہوگا تو مریض بھی اپنے کو ذی ہی سمجھے گا اور مرض کی کلفت بھی اُسی کو ہوگی جس نے کبھی صحت دیکھی ہو۔ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم کو تو کبھی تکدر نہیں ہوتا تو وجہ اُس کی یہ ہے کہ اُس کو

کبھی انشراح ہی نہیں ہوا اُس کو چاہیئے کہ انشراح پیدا کرے اُس کے بعد دیکھے کہ اگر کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اُس میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ کم از کم یہی کرے کہ امتحان ہی کے لئے ایک ہفتہ کی رُخصت اپنے معمولی کاموں سے لے اور کسی صاحب برکت کے پاس جاکر رہے اور اس سے اللہ کا نام پوچھ کر جس طرح وہ بتلا وے ایک ہفتہ تک کام میں مشغول رہے کام میں مشغول ہونے کے بعد دیکھئے گا کہ دل کی ایک نئی حالت ہوگئی جو کہ اِس کے قبل نہ تھی اس کو تو محفوظ رکھیئے پھر دیکھئے کہ پہلی حالت اور اِس جدید حالت میں کوئی فرق ہے یا نہیں واللہ آپ دیکھیں گے کہ پہلی حالت نہایت مکدّر تھی اور اب ایک صحت نصیب ہوگئی ہے اور یہ ایک قسم کا انشراحِ قلب ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جب وجدان صحیح ہو جاتا ہے تو وجدان سے اُس کا مرض ہونا معلوم ہو جاتا ہے تو اس کی کوشش کیجئے کہ وجدان صحیح ہو تاکہ مرض کا مرض ہونا تو معلوم ہو جائے کہ اس کے بعد علاج پر توجہ ہو۔ دیکھئے اگر معمولی زکام ہو جاتا ہے تو اُس کے لئے کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے مگر افسوس ہے کہ اتنا بڑا مرض ہم کو لگ رہا ہے کہ ہماری رُوح اُس میں تحلیل ہو رہی ہے لیکن ہم کو ذرا فکر نہیں ہے۔ قرآن نے ہم کو اس کا علاج بتلایا ہے اور اِسے مضار پر اطلاع دی ہے تو قرآن مطبِ روحانی ہے اُس میں صرف یہی دو چیزیں ہیں ایک علم اور دوسرا عمل یُزَکِّیۡ میں عمل کی طرف اشارہ ہے اور یُعَلِّمُ میں علم کی طرف حاصل یہ ہوا کہ اے سُننے والو اہتمام کے قابل دو چیزیں ہیں علم اور عمل انہی کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا۔ پھر علم میں دو مرتبے ہیں ایک الفاظ اور ایک معانی کیونکہ کسی چیز کے جاننے کی شان یہ ہوتی ہے کہ اُس میں کچھ الفاظ ہوتے ہیں اور کچھ اِن الفاظ کے معانی خواہ اُردو میں ہو یا عربی میں خواہ زبانی علم ہو یا کتاب سے تو گویا ترتیب کسی فن کے جاننے کی یہ ہوتی ہے کہ اوّل الفاظ کا تحقیق ہوتا ہے اور پھر دلالت علی المعانی اور پھر اُن کی حقیقت کا انکشاف اور پھر عمل مثلاً اگر کسی طبیب سے کوئی نسخہ دریافت کیا تو اوّل اس کے الفاظ معلوم ہوئے

پھر اُن الفاظ سے معانی پر دلالت ہوئی۔ پھر اُن کی حقیقت کا انکشاف ہوا اِن سب مراتب کے بعد اُس نسخے پر عمل کیا گیا یہی ترتیب عقلی دین میں بھی ہے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے دین کی کوئی عجیب شکل نہیں بنائی بلکہ جو ترتیب ہمارے روز مرّہ امور میں ہے وہی ترتیب اُس میں بھی رکھی کہ سہولت ہو حالانکہ دین وہ چیز ہے کہ اگر اس کا ڈھنگ بالکل نرالا اور سخت بھی ہوتا تب بھی اُس کو بکوشش حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ دین کے حاصل کرنے میں ہمارا ہی نفع ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کا اور نہ حاصل کرنے میں ہمارا ہی نقصان ہے جیسے کوئی طبیب کڑوا نسخہ لکھدے تو اُس کے پینے سے جو کچھ نفع ہوگا مریض کو ہوگا اور نہ پینے سے بھی جو کچھ ضرر ہوگا مریض کو ہوگا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس مضمون کو دوٹوک کرکے فرمادیا ہے کہ مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے اور قرآن میں بہت سی جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ ہمارا نہ کوئی نفع تمہارے ایمان سے اور نہ کوئی ضرر تمہارے کفر سے اور یہ فرمانا ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کہنے لگے کہ اگر تم دوا پیو تو ہمارا کیا نفع اور نہ پیو تو ہمارا کیا ضرر۔ بلکہ حکیم کو تو ایک گونہ نفع بھی ہے خدا تعالیٰ کو تو کچھ بھی نفع نہیں اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے لئے استکمال بالغیر محال ہے ہر چیز اُن کے افادۂ وجود کی محتاج ہے مگر وہ کسی امر میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ آفتابِ عالمتاب عطرخانہ اور گھُورہ سب پر روشن ہے لیکن نہ اُس کو عطرخانہ سے خوشبو پہونچتی ہے نہ گھُورے سے بدبُو اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ   دزگراں جانی و چالاکی ہمہ

کہ ہم تو ایسے مقدّس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں۔ پاکی سے پاک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اُس پاکی سے پاک ہیں کیوں کہ انسان کتنی بھی تقدیس کرے لیکن احصاء غیر ممکن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ ۔ واقعی بڑی سے بڑی تعریف

اور تقدیس بھی اُس کے واقعی تقدس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اِس کی مثال مولانا نے بیان فرمائی ہے کہ ؎

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست — ایں نہ مدح ست او مگر آگاہ نیست

یعنی اگر کوئی شخص بادشاہ کی یہ تعریف کرے کہ آپ اِتنے بڑے آدمی ہیں کہ جولاہہ نہیں ہیں تو کیا اس کو کوئی مدح کہے گا ہرگز نہیں۔ اسی طرح ہمارے فہم کے موافق ہمارے نفع کے لئے تسبیح کو مشروع قرار دیا گیا ہے اِسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

من نگردم پاک از تسبیح شاں — پاک ہم ایشا شوند دُور فشاں

یعنی لوگوں کی تسبیح اور تقدیس سے ہم پاک نہیں ہوگئے بلکہ اِس سے وہی پاک ہوگئے غرض خدا تعالےٰ کی شان یہ ہے کہ وہاں نہ نفع پہونچے نہ ضرر۔ حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا مطیع ہوجائے تو خدا تعالےٰ کی سلطنت میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوتا جتنا مچھر کا پر۔ برخلاف یہاں کے سلاطین کے کہ جس قدر رعایا اطاعت کرے سلطنت زور دار ہے اور اگر رعایا اطاعت نہ کرے تو سلطنت کمزور ہے وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے بادشاہ رعایا کے بنائے ہوئے ہیں اور خدا تعالےٰ خود بالذات کامل ہیں لہٰذا رعایا کو خود اپنے نفع کی فکر کرنی چاہیئے اللہ تعالےٰ کو اُن کی عبادت سے کچھ بھی نفع نہیں غرض طبیب کہ جس میں بوسائطِ بعیدہ نفع کا احتمال ہے جب اُس طبیب کو حق ہے وہ جیسا نسخہ چاہے تجویز کرے تو خدا تعالےٰ کو اُس سے زیادہ حق ہے کہ جیسا قانون چاہتے مقرر کرتے کیونکہ وہ حاکم علی الاطلاق بھی ہیں اور اُس میں ہمارا ہی نفع بھی ہے مگر یہ اس کی رحمت ہے کہ اُس نے نہایت آسانی اور سہولت رکھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اِس پر عمل کرتے بھی جان چُراتے ہیں علماء سے درخواست کی جاتی ہے کہ احکام میں کچھ آسانی کردو گویا یہ سمجھتے ہیں کہ احکامِ شریعت کی تبدیل و تغیر بالکل علماء کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے ایک بڑھیا کا واقعہ یاد آتا ہے کہ جب وہ حج کو گئی اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے لگی تو دو تین پھیرے کرکے مطوّف سے کہنے لگی کہ اب تو مجھ سے نہیں ہوسکتے خدا کے لئے اب تو مجھے معاف کردو تو جیسے وہ بڑھیا یہ

سمجھتی تھی کہ مطوّف کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائیں گے اسی طرح یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں۔ ایک رئیس والیِ مُلک ایک بڑے حاکم سے ملنے کے لئے گئے یہ رئیس بہت دُبلے ہو رہے تھے اُس حاکم نے پوچھا کہ آپ اِس قدر دُبلے کیوں ہو رہے ہیں اُنہوں نے کہ آج کل رمضان کا مہینہ ہے روزہ رکھنے کی وجہ سے دُبلا ہو رہا ہوں کہنے لگا کہ آپ اپنے پادریوں سے کمیٹی کرا کے اِن کو فرور ی کے مہینے میں کیوں نہیں کرا لیتے انھوں نے کہا کہ جناب اِس قسم کے اختیارات آپ ہی کی کمیٹی کو ہیں ہمارے علماء کی کمیٹی کو ایسے اختیارات نہیں ہیں۔ غرض پہلے تو غیر تو میں اس قسم کی درخواستیں پیش کرتی تھیں مگر افسوس ہے کہ اب مسلمان ہی اِس قسم کی درخواستیں پیش کرنے لگے ہیں بلکہ یہاں تک ستم ہونے لگا ہے کہ لوگ درخواست سے گذر کر رائے دینے لگے ہیں کہ ضرور ایسا کرنا چاہیئے میں ایک مرتبہ لاہور گیا تو بہت سے خیر خواہانِ قوم نے یہ طے کیا کہ اِس وقت سُود کے مسئلے پر گفتگو ہو جانی چاہیئے۔ چنانچہ اُن کی خواہش پر گفتگو کی گئی لیکن جلسہ گفتگو کا خاص تھا یعنی صرف علماء تھے۔ سب لوگ نہایت مشتاق تھے کہ دیکھئے کہ تجویز ہوتا ہے حالانکہ وہاں اس کے سوا کیا تجویز ہو سکتا تھا جو کہ تیرہ سو برس سے چلا آرہا ہے اس واسطے کہ اہل علم میں سے کس کی وہ ہمت ہوسکتی جو کہ آجکل کے نوجوان ہمت کرتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے ایک رسالہ میں حَرَّمَ الرِّبٰوا میں یہ تحریف کی کہ رِبٰوا کو بضم رَا کہا اور اس کے معنی اُچکنے کے لئے۔ میں کہتا ہوں کہ اِس سے سیدھی بات تو یہ تھی کہ زنا ہی کہہ دیتے کیونکہ زنا عربی کا لفظ تو ہے رُبا تو عربی کا لغت بھی نہیں بلکہ ربودن سے فارسی کا لغت ہے۔ رہا رسمِ خط کا اِشکال سو رُبا بضمِ الرّا بھی واؤ سے نہیں ہے۔ اِس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے مشہور ہے کہ ایک شخص اپنی ماں کو کچھ نہ دیتا تھا اُس نے جاکر ایک عالم سے شکایت کی اُنھوں نے لڑکے کو بُلا کر اِس کا سبب پوچھا کہنے لگا اگر قرآن شریف میں ماں کا حق کہیں نکل آئے تو میں ضرور دُوں گا چونکہ یہ بالکل جاہل تھا اس لئے اُن کو فکر ہوئی کہ کوئی ایسی سبیل ہو کہ اسکی سمجھ میں بھی آجائے آخر کہتے لگے کہ تو نے کچھ قرآن

بھی پڑھا ہے اُس نے کہا کہ دو چار سورتیں پڑھی ہیں کہنے لگے کہ تَبَّتْ یَدَ آاَبِیْ لَهَبٍ پڑھی ہے اس نے کہا ہاں جب اُس نے تَبَّتْ پڑھی اور اُس میں مَا کَسَبَ پڑھا تو کہنے لگے کہ دیکھ اس میں تو لکھا ہے کہ ماں کا سب یعنی سب کچھ ماں ہی کا ہے تیرا کچھ بھی نہیں لڑکے نے کہا کہ مولوی صاحب اب دیا کردوں گا تو انھوں نے تو ایک ثابت شدہ مسئلے کو اُس جاہل کے ذہن نشین کرنے کے لئے محض ظرافت کے طور پر ایک اردو کے جملے کو قرآن کا جزو کہا تھا لیکن اس ظالم نے قرآن میں صریح تحریف کی کہ ربوا کو حلال کرنے کے لئے اُس کی حُرمت کو قرآن سے اُڑانا چاہا غرض ہر شخص قرآن اور احکام شریعت کے متعلق ایک نئی رائے اور تجویز رکھتا ہے۔ گویا قرآن ایک بچوں کا کھیل ہے کہ ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت۔ آج کل کی اصلاح ایسی ہے جیسے کہ ایک بُڑھیا نے بادشاہی باز کی کہ وہ اتفاقاً اس کے ہاتھ آگیا تھا اصلاح کی تھی یعنی جب اُس نے دیکھا کہ اِس کے ناخن بھی بہت بڑھ رہے ہیں اور چونچ بھی ٹیڑھی ہے تو بہت کڑھی اور کہنے لگی کہ تو کس بے رحم کے ہاتھ گرفتار ہوگیا تھا جس نے نہ تیرے ناخنوں کی خبر لی نہ تیری چونچ کو درست کیا۔ تو کس طرح کھاتا ہوگا۔ کس طرح چلتا ہوگا۔ اور یہ کہہ کر اُس کے ناخن اور چونچ سب قینچی سے کاٹ دیئے تو جیسے اُس نے باز شاہی کی اصلاح کی تھی ایسے ہی یہ لوگ بھی قرآن میں اصلاح کرتے ہیں۔ آخر جب وہ مجلس ختم ہوئی اور وہ مضمون شائع ہوا تو ان لوگوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے کہ افسوس اب تک بھی علماء کو ہوش نہیں آیا کہ اِتنی ضرورت ہے اور یہ لوگ ابھی تک اُسکو ناجائز ہی کہتے ہیں۔ میں نے ایک بیان میں کہا کہ ظالمو! اگر تم کو اپنی عاقبت ہی خراب کرنا ہے تو حلال کہکر ابد الآباد کے لئے تو برباد نہ ہو۔ تمہاری مخترعہ ضرورتیں تو اس طرح بھی پوری ہوسکتی ہیں کہ حرام سمجھو اور مبتلا رہو اور خدا تعالیٰ سے معافی چاہتے رہو اپنی حرکت پر نادم رہو اور میں نے کہا کہ یاد رکھو اگر دنیا بھر کے علماء متفق ہوکر ربوا کو حلال کہدیں تو جو لوگ اس کو حرام سمجھتے ہیں وہ اُس وقت بھی حلال نہ سمجھیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ علماء

کو گالیاں دینگے کہ یہ پڑھ لکھ کر اور سمجھ بوجھ کر برباد ہوئے۔ اس واسطے کہ اس دین کا حافظ خدا تعالےٰ ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی خاص جماعت کی تحریف کرنے سے یہ دین محرف ہوسکے۔ اس دین میں انقلاب کا اگر کسی درجے میں اندیشہ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر تھا اور جبکہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر بھی دین میں انقلاب نہ ہوا تو اب قیامت تک کے لئے اطمینان ہے اب اس میں بگڑنے کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا تو اگر کوئی مولوی اس میں تحریف کرنا چاہے تو نتیجہ وہی ہوگا جو اس وقت کے محرّفین کا ہو رہا ہے یعنی مردود عنداللہ و عندالناس۔ ازیں سُو راندہ ازاں سُو ماندہ (نہ خدا ہی ملا نہ رلُوا ہی ملا۔ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ جامع وعظ) غرض یہ حالت ہو رہی ہے کہ طرح طرح کے تصرفات اور تکلفات قرآن میں کئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے کو محقق فی الدین سمجھتا ہے حالانکہ ترقی یافتہ قوم نے جن کی ہمارے بھائی تقلید کرتے ہیں اِس کی بھی تحقیق کرلی ہے کہ ہر شخص ہر چیز کا ماہر نہیں ہوسکتا ایک فن کا ماہر دوسرے فن میں دوسرے شخص کا مقلد ہے دیکھئے اگر ایک بڑا سائنس داں کسی مکان میں قیام کرے اور کوئی انجینئر آکر کہے کہ دو گھنٹے کے اندر یہ مکان گر جائے گا تو وہ فلسفی اس کے کہنے سے فوراً مکان خالی کردیگا اور باوجود بہت بڑا فلسفی ہونے کے اُس انجینئر کی تقلید کرے گا اور اِس تقلید میں اُس کو کچھ بھی عار نہ ہوگی اور جب یہ مسئلہ مسلّم ہے تو اِس کے موافق تو ضرور عمل کرنا چاہیئے اِس واسطے کہ یہ آپ ہی کے پیشوا لوگوں کی تحقیق ہے غرض یا تو محقق بنئے اور اس کا سامان کریئے جہل کو دور کیجئے اور علم سیکھئے کیونکہ یہ ساری خرابی کم علمی کے سبب سے ہے اور یا تقلید کیجئے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں وہ جو کچھ کہدیں اُس کو صحیح سمجھئے اور عمل کیجئے۔ پس دین میں تسہیل کی غرض سے اپنی رائے سے کام نہ لیجئے دین مکمل ہے اور سہل بھی ہے چنانچہ اس مقام پر اصلاح کی ترتیب کس قدر سہل ہماری فطرت کے موافق رکھی ہے کہ اوّل علم کی طرف اشارہ کیا پھر عمل کی طرف۔ سو اس آیت میں ان ہی دو چیزوں یعنی علم و عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ اور

چونکہ علم کے دو شعبے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا اس لئے گویا اس آیت کی مدلول تین چیزیں ہوئیں الفاظ اور معانی اور عمل اور ہم کو اِن تینوں کا حاصل کرنا ضروری ہوا۔ اب دیکھئے کہ ہم نے اِن تینوں جزوں کے ساتھ کیا معاملہ کر رکھا ہے سو عمل تو قریب قریب بالکل ہی مفقود ہے اور علم کا جو طریقہ ہے وہ مفقود ہے اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ علم بھی مفقود ہے لیکن خیر تھوڑا بہت مشغلہ ہے گو دنیا ہی کے لئے ہو اور جن لوگوں کو تحقیقِ حقیقت ہے وہ کچھ تھوڑا بہت عمل پر بھی متوجہ ہیں مگر ایک جُزو ایسا ہے کہ اُس کو بالاتفاق سب نے چھوڑ رکھا ہے یعنی خدمتِ الفاظ قرآن جو کہ علم کے دو شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے چنانچہ آجکل کے عقلاء کا تو اس پر اجماع ہوگیا ہے کہ قرآن کے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چنانچہ اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھاتے اور کہتے ہیں کہ بچے کے اتنے دن کیوں ضائع کئے جائیں میں کہتا ہوں کہ اگر تلاوت ایک بیکار اور فضول چیز ہے تو قرآن میں جو جا بجا تلاوت کی فضیلت آئی ہے اور حکم فرمایا گیا ہے اور تلاوت کرنے والوں کی مدح فرمائی گئی ہے کیا یہ سب ترغیب اور حکم محض بیکار چیز پر ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ دوسری جگہ فرماتے ہیں يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ کیا قرآن کے یہ اجزاء عمل کرنے کے لئے نہیں محض دیکھنے کیلئے ہیں اور کیا یہ حالت پیدا کر کے ہم لوگ صاحب کتاب کہلانے کے مستحق ہیں۔ صاحبو! اگر کسی شخص کے پاس بہت سا مال ہو اور وہ اُس کو کسی ایسی جگہ رکھ دے کہ اُس سے منتفع نہ ہو سکے تو کیا اُس شخص کو مالدار کہیں گے پس ایسی حالت میں جیسا وہ صاحب مال ہے ایسے ہی آپ صاحب کتاب ہیں افسوس آپ نے ایک عظیم الشان دولت کو چھوڑ دیا ہے اور پھر آپ کو ذرا غم نہیں ہے حالانکہ اگر دینی پہلو سے دیکھا جاوے تب تو قرآن ہی میں یہ حکم موجود ہے اور اگر کسی کو قرآن کافی نہ ہو تو میں عقلی قواعد کی رُو سے پوچھتا ہوں کہ آیا علومِ دینیہ کا باقی رہنا ضروری ہے یا نہیں یقیناً اِس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ ضروری ہے اور جب ضروری

ہے تو چونکہ قرآن اِن کا منبع ہے اُس کا محفوظ رہنا بھی ضروری ہوگا ورنہ وہ کونسی صورت ہے کہ علم بدون الفاظ کے باقی رہ سکے۔ اگر کہو کہ عربی ہی کی کیا ضرورت ہے تو میں کہوں گا کہ ترجمہ کبھی کامل نہیں ہو سکتا کیونکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ذو وجوہ ہوتے ہیں اور ان کی مختلف تفسیریں ہوتی ہیں اب اگر الفاظ کو نہ لیا جائے تو اس کی وہ حالت ہوگی جو کہ آج کل توریت و انجیل کی حالت ہو رہی ہے کہ طالبِ حق کو اصل احکام معلوم ہی نہیں ہوتے۔ معلوم ہوا کہ اصل الفاظ کا باقی رہنا نہایت ضروری ہے اور اگر کہو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تو سمجھو کہ اگر پڑھنا چھوٹ جائے تو قرآن کا لکھنا اور چھپنا اور فروخت ہونا سب چھوٹ جائے اور قرآن کہیں بھی دستیاب نہ ہو یہ بات اس وقت آپ کو ہلکی معلوم ہوتی ہے مگر ایک صدی کے بعد آپ دیکھئے کہ کیا حالت ہو اور اگر دستیاب بھی ہو تو صحیح لکھا جانا اور صحت معلوم ہونا یہ سب اِسی تلاوت اور حفظ کی بدولت ہے اس وقت علومِ دینیہ کی جو گت ہو رہی ہے ظاہر ہے تو اگر تلاوت بھی بالکل ترک کر دی جائے اور لوگوں کے ذہن سے قرآن شریف اتر جائے اور پھر کسی لفظ یا آیت میں اختلاف ہو تو کون شخص فیصلہ کرے بلکہ میں کہتا ہوں کہ علومِ دینیہ اگر باقی بھی رہیں تب بھی پڑھنا چھوڑ دینے کی صورت میں قرآن مجید کی صحت نہیں ہو سکتی مجھے اپنے بچپن کا قصہ یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نماز میں قرآن شریف سُنا رہا تھا اور والد ماجد مرحوم سُن رہے تھے میں اس میں زمانے صرف و نحو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بڑھا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ آیت پڑھی فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ۔ تو یُعَذِّبُ کی ذال کو مفتوح پڑھا اور اپنے ذہن میں عَذَابَهُ کی ضمیر کا مرجع نائب فاعل انسان کو جو اس کے قبل آیت میں مذکور ہے قرار دیا اور کسر ذال کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہ آئی والد صاحب مرحوم نے ٹوکا میں نے پھر وہی پڑھا اُنھوں نے مکرر ٹوکا میں نے پھر وہی پڑھا اُنھوں نے تیسری بار پھر ٹوکا تو میں نے یکسرِ ذال

پڑھا لیکن دل میں یہ خیال رہا کہ والد صاحب نے صحیح نہیں بتلایا۔جب سلام پھیرا تو انھوں نے پوچھا کہ تم اِتنا اصرار کیوں کرتے تھے میں نے کہا کہ کسرہ کے معنی نہیں بنتے اس لئے غلط ہے قرآن دیکھا گیا تو کسرہ نکلا۔ مارے وہم کے اور قرآن دیکھا سب میں وہی کسرہ۔آخر اپنی غلطی ظاہر ہوئی یہ مثال کے طور پر اپنا ایک واقعہ بیان کردیا ہے اسی طرح اور بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن حفظ کی بدولت وہ سب صحیح ہو جاتی ہیں اور اگر حافظ باقی نہ رہیں تو باوجود علماء کے ہونے کے بھی تحریف ممکن ہے تو یہ سب حافظوں کی بدولت ہے کہ قرآن صحیح موجود ہیں اب فرمائیے کہ حفظ کی کتنی ضرورت ثابت ہوئی بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ اگر حفظ کرنے کا سلسلہ بند ہوجائے اور پڑھنا پڑھانا چھوٹ جائے اور قرآن کے صحیح نسخے موجود ہوں تب بھی صحیح نہیں پڑھے جاسکتے اِس کی تائید کے لئے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں میرے بھائی ریل میں سوار تھے اور ایک تفسیر اُن کے ہاتھ میں تھی جو کہ ٹائپ کے چھاپے کی چھپی ہوئی تھی ایک صاحب بہادر بھی اُسی درجے میں سوار تھے بھائی سے کہنے لگے کہ میں اس کتاب کو دیکھ سکتا ہوں اُنھوں نے کہا کہ دیکھئے آپ نے تفسیر کو اُٹھاکر دیکھا اوّل ہی آلرا نِکلا صاحب بہادر نے بہت دیر تک اُس کو سوچا جب سمجھ میں نہ آیا تو بھائی سے پوچھتے ہیں یہ کیا ہے ؟ آلو ؟ بھائی نے تفسیر ہاتھ سے لے لی اور کہا کہ یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ اپنی اِس تجویز پر اُس روزِ بد کو سوچکر دیکھئے کہ جبکہ آپ بھی اس انگریز کی طرح آلرا کو آلو پڑھنے لگیں گے۔ واللہ جب تک کسی پڑھے ہوئے سے نہ پڑھا جائے ممکن ہی نہیں کہ السرا یا اُس کے مثل دوسرے الفاظ کو صحیح پڑھ دیا جاوے آخر یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ تلفّظ میں الف لآم را علیحدہ علیحدہ پڑھے جائینگے اور اگر کوئی کہے کہ اِس کے صحیح پڑھنے کی ضرورت ہی کیا تو اُس کا جواب یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جو اِس حد تک پہنچ چکے ہوں اِس وقت ہماری گفتگو نہیں ہے ایک اور دلیل حفظِ قرآن کے ضروری ہونیکی بیان کرتا ہوں اور دلیل اس وقت

کے مذاق کے اعتبار سے بہت عجیب دلیل ہے اُس کے لئے اوّل دو مقدمے سنئے۔ پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جتنی ارضی و سماوی کتابیں ہیں اُن میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ یاد ہوکر یاد رہ سکے اور اگر کسی نے یاد بھی کرلیا تو بہت بڑے حافظے کی ضرورت ہے اور قرآن شریف بہت جلد یاد ہوجاتا ہے اور بہت تھوڑی عمر میں لڑکے اُس کو حفظ کر لیتے ہیں چنانچہ قصبۂ پانی پت میں تو اگر دس برس کا بچّہ حفظ نہ کرے تو کہتے ہیں کہ کیا بڑھا ہوکر حفظ کرے گا اور اکثر لڑکیاں بھی وہاں کی حافظ ہوتی ہیں اور سبع کی جاننے والی لڑکیاں متعدد ہیں اور قرآن شریف کے حفظ کے ایسے عجیب و غریب قصّے ہیں کہ لوگ سُنکر تعجب کرتے ہیں چنانچہ میرے ایک دوست بردوان کے رہنے والے ہیں انھوں نے تین ماہ سے بھی کم میں قرآن شریف حفظ کرلیا تھا ایک اور میرے دوست نے اپنے پیر یعنی میرے اُستاد کو خواب میں دیکھا کہ اُنھوں نے اُن کو اپنے سینے سے لگایا اور اُن کے سینے میں ایک نور داخل ہوا اُنھوں نے ایک مُعبّر سے بیان کیا اُنھوں نے تعبیر یہ دی کہ تم کو قرآن شریف حفظ ہوجائے گا چنانچہ انھوں نے یاد کرنا شروع کیا سو چھ ماہ میں اچھا خاصہ حفظ ہوگیا ایک اور قصہ یاد آیا ایک واعظ مظفرنگر میں وعظ کہہ رہے تھے ایک آیت میں قصداً رُکے اور حاضرین سے خطاب کیا کہ اِس مجلس میں جتنے حافِظ ہوں کھڑے ہوجائیں تاکہ میں اُن سے یہ آیت پُوچھ سکوں اِس کو سُنکر ایک جماعت کثیر کھڑی ہوگئی اُنھوں نے کہا کہ صاحبو! مجھ کو آیت یاد ہے میں نے صِرف یہ دکھلانا چاہا کہ مُسلمانوں کے اِس اتفاقی اور مختصر مجمع میں جہاں خاص حُفّاظ ہی کو جمع نہیں کیا گیا ایسی تعداد سے مذہبی کتاب کے برزبان یاد رکھنے ولے موجود ہیں کیا دوسری کوئی قوم قصداً جمع کرکے بھی اِس قدر تعداد اپنی مذہبی کتاب کے حافظوں کی دکھلاسکتی ہے۔ غرض قرآن مجید بہت سہولت سے یاد ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اِس زمانے میں عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں

کہ نیچر ہر زمانے میں اُس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے میں اس کو شرعی اصطلاح میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہر زمانے میں اُس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں مقدموں کے ممہّد ہونے کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ مادہ طبیعت میں ودیعت کیا ہے کہ قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ فطرۃً اس کے حفظ کی ضرورت ہے۔ تو صاحبو! اپنے نیچر کی مخالفت نہ کرو۔ سُنا ہے کہ نول کشور کے ہاں ایک پتھر قرآن لکھا ہوا نالی پر رکھا ہوا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے اُسے دیکھا تو اُس سے کہا۔ منشی صاحب! یہ تو ہمارے اور آپ کے دونوں کے نزدیک معظّم ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن شریف ہونے سے اور آپ کے نزدیک پتّھر ہونے سے کہ مادہ بُت کا ہے۔ اِسی طرح میں کہتا ہوں کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں اُن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے سے اور جو لوگ نیچر کے متبع ہیں اُن پر نیچر کے کہنے سے اِس کی حفاظت ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حافظ بننا ضروری ہے۔ ہاں آپ ڈریے نہیں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ ہر شخص حافظ ہو البتہ ہر شخص پر حفظ کو ضروری سمجھنا ضروری ہے مگر ضروری سمجھنے کی یہ علامت نہیں کہ صرف مُنہ سے کہنے لگو کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس کا ضروری ہونا دل میں رچ جانا چاہیئے اور اِس کا پتہ آثار سے خود بخود چل جاتا ہے دیکھیئے اگر شراب نہ پی ہو تو کبھی وجد اور بے ہوشی نہیں ہوگی اگرچہ زبان سے کتنا بھی کہا جائے کہ شراب پی ہے اور جب پی جائے گی تو فوراً ہی اُس کا اثر بھی ظاہر ہوگا اگرچہ اُس کو کتنا ہی روکا جائے تو محض یہ کہدینا کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کافی نہیں ہے بلکہ دل سے ضروری سمجھنا چاہیئے۔ جس پر آثار بھی مُرتّب ہوں اور عمل بھی ہو۔ اور اگر کہیئے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ سارے کام ہم ہی کریں ضروری بھی ہم ہی سمجھیں اور اُس پر عمل بھی ہم ہی کریں۔ دُنیا میں اور لوگ بھی تو ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے پس ضروری سمجھنا بھی جب کبھی متحقق

ہوگا اپنے لوازم کے ساتھ متحقق ہوگا اور وہ عمل ہے اِس اعتراض پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب سلمہٗ کے ہاں ایک طالب علم تھے نہایت ہی کم سمجھ ایک مرتبہ سبق میں اُنھوں نے مولانا سے ایک سوال کیا جو متضمن ایک دعوے کو تھا مولانا نے فرمایا کہ اِس کی دلیل بیان کرو تو آپ فرماتے ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ سارے کام ہم ہی کریں دعوے بھی ہم ہی کریں دلیل بھی ہم ہی بیان کریں پس دعوے ہم نے کر دیا ہے دلیل آپ بیان کر دیں۔ اب غور کیجئے کہ اِس حکایت پر سب کو ہنسی آتی ہے لیکن اپنے اِس خیال پر کہ جب ہم حفظ قرآن شریف کو ضروری سمجھتے ہیں تو ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہنسی نہیں آتی۔ حالانکہ دونوں واقعے ایک ہی مرتبے میں ہیں۔ صاحبو! غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر سب کے سب اِسی پر متفق ہو جائیں کہ ہم کو محض ضروری سمجھ لینا کافی ہے اور اِس سمجھنے پر عمل ایک بھی نہ کرے تو آخر قرآن شریف کو حفظ کون کرے گا؟ کیا یہود اور نصاریٰ کریں گے؟ اور اِس وقت جو رنگ پلٹ رہا ہے اور زمانے کی رفتار میں جو تغیّر ہو گیا ہے اُس پر نظر کر کے یہ بھی بعید نہیں معلوم ہوتا اگرچہ ابھی تک اِس تغیّر کی ابتدائی حالت ہے کہ سنبھالنے سے سنبھل سکتی ہے لیکن اگر اس پر توجہ نہ کی گئی تو پچاس برس کے بعد بالکل ہی نئی حالت ہوگی۔ اس واسطے کہ اس وقت مسلمانوں نے اکثر قرآن شریف کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے بہ غرض اعتراض کرنے کے پڑھنا شروع کیا ہے تو اگر یہی رفتار رہی تو چند روز میں عجب نہیں کہ مسلمانوں کو اسلام سے بُعد اور اِن کفار کو اسلام سے قرب ہوتا جاوے۔ اور اسلام سے بُعد کا پہلا زینہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر اور دین کو چھوڑ صرف دُنیا کے حاصل کرنے پر متوجہ ہو رہے ہیں اور تحصیلِ دین کو مخل دنیا سمجھ رہے ہیں اور واقعی حقیقت یہ ہے کہ دُنیائے حلال دین کے ساتھ سایہ کی طرح ہے اگر کوئی سائے کو پکڑنا چاہے تو اُس کی صورت یہی ہے کہ اصل چیز کو حاصل کرے تو دُنیا بھی جبھی حاصل ہو سکتی ہے کہ جب دین کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا ہو

آج افسوس ہے کہ فلسفہ وحقیقت شناسی کی اتنی بڑی ترقی ہے لیکن لوگ دنیا کی حقیقت میں ذرا غور نہیں کرتے محض مال اور جاہ کی طلب کو اصلِ مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ امر دیکھنے کے قابل ہے کہ مال کیوں مقصود ہے اور جاہ کیوں مطلوب ہے۔ سو مال تو جلب منفعت کے لئے مطلوب ہے اور جاہ دفعِ مضرت کے لئے یعنی ہم کو بڑائی کی اتنی ضرورت ہے کہ ظالموں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں دیکھئے سقے چمار وغیرہ بیگار میں پکڑے جاتے ہیں کیوں کہ وہ ذی جاہ نہیں اور جاہ ایک قدرتی قلعہ ہے۔ تو یہ دونوں چیزیں جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کیلئے ہیں۔ پس مال اس قدر کافی ہے کہ جس سے ہم منافع حاصل کرسکیں۔ اب لوگوں نے نفسِ مال کو معبودِ مطلق بنا رکھا ہے تو یہ کتنی بڑی فلسفی غلطی ہے۔ صاحبو! اصل مقصود محض دین ہے جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو دوسرے مقاصد خود بخود حاصل ہوجاتے ہیں چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ خدا کے کام میں لگے ہیں اُن میں کوئی بھی پریشانی میں مبتلا نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اہل اللہ اس قدر آسائش میں ہیں کہ اہلِ دنیا کو بھی اُتنی آسائش نصیب نہیں ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اوّل ایک بڑے سے بڑے دنیا دار کے پاس ایک مہینہ رہئیے اس کے بعد اہل اللہ میں سے کسی ایک کے پاس ایک مہینہ بھر رہ کر دیکھئے پھر دونوں کی حالت میں موازنہ کیجئے آپ کو صاف معلوم ہوگا کہ وہ دنیا دار طرح طرح کے افکار میں مبتلا ہے اور یہ دیندار پریشانی سے محفوظ و مامون ہے۔ یہ تو مال کی غایت تھی۔ رہی جاہ اُس میں بھی اہل اللہ دنیا سے زیادہ بڑے ہوئے ہیں۔ عزت جس چیز کا نام ہے وہ انہی حضرات کو نصیب ہے کیونکہ عزت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو عزت زبان سے اور ایک دل سے۔ اہلِ دنیا کی جو کچھ عزت ہوتی ہے وہ محض زبان اور ہاتھ پیر سے ہوتی ہے یعنی لوگ ظاہر میں اُن کی عزت کرتے ہیں دل میں کسی قسم کی وقعت اُن کی نہیں ہوتی اور اہلُ اللہ کی عزت دل سے ہوتی ہے دوسرے اہل دنیا اور اہل اللہ میں اس سے بھی زیادہ

ایک فرق ہے اور وہ ایک تمدنی مسئلہ ہے یعنی معزز وہ شخص کہلائے گا کہ جو اپنی قوم میں معزز ہو ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مجموع مرکب میں قوم وہ جماعت ہے جس کے احاد زیادہ ہوں جیسے کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گیہوں کا ڈھیر وہ کہلائے گا جس میں گیہوں زیادہ ہوں اس پر قیاس کرکے اب میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں میں زیادہ افراد کن لوگوں کے ہیں ؟ غُرباء کے یا اُمراء کے ؟ ظاہر ہے کہ غُرباء مسلمانوں میں زیادہ ہیں تو مسلمانوں کی قوم غُرباء کی جماعت کا نام ہوگا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غُرباء میں کس کی عزت زیادہ ہے۔ اہل اللہ کی یا اہل دنیا کی ہر شخص جانتا ہے کہ اہل اللہ کی عزت غرباء میں زیادہ ہے تو قوم کے نزدیک معزز اہل اللہ ہوئے تو اس تمدنی مسئلے سے ثابت ہوگیا کہ مال اور جاہ سے جو امر مقصود ہے وہ اہل اللہ ہی کو حاصل ہے بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ دنیا کو تمام مقصود نہیں کہتے لیکن دین اور دنیا دونوں کا جامع بننا چاہتے ہیں اور اس کو بہت بڑی خوبی اور کمال سمجھا جاتا ہے مگر یہ جمع ایسا ہوتا ہے جیسے کہ ایک شخص سارے زنانے کپڑے پہن کر اُن کے ساتھ ایک ٹوپی بھی پہن لے ظاہر ہے کہ جو شخص اسکو دیکھے گا ایک مسخری عورت کہے گا۔ جو لوگ جامع بن رہے ہیں اُن کو دیکھ لیجئے کہ غالب اُن کے اوپر دنیا ہی ہے۔ مسلمان کے جامع ہونے کے معنی تو یہ ہونے چاہئیں کہ اُس پر دین غالب ہو اور حسبِ ضرورت دنیا بھی لیتا ہو۔ غرض مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن میں سب کے سب دیندار ہوں اور چونکہ معاش کی بھی ضرورت ہے اس لئے کچھ افراد اس میں بھی لگیں اور کچھ افراد ایسے بھی ہونے چاہئیں کہ وہ محض خادمِ قوم ہوں کیونکہ اگر سب کے سب تحصیلِ معاش ہی میں پڑ جائیں تو دین کا سلسلہ آگے کو نہیں چل سکتا۔ مثلاً سررشتۂ تعلیم ہی کو لیا جائے کہ اگر اُس میں کوئی نہ جائے تو ساری نوکریاں بند ہو جائیں گی اسی طرح دین کے کام میں بھی اگر کوئی نہ لگے تو یہ کام بند ہو جائے گا لہذا ضروری ہے کہ ایک جماعت محض خادمانِ دین کی ہو کہ یہ لوگ اِس کے سوا اور کوئی کام نہ کریں

اور میں اس کی ایک نظیر رکھتا ہوں کہ قانونی حکم ہے کہ جو شخص ملازم سرکار ہو وہ دوسرا کام نہیں کرسکتا چنانچہ اگر کسی نے کیا تو اُس کو یا ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور یا اُس دوسرے کام کے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ علیٰ ہذا سید صاحب کو دیکھئے کہ اُن کو دُنیا کی دُھن تھی تو اُس میں کیا حالت تھی کہ اپنی زندگی اور آسائش سب اُس میں صرف کردی۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ لیکن یہ حالت ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ لکھتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ پنسل کاغذ پاس لیکر سوتا ہوں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر جو کچھ یاد آتا ہے اُس کو لکھتا ہوں تو اگر ایسے شخص کو کوئی دوسرا کام دے دیا جاوے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بھی خراب ہوگا اور وہ بھی۔ ایک شاعر کی حکایت مشہور ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مصرعہ سُوجھا فوراً نماز توڑ دی اور اُس مصرعے کو لکھا۔ اگرچہ اُس کی یہ حرکت پسندیدہ نہ تھی لیکن اِس سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ جب کِسی کام کی دھن ہوتی ہے تو کیا حالت ہوجاتی ہے تو اِس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ایک جماعت کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین کے کام کے سوا اور کوئی کام نہ کرے۔ اور اس جماعت پر یہ الزام بھی بالکل خلافِ انصاف ہے کہ یہ قوم کے محتاج ہیں۔ البتہ اگر وہ تم سے مانگیں تو اُن کو جو چاہو سو کہو۔ سو بحمد اللہ ان کا تو یہ مذاق ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو کہنے لگے کہ ہم خدا کے مہمان ہیں اور مہمانی تین دن کی ہوا کرتی ہے اور اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۝

اللہ کے یہاں کا ایک دن تمہارے دنوں کے حساب سے ایک ہزار سال کا دن ہوگا حضرات واللہ اِس وقت بھی ایسے خدا کے بندے موجود ہیں کہ لوگ اُن کو دیتے ہیں اور وہ نظر بھی نہیں کرتے۔ اور اُن کی وہ حالت ہے کہ ؎

دلا رامے کہ داری دل دروبند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر تم محبوب رکھتے ہو تو دل کا تعلق اسی سے رکھو اور اپنی نگاہ کو سارے عالم سے بند ہی کرلو

وہ ایک ہی ذات میں ایسے مُنہمک ہیں کہ کسی دوسرے کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا

شاہِ نیمروز نے ایک بزرگ کو لکھا (دیکھئے اِس حکایت سے معلوم ہوگا کہ دینے والے درخواست کرتے ہیں اور لینے والے صاف انکار کردیتے ہیں) کہ میں چاہتا ہوں اپنا آدھا ملکِ نیمروز آپ کے حوالے کردوں آپ نے جواب میں تحریر فرمایا ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد — در دل اگر بود ہوسِ مُلکِ سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب — من مُلکِ نیمروز بیک جَو نمے خرم

اگر میرے دل میں مملکت سنجر کی ہوس ہو تو میرا مقدر چترِ سنجری کی طرح سیاہ ہوجاوے کیونکہ مجھے دولت نیم شبی کی حقیقت معلوم ہوچکی ہے اس لئے میں زوال پذیر دولت نیم روز کو ایک جو کے بدلے میں بھی نہیں لوں گا۔

غور کیجئے کہ اُدھر سے اصرار ہے اور اِدھر سے سوکھا جواب۔ کہ ہم کو کوئی ضرورت نہیں اور اِس میں تصنع نہیں تھا ورنہ اثر کیوں ہوتا۔ تو جب وہ آپ سے مانگتے نہیں تو آپ کو کیا فکر ہے اور جب یہ بات ہے تو آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں سے کھائیں گے اور اگر کہئے کہ یہ تو شافی جواب نہ ہوا کیونکہ اِس میں یہ تو پتہ ہی نہ چلا کہ آخر کہاں سے کھائینگے تو صاحبو یہ جواب۔ تو میں نے معترضین کی رعایت کرکے دیدیا تھا۔ لیجئے اب میں اصلی جواب دیتا ہوں لیکن اس میں معترضین کی رسوائی ہوگی۔ اُس جواب کے لئے اوّل میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے نکاح کیا اور جب بیوی اُس کے گھر آئی تو وہ بیوی سے پوچھنے لگا کہ تم نے نکاح تو کرلیا مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے تو وہ بیوی اُس کو کیا جواب دے گی ظاہر ہے کہ یہ جواب دے گی کہ میاں میں تمہاری جیب سے لے کر کھاؤں گی اور کہے گی کہ تم کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی اس سوال سے خود اپنی بے عزتی ظاہر کررہے ہو۔ اور یہ جواب نہایت سچا اور حق جواب ہوگا۔ جب یہ مثال سمجھ میں آگئی تو اب میں اُس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ یہ لوگ انہی معترضین کی جیبوں سے وصول کرکے کھائیں گے اور اِس سوال سے یہ معترضین اپنی قلعی کھول رہے ہیں کہ ہم میں حمیت نہیں ہے کہ خادمانِ دین کی خدمت کو ضروری نہیں سمجھا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں محبوس

ہو اُس کا نان نفقہ اُس پر واجب ہوتا ہے چنانچہ بیوی کا نان نفقہ اِسی لئے شوہر پر واجب ہے چنانچہ اگر وہ از خود اپنے گھر چلی جائے تو شوہر پر اُس کا نفقہ واجب نہیں رہتا حالانکہ بیوی اس وقت بھی رہتی ہے۔ اسی طرح قاضی کا نفقہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کی ضرورت میں محبوس ہے۔ اب دیکھئے کہ بیت المال کس چیز کا نام ہے۔ سو بیت المال کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مال کا مجموعہ اور بلفظ دیگر مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے مگر چندہ ذلیل لفظ ہے اور بیت المال اور خزانہ معظّم لفظ ہے لیکن حقیقت ایک ہی ہے چنانچہ بادشاہ کو جو خزانۂ شاہی سے تنخواہ ملتی ہے وہ خزانہ کیا چیز ہے کیونکہ خزانہ بھی مسلمانوں کے پیسہ پیسہ دو دو پیسہ کے مجموعہ کا نام ہے تو اگر یہ ذلت ہے تو بادشاہ نے بھی یہی کیوں لیا نیز تمام حکّام کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ اسی مد میں سے ملتی ہے کیونکہ وہ اس قدر محبوس اور مجبور ہوتے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا کام کریں تو مُجرم سمجھے جاتے ہیں اور لیجئے جب کسی کو گواہی میں طلب کیا جاتا ہے تو اُس کی خوراکی دیجاتی ہے اور اُس کی مقدار متفاوت ہوتی ہے یعنی بڑے آدمی کے لئے زیادہ اور ادنیٰ درجے کے لئے کم۔ اس میں بھی وہی راز ہے کہ اس مدت تک یہ شخص من لہ الشہادۃ کے کام میں محبوس رہا۔ یہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ کفّار تک نے بھی اس کو سمجھا۔ تو خادمانِ قوم جب قوم کے کام میں لگے ہیں تو وہ بھی اپنا خرچ قوم سے لیں گے اور اگر یہاں نہ ملے گا تو خدا تعالےٰ کے ہاں نالش کرکے لیں گے۔ غرض عقلاً نقلاً دونوں طرح یہ مسئلہ ثابت ہے مگر چونکہ ہماری قوم کو اُس وقت تک تسلّی نہیں ہوتی جب تک کہ دوسری اقوام کو بھی کوئی کام کرتے بھی نہ دیکھ لیں اس لئے ایک تیسری دلیل بھی بیان کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آریا اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت سرگرم ہیں انھوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ ایک جماعت اُن میں مذہب ہی کی حمایت کرنے کے لئے رہے اور تمام قوم اُس جماعت کی متکفّل ہو۔ صاحبو! افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسی قوم جس کے پاس مذہبی جماعت نہ تھی اُس نے مذہبی جماعت تیار کرنے کی کوشش کی اور تمہارے پاس

ایک عظیم الشان جماعت موجود ہے اور تم اس کو توڑنے کی فکر میں ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نہ بھی کفالت کرو بلکہ تمام لوگ اِس جماعت کے مخالف ہو جائیں اور سب اس کو دینا اور مدد کرنا بند کردیں۔ تب بھی یہ جماعت قائم ہی رہے گی۔ اور مولوی کھاتے ہی رہیں گے۔ اگر کہئے کہ کیونکر کھاتے رہیں گے اور کہاں سے اِن کو ملے گا تو لیجئے میں بتلاتا ہوں کہ کہاں سے اِن کو ملے گا قرآن شریف میں ارشاد ہے هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝ حاصل ترجمہ اِس کا یہ ہے کہ تم کو اِنفاق فی سبیل اللہ کے لئے بلایا جاتا ہے مگر بعضے بخل کرتے ہیں اور اس بخل سے اپنا ہی نقصان کر رہے ہو ورنہ خدا تعالیٰ غنی ہے اور تم محتاج ہو اگر تم اس سے بے توجہی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کردیں گے اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے (بلکہ وہ انفاق والے ہوں گے) یعنی وہ تم جیسے کم ہمت بددل نہ ہوں گے تو حاصل جواب کا یہ ہوا کہ اگر تم نہ دو گے تو خدا تعالیٰ دوسری قوم کو پیدا کردیں گے جو کہ دین کی خدمت کرے گی۔ اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ قوم کہاں سے پیدا ہوگی تو اِس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزانہ یہ سلسلۂ خلق جاری ہی ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت تمام عالم کے انسانوں کی حالت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہیں وہ اسلام کے احکامات اور اُس کی تعلیمات کو چھوڑ چھوڑ کر اُس سے دور ہو رہے ہیں اور نامُسلم لوگ اسلام کی خوبیوں کی وجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہوتے چلے جارہے ہیں اور جُزئیاتِ شرع کے اسرار و حِکم تک بیان کرنے کا اُن کو خیال ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے مٹی کے ڈھیلے سے استنجا پاک کرنے کے متعلق کہا ہے کہ مٹی بہت سے قروح کا علاج ہے تو پیشاب میں جو مادّہ تیزاب کا ہے اس کی مضرّت رد کرنے کے لئے مٹی کا استعمال مصلحت ہے۔ اسی طرح ایک اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کا ارشاد دیکھا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر کتا برتن کو چاٹ جائے تو اُس کو سات مرتبہ دھوڈالو اِن سات دفعہ میں ایک دفعہ مٹی سے بھی دھو ڈالو۔ اِس ارشاد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ مٹی سے دھونے کو کیوں فرمایا کیا سات مرتبہ پانی سے دھونا کافی نہیں آخر بہت دنوں کی چھان بین اور تلاش کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جُزو نوشادر کا بھی ہے اور نوشادر لُعاب کلب کی سمیّت کا دافع ہے مگر ہر جگہ وہ میسّر نہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی چیز ارشاد فرمائی جو کہ ہر جگہ میسّر ہو اور بآسانی میسّر ہو یعنی مٹی۔ تو مسلمانوں کی وہ حالت ہے اور غیر مسلموں کی یہ حالت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہید ہے اُس دن کی جس دن کہ عجب نہیں کہ ایسے مسلمان خارج از اسلام ہوجائیں اور ایسے غیر مسلم مسلمان ہوجائیں اور اگر مسلمانوں کو اس امر کا خیال ہے کہ یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑے اور حفاظت اسلام کی سعادت تمہارے نام رہے تو سنبھلو اور کام میں مشغول ہو جاؤ۔ مسلمانوں کا ہرا بھرا کھیت سوکھتا ہے لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا اگر ذرا سی توجہ بھی یہ کریں تو کافی ہوگا ورنہ مجھے اِس وقت کی حالت سے سخت اندیشہ ہے۔ غرض یہ معلوم ہو گیا کہ خادمان دین کی خدمت اور ان کی مدد خود غیب سے ہو گی اب جس کا جی چاہے اپنے نفع کے لئے اِس سعادت کو حاصل کرے اُن کو کسی خاص شخص یا خاص جماعت کی کوئی ضرورت نہیں اُن کی وہ حالت ہے کہ گرنستانی بستم میرسد۔ اور میں اہل انجمن اور اہلِ مدارس کو بھی یہی رائے دیتا ہوں کہ وہ مانگنا بالکل چھوڑ دیں انشاءاللہ جس دن یہ ایسا کریں گے خدا تعالےٰ اِن کو بہت کچھ دیں گے ارشاد ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۔ اللہ تعالےٰ جسے چاہتے ہیں بے گمان رزق دیتے ہیں۔ تو ایک خاص جماعت تو ایسی ہونی چاہئے مگر ہر شخص چونکہ خادم دین نہیں ہوسکتا اس لئے اکثر کو یہ کرنا چاہیئے کہ ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی — طفیل خوارہ مشو چوں کلاغِ بے پر و بال

کسی کے لقمہ خوار نہ بنو بلکہ خود شکار کرو اور کھاؤ۔

یعنی یہ لوگ، کمائیں اور دوسروں کی مدد کریں اور اس حالت سے کوئی اہل اللہ کو طفیل خوار نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ سرکاری لوگ ہیں دیکھئے گورنر جنرل کو کثیر التعداد رقم ہر مہینے ملتی ہے حالانکہ بظاہر اُس کو کوئی ایسا بڑا کام نہیں کرنا پڑتا لیکن محض اس لئے کہ اُس کا کام دماغی کام ہے تو حضرات اہل اللہ پر جو گذرتی ہے اور جو دماغ سوزی اُن کو کرنی پڑتی ہے اگر آپ پر وہ گذرے تو چند روز میں جنون ہو جائے اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اہل اللہ پر اپاہج ہونیکا الزام بھی بالکل غلط ہے وہ ہرگز اپاہج نہیں ہوتے ہاں وہ بدن کے اعتبار سے اپاہج ہیں سو یہ فخر ہے اُنکی یہ شان ارشادِ خداوندی میں مذکور ہے اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس قدر جکڑ دیئے گئے ہیں کہ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رہی۔ تو یہ عدمِ استطاعت مایۂ فخر ہے نیز یہ خود کہتے ہیں کہ ؎

ما اگر قلاش دگر دیوانہ ایم مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس ہیں تو دوسرے کے دیوانے ہیں وہ مست ساقی ہیں ہم اس کے پیمانے ہیں۔

یہ اگر طفیلی ہیں تو اُسی کے طفیلی ہیں اور اِن کا جسم گو معطّل ہے لیکن اِن کی روح ایک بہت بڑے کام میں ہے۔ اِن کی روح نے اُس بارِ گراں کو اُٹھایا ہے جس کے اُٹھانے کی پہاڑ بھی تاب نہیں لاسکتا اور زمین آسمان سے بھی نہیں اُٹھ سکا چنانچہ ارشاد ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پہ نازل کرتے کہ تم دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ہم نے قرآن کی امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس بار امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا تو جس کی روح اتنا بڑا بار گراں اٹھائے ہوئے ہے وہ اپاہج کیسے کہا جا سکتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حالِ شیرانے کہ شمشیرِ بلا بر سر خورند

لے وہ شخص کہ جس کے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ان شیروں کا حال کیا جان سکتا ہے کہ
اپنے سروں پر مصیبت کی تلوار کے زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں۔

آپ کو کیا خبر اُن پر کیا گذرتا ہے۔ صاحبو! وہ اُس مشقت میں ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ اگر وہ ایمان نہ لاویں تو آپ تو اپنے آپ کو ہلاک کریں گے۔ غور کیجئے کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا گذرتی ہوگی جو یہ لفظ فرمایا گیا۔ تو اکثر لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تحصیل معاش کی طرف متوجہ ہوں لیکن دیندار ہونا اُن کا بھی ضروری ہے اور احکام شریعت پر چلنا اور دین کی حفاظت کرنا اُن کو بھی لازم ہے محض ضروری سمجھنے پر بس کرنا کافی نہیں۔ دیکھئے اگر ایک جائداد کئی آدمیوں میں مشترک ہو کہ ایک کے اُس میں آٹھ آنہ ہوں دوسرے کے چار آنہ تیسرے کے دو آنہ چوتھے کا ایک آنہ اور کوئی ظالم اُس جائداد پر دستبرد کرے تو کیا ایک آنہ کا شریک خاموش ہو کر بیٹھے گا ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ مشترک چیز کی حفاظت تمام شرکاء کو چاہیئے اِسی طرح قرآن شریف مسلمانوں کی مشترک جائداد ہے اس لئے اس کی حفاظت بھی سب کو کرنی چاہیئے اور اگر کہئے کہ مشترک نہیں تو مہربانی کرکے یہ لکھ کر کے دید یجئے کہ ہم اُس کو شائع کردیں پھر ان لوگوں سے ہم ہرگز اسکی حفاظت کا خطاب نہ کریں گے اور انشاء اللہ کوئی بھی نہ کرے گا اور جب یہ گوارا نہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ بھی ضروری ہے اور دوسروں کو بھی اِس کا حق ہے کہ وہ آپ سے جبراً اس کی حفاظت کرائیں خواہ مال لے کر یا کسی دوسرے طریقے سے۔ اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ چین و آرام تو ہر طرح کا ہم کو رہے اور مصیبت و مشقت دوسروں پر رہے ہم جس طرح چلیں مولوی ہمارے تابع ہو جائیں اور ہمارے جادۂ موصل الی المستقر سے سر مو ہم کو نہ ہٹائیں۔ میں ایسے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ پرانے مولوی تو تمہارے قابو سے نکل چکے ہیں وہ تمہارے تابع نہیں ہوں گے اُن سے یہ امید رکھنی تو فضول ہے البتہ تم اپنی اولاد کو پڑھاؤ وہ تمہارے کہنے میں ہوگی اُن سے اپنی مرضی کے موافق کام لینا۔ مگر ہم نے آج تک کسی ہمدرد قوم کو نہ دیکھا کہ اُس نے قومی ہمدردی میں اپنی

اولاد کو پڑھایا ہو. کیونکہ سمجھتے ہیں کہ علمِ دین پڑھ کر ہماری اولاد کو یہ بڑے بڑے عُہدے کہاں سے مل سکیں گے. اور کسی نے اپنی اولاد میں سے کسی کو علم دین کے لئے تجویز بھی کیا ہے تو اُس کو جو سب میں احمق اور کودن ہو. سبحان اللہ کیا علوم شریعت کی قدر کی ہے. صاحبو! غور کیجئے کہ جب سارے اُلّو ہی پڑھیں گے تو وہ تو اُلّو ہی رہینگے مولوی منفعت علی صاحب سلمٗہ سے ایک شخص نے کہا کہ کیا وجہ علماء میں اب رازیؒ و غزالیؒ پیدا نہیں ہوتے انھوں نے کہا کہ اُس وقت انتخاب کا قاعدہ یہ تھا کہ قوم میں جو سب سے ذہین اور ذکی ہو وہ علومِ دین کے لئے منتخب ہوتا تھا اور اب انتخاب کا یہ قاعدہ ہے کہ جو سب میں احمق اور غبی ہو وہ اُس کے لئے تجویز ہوتا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اب بھی جو ذہین و ذکی پڑھتے ہیں وہ غزالیؒ اور رازیؒ سے کم نہیں ہوتے. میرے ساتھ چلو اور علماء کی حالت دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اِس وقت بھی غزالیؒ اور رازیؒ سب موجود ہیں اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں لیکن عدد میں کم ضرور ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ جو لوگ قابل ہیں وہ تو اِدھر متوجہ نہیں ہوتے ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر بیس آدمی ایسے پڑھیں تو اُن میں پندرہ غزالیؒ اور رازیؒ ضرور نکلیں گے. اب بیچارے غریب غُرباء جولاہے، دُھنئے پڑھتے ہیں اُن کی جیسی سمجھ ہوتی ہے ویسے ہی نکلتے ہیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ غریب غرباء کے بچّوں کو نہ پڑھایا جائے کیونکہ اُمراء نے خود چھوڑا اور ان سے ہم چُھڑا دیں تو پھر علم دین کس کو پڑھائیں نیز غریب غُرباء کیا کریں انگریزی تو پڑھ نہیں سکتے کیونکہ اُسکی تعلیم نہایت گراں ہے اور عربی ہم نہ پڑھائیں تو یہ بیچارے تو بالکل ہی کورے رہے. اور واقعی علم دین ایسی عجیب چیز ہے کہ اُس میں محنت بھی کم اور خرچ بھی کم بہ خلاف انگریزی کے علمِ دین کی ارزانی دیکھئے کہ اگر کوئی شخص میزان سے اخیر تک ایک کتاب بھی نہ خریدے تو ہر کتاب اُس کو میسر آ سکتی ہے. اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے تمام درسیات مدرسوں سے مستعار ہی لے کر پڑھی ہیں. آپ ایک شخص کو بھی نہیں بتلا سکتے کہ جس نے بی اے تک پڑھا ہو اور اُس کو قریب قریب کُل کتابیں نہ خریدنی پڑی ہوں.

اس سے معلوم ہوا کہ دینی تعلیم نہایت ارزاں اور دُنیاوی تعلیم نہایت گراں ہے اِس پر مجھے اپنے بھائی کا ایک مقولہ یاد آیا ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ آپ مجھ سے تو حساب لیتے ہیں اور بڑے بھائی سے نہیں لیتے حالانکہ میرا خرچ بھائی سے بہت زیادہ ہے مجھ کو تو اگر ایک قلم کی ضرورت ہو تو وہ بھی آٹھ آنے کو آئے گا اور وہ تو چھپّر میں سے ایک سیٹھا نکال قلم بنا لیں تو کارروائی ہوسکتی ہے تو دیکھئے کس قدر ارزاں ہے اور یہی دلیل ہے اِس کے معزز ہونیکی کیونکہ فطرت کا قاعدہ ہے کہ جتنی ضرورت کی چیز ہوتی ہے اُسی قدر سستی ہوتی ہے اور ہر جگہ میسر آسکتی ہے اور جس قدر بیکار ہوتی ہے اُسی قدر گراں اور کم یاب ہوتی ہے یہ خدا تعالےٰ کی عجیب قدرت ہے۔ اِسی پر غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو کہ عربی کی کیا قدر ہے اور انگریزی کی کیا قدر ہے یعنی عربی کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیئے کیونکہ وہ زیادہ ضرورت کی چیز ثابت ہوئی اور انگریزی کی طرف کم اور کم متوجہ ہونے کی اجازت بھی دینداروں کے لئے ہے ورنہ جن کے دین بگڑ جانے کا ڈر ہے اُن کو تو انگریزی سے قطعاً روکا جائے وہ انگریزی کو بالکل چھوڑ دیں صرف عربی کی طرف متوجہ ہوں۔ یہاں تک اصلاح یا حفاظتِ دین کی ضرورت کے واسطے عربی کا ضروری ہونا ثابت ہوا۔ اب میں اخیر درجہ کہتا ہوں کہ اگر خدا کے لئے عربی نہ پڑھو تو کم سے کم انگریزی ہی کے لئے عربی ضرور ہی پڑھ لو توضیح اِس کی یہ ہے کہ علومِ عربیہ کے پڑھنے سے استعداد میں ترقی ہوتی ہے اور اِس استعداد سے انگریزی تعلیم میں بہت مدد ملتی ہے۔ میرے سب سے چھوٹے بھائی ٹریننگ مراد آباد میں گئے وہاں اُن کی ذہانت کی یہ حالت تھی کہ تمام لوگ متحیر تھے حتیٰ کہ اُن کے ماسٹر بھی اُن کی ذہانت سے عاجز تھے۔ ایک دفعہ یہ واقعہ ہوا کہ رمضان المبارک کا زمانہ قریب آگیا اور ٹریننگ کے لڑکوں نے چاہا کہ کسی حافظ کو بلا کر ایک قرآن سُنیں پرنسپل سے پوچھا تو جواب ملا کہ یہ امر جدید ہے اجازت نہیں ہوسکتی بھائی نے کہا کہ اگر قدیم ہوتا تو اجازت مل جاتی کہا گیا ہاں۔ بھائی نے کہا کہ آپ کے قاعدہ سے تو لازم آتا ہے کہ کبھی کوئی امر قدیم پایا ہی نہ جائے کیونکہ ہر قدیم

کسی وقت جدید تھا اور جدید ہونا مانع اجازت ہے جب اُس کی اجازت نہ ہوگی وہ قدیم کب بن سکے گا پرنسپل حیران رہ گیا آخر انہوں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارو مدار اجازت کا قدیم ہونے پر نہیں ہے بلکہ اِس پر ہے کہ اس میں کوئی مفسدہ نہ ہو تو اس میں کیا مفسدہ ہے پرنسپل نے اجازت دیدی یہ محض عربی کی استعداد کے بدولت تھا کیونکہ اُس میں احتمال آفرینی کی استعداد ہو جاتی ہے۔ ایسے بہت سے قصے اُن کے ہوئے نیز اُن کے سوا میں نے بہت سے واقعے دیکھے اس لئے میں کہتاہوں کہ اگر خدا کے لئے عربی نہیں پڑھتے تو اپنی انگریزی ہی کے لئے پڑھ لو۔شاید کسی کو یہ شُبہ ہو کہ ایسے علم دین کے پڑھنے سے کیا فائدہ کہ اس کی ترغیب دی جارہی ہے۔ سو سمجھو کہ علمِ دین وہ چیز ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ اپنا اثر ضرور کرتا ہے اور اُس شخص کو اپنا بنا لیتا ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبَى الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ لِلّٰهِ ہم نے علم کوغیر اللہ کے لئے سیکھا تو علم نے غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے انکار کردیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ علمِ عربی وہ علم ہے کہ ہر چیز کو اس سے انجلا ہوسکتا ہے اخلاق بھی اس سے درست ہوتے ہیں میں ایک انگریزی خواں کی حکایت بیان کرتا ہوں اُس سے اندازہ کرو کہ اُن پر علمِ دین نے کیا اثر کیا اور کیا یہ اثر نری انگریزی تعلیم سے آسکتا ہے اور وہ اثر کس قدر ضروری ہے واقعہ یہ ہے کہ میں جس زمانے میں کانپور میں پڑھاتا تھا ایک روز حسبِ معمول بیٹھا پڑھا رہا تھا کہ ایک نائب تحصیلدار آئے اور اپنے لڑکے کی تعلیم کے لئے ایک اُستاد کی ضرورت ظاہر کی۔ اُس وقت جو طالب علم مجھ سے پڑھ رہے تھے میں نے عربی زبان میں اُن سے دریافت کیا تاکہ یہ نہ سمجھیں میری گفتگو شروع کرتے ہی وہ کہنے لگے کہ جناب کے عربی میں گفتگو کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت کی گفتگو کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا منظور ہے لیکن میں عربی سے واقف ہوں اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں یہاں سے اُٹھ جاؤں۔ اُن کے اِس کہنے سے مجھے بیحد شرمندگی ہوئی اور یہ خیال ہوا اللہ اکبر میں نے تو اِن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا کیا اور انھوں نے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ آخر میں نے اُن سے کہا کہ جناب یہ میری

غلطی تھی واقع میں کوئی پوشیدہ بات نہ تھی اب میں اردو میں گفتگو کرتا ہوں۔ اب میں دو باتیں اس کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں اوّل تو یہ کہ کیا بدون علم دین کے یہ اثر پیدا ہوسکتا ہے سو ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں ہوسکتا دوسری بات یہ پوچھتا ہوں کہ آیا یہ اثر نہایت ضروری ہے یا نہیں ظاہر ہے نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم کو باہم جائز نہیں کہ ہم کسی کے اسرار پر مطلع ہوں۔ غرض تہذیب اخلاق تعلیم انگریزی ہر ایک کے لئے علم دین کی ضرورت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ علم دین کی جس میں قرآن شریف بھی داخل ہے ہر شخص پر حفاظت ضروری ہے۔ یہ تو ضرورت کے متعلق گفتگو تھی۔ اب ایک سوال اور رہ گیا ہے جو اکثر لوگوں کی زبان پر آیا کرتا ہے وہ یہ کہ قرآن شریف کو اگر پڑھا جائے تو نرے الفاظ کے پڑھنے سے کیا نفع اس سوال کا ایک جواب تو ہوگیا کہ اس کے پڑھنے کی ضرورت ہے اور ضرورت کے ہوتے کسی جدید نفع کا ہونا ضروری نہیں۔ کیا اگر کسی شخص کو پیاس لگی ہو اور وہ پانی پینا چاہے اور کوئی شخص اُس سے کہے کہ پانی پینے سے کیا فائدہ تو اُس کو یہ کہدینا کافی نہیں کہ اسوقت اسکی ضرورت ہے اگرچہ کوئی جدید فائدہ مُرتب نہ ہو۔ اور اگر بالخصوص نفع ہی کی تلاش ہے تو لیجئے نفع بھی بیان کئے دیتا ہوں مگر پہلے یہ بتلایئے کہ نفع کس کو کہتے ہیں کیونکہ منشاء اشتباہ یہی ہے کہ نفع کو منحصر سمجھ لیا ہے صرف ایک ہی میں کیونکہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ جب سمجھ ہی میں نہ آیا تو طوطی کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ معلوم ہوا کہ محض سمجھنے کو نفع سمجھتے ہیں سو اِس میں ہے گفتگو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ایک شخص امتحان دینا چاہے تحصیلداری کا اور اس میں یہ قانون ہوجائے کہ جو شخص فلاں کتاب سُنادے گا وہ پاس ہوجائے گا اگرچہ اُس کتاب کو نہ سمجھے تو اگر ایسا قانون واقع میں ہوجائے تو کیا اِس قانون کے مقرر ہونے کے بعد آپ سوال کریں گے کہ اِس کتاب کے حفظ کرنے سے کیا فائدہ ہرگز نہیں تو معلوم ہوا کہ فائدہ صرف سمجھنے میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی منافع ممکن ہیں البتہ اگر قرآن میں اس کے سوا کوئی نفع نہ ہوتا تو یہ سوال متوجہ ہوسکتا تھا اور جبکہ دوسرے منافع بھی ہیں تو یہ سوال نہیں ہوسکتا چنانچہ حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کہ جن کی شان یہ ہے کہ ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

فرمان اللہ تعالیٰ کا تھا زبان آپ کی تھی۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اُس کے لئے دس نیکیاں لکھی گئیں تو جب ایک ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی گئیں تو پورے قرآن پر کس قدر نیکیاں لکھی جائیں گی تو یہ کتنا بڑا نفع ہوا اور اگر کوئی کہے کہ نیکیوں کو کیا کریں تو سمجھو کہ نیکیاں اس وقت تم کو بیکار نظر آتی ہیں لیکن جب تم دارِ دنیا سے چل کر دارِ عقبےٰ میں پہنچو گے تو معلوم ہوگا کہ حسنات کیسا کار آمد سکّہ تھا دیکھو اگر ایک شخص مکّہ مکرمہ جارہا ہو اور بمبئی میں پہونچکر اس کو کسی نے خاص مکّہ مکرمہ کا رائج الوقت سکّہ دیا تو اگرچہ یہ سکّہ بمبئی یا عدن میں نہیں چلتا لیکن چونکہ وہ جانتا ہے کہ میں چار دن بعد مکہ مکرمہ پہونچ جاؤں گا اس لئے یہ نہیں کہتا کہ میں اِس کو کیا کروں اور اگر کہے تو اُس کو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ آٹھ دن بعد دیکھ لینا کہ تم اس کو کیا کروگے۔ اس وقت حسنات بیکار معلوم ہوتے ہیں لیکن جب قیامت کے میدان میں کھڑے ہوگے اور لوگوں کے اعمالنامہ وزن کئے جارہے ہوں گے اور ان کے موافق جزا مل رہی ہوگی اور تم تہیدست ہوگے اُس وقت معلوم ہوگا کہ حسنات کیا چیز تھیں فرماتے ہیں ؎

کہ بازار چند انکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

بازار جوکہ بھرا ہوا رہتا ہے اُس میں تہی دست کا دل پریشان رہتا ہے۔

اگر کسی عمدہ بازار میں کسی مفلس کو بھیجدیا جائے تو اُس کو انتہائی پراگندگی ہوگی کیونکہ جدھر نظر پڑے گی اچھی اچھی قیمتی چیزیں نظر آئیں گی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا افلاس اور تہیدستی بھی یاد آئے گی اس لئے حسرت بھی بڑھتی جائے گی بالخصوص جبکہ بازار جاتے وقت اس سے کہا گیا ہو کہ کچھ نقد لیتے جاؤ اور وہ چھوڑ کر چلا گیا ہو پس یہی حالت میدان قیامت میں اِن لوگوں کی ہوگی اور وہ ایسا وقت ہوگا کہ سوائے اِس سکّے کے اور کوئی سکّہ کام نہ دے گا کیونکہ کوئی چیز یہاں سے ساتھ ہی نہ جائے گی چنانچہ فرماتے ہیں

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ کہ تم اکیلے آئے ہو اور جتنی چیزیں ہم نے تم کو دی تھیں سب پس پشت چھوڑ آئے اور اگر لاتے بھی تو کیا ہوتا چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر تمام زمین کے خزانے بھی اس وقت مل جاتے تو انسان اپنی جان کا فدیہ دیتا لیکن اُس سے قبول نہ ہوتا. تو اب اس کا جواب معلوم ہوگیا کہ نیکیوں کو کیا کرینگے یعنی اس وقت ان کی قدر ہوگی. وہاں نیکیوں کی یہ حالت ہوگی کہ سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہوں گی حتّٰی کہ ایک شخص کے اعمال وزن کئے جائیں گے تو اُس کے گناہ اور نیکیاں دونوں برابر ہوں گی حُکم ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے لے آؤ تو تمہاری مغفرت ہوجائے گی یہ سُنکر بہت خوش ہوگا کہ بھائی بیٹا باپ ماں وغیرہ دوست احباب بہت لوگ ہیں کوئی تو ضرور ہی دے گا چنانچہ یہ سوچکر سب کے پاس جائے گا اور سب کے سب انکار کر دینگے سخت پریشان ہوگا اور بالکل مایوس ہوجائیگا کہ ایک شخص سے ملاقات ہوگی اور وہ اُس کی حالت کو دیکھ کر پوچھے گا کہ کس فکر میں ہو. یہ کہے گا کہ ایک نیکی کی تلاش میں ہوں کیونکہ میری مغفرت میں ایک نیکی کی کمی ہے لیکن کوئی شخص نہیں دیتا یہ سُنکر وہ کہے گا کہ جب صرف ایک نیکی کی کمی مانعِ مغفرت ہوگئی تو میرے پاس تو صرف ایک ہی نیکی عمر بھر کی ہے باقی تمام معاصی وہ ایک نیکی کیا کام آسکے گی. اچھا لو میں وہ نیکی تم کو دیتا ہوں کہ تمہاری مغفرت تو ہوجائے چنانچہ یہ شخص نہایت خوش و خرّم اس نیکی کو لے کر جائے گا اور اس کی مغفرت ہوجائے گی اور اس کے ساتھ ہی اُس نیکی دینے والے کی بھی مغفرت ہو جائے گی. اس مضمون سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ نیکی کتنی قدر کی چیز ہے اور میدان قیامت میں اس کی کیا کچھ ضرورت ہوگی اور یہ کیسی نایاب ہوگی اُس وقت معلوم ہوگا کہ اگر کسی نے قرآن شریف کا ایک ختم دنیا میں کر لیا تھا تو اُس سے کیسا کچھ فائدہ اُس کو ہوا اور کتنی نیکیاں اُسکے صحیفۂ اعمال میں لکھی گئیں اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال میں سمجھئے. اسکولوں میں لڑکوں کو اقلیدس پڑھائی جاتی ہے بیس لڑکوں میں ایک بھی بمشکل ایسا ہوتا ہے کہ مسائلِ اقلیدس کو سمجھ سکے لیکن امتحان

کے زمانے میں بغیر سمجھے ہی اس کو رٹ لیتے ہیں اور اسی کی بدولت پاس ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بے سمجھے محض رٹ لینا بھی مفید ہے۔ تو صاحبو کیسے افسوس کی بات ہے کہ دُنیا کی معاملات میں جو باتیں مُسلّم ہیں وہی باتیں دین کے معاملات میں پیش کی جائیں تو تردد یا انکار کیا جاتا ہے تو ہجّے تو صحیح اور رواں غلط۔ ہم لوگوں کی وہ حالت ہو رہی ہے کہ جیسے ایک شخص نے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ شروع کی تھی ہجے تو کئے ت ب زبر تب ب ت زبر بت کہا اور رواں پڑھا تو بطخ اسی طرح اِس وقت لوگ فرداً فرداً ہر مقدمے کو تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں لیکن مجموعہ مقدّمات سے جو نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بمنزلہ رواں کے ہے اس کو نہیں مانتے کیسی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے آخر کیا وجہ ہے کہ جب سارے مقدّمات مُسلّم ہوں تو نتیجہ مسلم کیوں نہ ہو۔ ضرور مسلّم ہونا چاہیئے پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف کا پڑھنا اگرچہ بے سمجھے ہو نہایت ضروری ہے اُس کی حفاظت کی وجہ سے اور نہایت مفید ہے اجرِ جزیل کے مرتب ہونے کی وجہ سے اور سب سے اوّل مسلمان کے بچّے کو قرآن شریف پڑھانا چاہیئے کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ تھوڑی عمر میں علوم حاصل کرنے کی استعداد تو ہوتی نہیں تو قرآن شریف مُفت برابر پڑھ لیا جاتا ہے ورنہ وہ وقت بیکار ہی جاتا ہے اور بعضے لوگ بڑی عمر کے بھروسے کہ یہ خود پڑھ لے گا نہیں پڑھاتے سو مشاہدہ ہے کہ زیادہ عمر ہو جانے کے بعد نہ خیال میں وہ اجتماع رہتا ہے نہ اس قدر وقت ملتا ہے نہ وہ سامان بہم پہنچتے ہیں۔ فکرِ معاش الگ ستاتی ہے اہل و عیال کا جھگڑا الگ چُپکتا ہے خیالات میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اِتنے موانع کے بعد کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور اگر کسی ایک دو نے کر لیا تو وہ قابلِ اعتداد نہیں ایسے مستثنیات ہر جگہ میں ہوتے ہیں مگر یہ حکم کی کلیتہ کو مبطل نہیں اور جب بڑے ہو کر پڑھنا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہے تو عجب نہیں کہ اگر یہی حالت رہی جو اَب ہے تو چند روز میں مسلمانوں کے بچّوں کو نماز میں قرآن شریف پڑھنے کے لئے آریوں اور عیسائیوں سے قرآن شریف پوچھنا پڑے۔ آپ شاید اِسکو

تعجب کی نظر سے دیکھیں لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ رفتار کا یہ مآل چنداں عجیب نہیں۔ دیکھئے احکامِ شریعت کو آپ نے چھوڑا اور دوسری قوموں نے اُنکی خوبیاں دریافت کر کے اُن کو اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ بہت سے اسلامی احکام کو اسلامی احکام نہیں سمجھتے بلکہ انگریزوں یا کسی دوسری قوم کے خصوصیاتِ معاشرت میں سے سمجھتے ہیں اور اُن سے لے لے کر عمل کرتے ہیں از آنجملہ مسئلہ استیذان ہے کہ شریعتِ مُطہرہ کا یہ حکم ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے مکانِ خلوت میں اگرچہ وہ مکان مردانہ ہی ہو اُس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ صاحب مکان سے اجازت نہ لے لے واقعات اور تجربات سے اِس کی خوبی دریافت کر کے تمام متمدّن قوموں نے اِس پر عمل شروع کر دیا لیکن مسلمان اس کو معاشرت یورپ کے خصوصیات سے سمجھتے ہیں اُن کو یہ خبر نہیں کہ یہ حکم شریعتِ مطہرہ کا ہے اور دوسروں نے یہیں سے لیا ہے حالانکہ یہ ایسا صریح حکم ہے کہ صاف صاف قرآن شریف میں موجود ہے یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (اے ایمان والو کسی کے گھر میں بغیر اجازت یا بغیر سلام کئے اندر نہ جاؤ یہ ہی تمہارے لئے بہتر ہے (یہ بات تم کو اس لئے بتلائی ہے) تاکہ تم خیال رکھو۔ اور راز اِس مسئلے میں یہ ہے کہ اِس پر عمل کرنے سے اتفاق قومی باقی رہتا ہے کیونکہ اتفاق کی جڑ صفائے قلب ہے اور صفائے قلب اُس وقت باقی رہتی ہے کہ جب ایک سے دوسرے کو تکلیف نہ ہو اور مسئلہ استیذان پر عمل نہ کرنے سے بسا اوقات تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف موجبِ تکدّر ہے اور تکدّر مورثِ نفاق و افتراق ہے اور جب اس مسئلے پر عمل کیا جائے گا تو ہرگز یہ نوبت نہ آئے گی کیونکہ فرض کیجئے ایک شخص نے آپ سے اجازت چاہی آپ نے بے تکلف کہدیا کہ میں اس وقت کام میں ہوں یا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جو قومیں اس مسئلے کو برت رہی ہیں وہ اِسی کی بدولت دیکھ لیجئے کہ کس قدر آرام میں ہیں علیٰ ہذا اور بہت سے دوسرے مسائل ہیں کہ وہ ہمارے اسلام نے

بتلائے تھے اور آج ہم نے اُن کو چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے اُن پر عمل کیا ہے اور اب اگر ہم اُن پر عمل کرتے ہیں تو دوسروں سے اخذ کر کے اور اُن کی چیز سمجھ کر عمل کرتے ہیں. تو اِن احکام کی طرح مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن شریف بھی دوسروں سے پوچھ کر پڑھنے کی نوبت نہ آجاوے۔ اور اگر ایسا (خدا نہ کردہ) ہو تو کیا مسلمانوں کی غیرت اِس کو گوارا کرے گی اگر نہیں تو کیوں اِسی وقت سے اُس کا تدارک نہیں کیا جاتا صاحبو! یاد رکھو ؎

سرچشمہ باید گرفتن بہ میل		چو پُرشد نہ شاید گذشتن بہ پیل

چشمے کے سوت کو ابتدا ہی میں سوئی سے بند کرسکتے ہو لیکن بڑھ جانے پر اگر ہاتھی بھی رکھ دو گے تو بند نہیں ہوگا۔

جب سر سے پانی گذر جائے گا تو اس وقت کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکے گی۔ اور ان ساری باتوں کے علاوہ قرآن مجید کے الفاظ اس قدر شیریں اور با حلاوت ہیں کہ اُن کی طرف خود کشش ہونی چاہیئے. اگر اس پر ثواب وغیرہ کا وعدہ بھی نہ ہو تب بھی اُس کو یاد کرنا چاہیئے تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حفظ کرنے سے دماغ کمزور ہوجاتا ہے اِس لئے ہم اپنے بچّوں کو حفظ نہیں کراتے کیونکہ کمزوری دماغ کے بعد وہ کسی دوسرے کام کے نہیں رہتے۔ اس کے جواب میں ایک ڈاکٹر کا قول نقل کر دینا کافی ہے. ایک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ دماغ صرف قوتِ فکریہ سے کمزور ہوتا ہے حفظ الفاظ سے نہیں ہوتا کیونکہ حفظ دماغ کی اصلی ریاضت نہیں وہ صرف زبان کی ریاضت ہے اور دماغ کی ریاضت غور و فکر ہے تو حفظ سے دماغ نہ تھکے گا اگر تھک سکتی ہے تو زبان اور زبان تھکتی نہیں دوسری بات اُنہی نے یہ بھی کہی کہ قرآن شریف اس وقت یاد ہوجاتا ہے کہ بچّہ اس وقت تک کچھ بھی نہیں کرسکتا یعنی اُس کے دماغ میں کسی کام کے کرنے اور غور و فکر کی قابلیت ہی نہیں ہوتی اور اگر زبردستی اس وقت کسی دوسرے کام میں لگا دیئے جاتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضرتیں اُٹھاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اعتدال کی رفتار سے چلے تو قرآن شریف

اس وقت حفظ ہو جائے گا جس وقت تک کہ وہ خود بھی بچے کو کسی کام کے فکر میں نہ لگائے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ دماغ کمزور ہو جائے گا تو میں کہتا ہوں کہ دماغ کس کا ہے؟ صاحبو! کتنی شرم کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا دماغ ساری عمر اپنے لئے اُس کو صرف کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے لئے دو چار سال بھی نہ دیئے جائیں غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے قرآن شریف کا یاد کرنا نہایت ضروری ثابت ہوتا ہے اور ایک بڑا فائدہ اس میں یہ ہے کہ اس کے حفظ سے دوسرے علوم نہایت درجہ آسان ہو جاتے ہیں. حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس جب کوئی اپنے بچے کو لاتا تو دریافت فرماتے کہ اس نے قرآن شریف حفظ کیا ہے یا نہیں اگر وہ حافظ ہوتا تو فرماتے کہ انشاء اللہ یہ پڑھ لے گا اور اگر حافظ نہ ہوتا تو وعدہ نہیں کرتے تھے یوں فرماتے تھے کہ میں بھی دعا کروں گا تم بھی دعا کرنا۔ اور واقعی یہ تجربہ بھی ہے کہ جو لوگ حافظ ہیں اکثر اُن کو دوسرے علوم بھی نہایت آسانی سے آجاتے ہیں۔ لیکن اگر حافظ بناؤ تو اس کا خیال رکھو کہ ان کو یاد بھی رہے کیونکہ اکثر لوگ انگریزی میں اس قدر کھپ جاتے ہیں کہ ماں باپ کی ساری کوشش اور اپنے بچپن کی تمام محنت رائیگاں جاتی ہے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کی بدولت عقلائے وقت کو یہ مہمل خیال پیدا ہوا کہ قرآن شریف پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے. اس لئے اُس کے بقائے حفظ کا ضرور خیال رکھو اور کوئی وقت روزانہ اُس کی تلاوت کا نکال لو اگر کہو کہ کثرتِ کام سے وقت نہیں ملتا تو میں کہتا ہوں کہ اگر تم کو کوئی بیماری لگ جائے اور ڈاکٹر اس بیماری میں یہ تجویز کرے کہ ایک گھنٹے تک روزانہ صبح کو قرآن شریف پڑھا کرو تو اُس وقت تمہارے پاس کہاں سے وقت نکل آئے گا تو تھوڑی دیر کے لئے دین کو ایسا ہی سمجھ کر اس کے لئے وقت نکال لیا کرو۔

(یہاں پہونچکر مجلسِ وعظ میں کاتب کے پاس کاغذ نہ رہا اور حاضرین میں سے کسی سے دستیاب بھی نہ ہوا مجبوراً آگے مضمون نہ لکھا جا سکا اور بیچ میں چھوڑنا پڑا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
رَوَاہُ الْبُخَارِیُ

دعوات عبدیت جلد سوم
کا
تیسرا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ العمل فی الدین

منجملہ ارشادات
حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
محمد عبد المنان غفرلہ
مکتبہ تھانوی۔ دفتر الابقاء
متصل مسافرخانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ العمل فی الدّین

اَیْنَ	کہاں ہوا	الٰہ آباد۔ مکان عبدالباقی خاں صاحب
مَتٰی	کب ہوا	۷ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ وقت شب بعد عشاء
کَمْ	کتنا ہوا	۳ گھنٹے
کَیْفَ	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کھڑے ہو کر
مَاذَا	کیا مضمون تھا	ضرورت العمل فی الدین
مَنْ ضَبَطَ	کس نے لکھا	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم
اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	سامعین کی تعداد	تقریباً ۲۰۰۰ ہزار
اَشْتَاتٌ	متفرقات	صوفی لوگ بھی تھے اور مجمع مستورات بھی تھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل پڑھی گئی تھی دو مجلسوں میں اس کی تلاوت ہوئی ہے۔ مجلسِ اول میں اس کے متعلق تمہید عرض کی گئی تھی اور مجلسِ دوم میں ایک جزکی یعنی بحث الفاظ کی زیادہ تفصیل اور دوسرے جزکی یعنی علمِ معانی کی قدرے تفصیل کی گئی تھی۔ تیسرا جز یعنی عمل باقی تھا اُس کی تفہیم اور دوسرے جزکی تتمیم کے لئے یہ وقت تجویز کیا گیا یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ اس کے قبل یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس آیت میں خدا تعالٰے نے تین جزو کا بیان کیا ہے یَتۡلُوۡا اور یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ اور یُزَکِّیۡھِمۡ اور یہ تینوں سب دین کے جز ہیں۔ دین کی ضرورت اس سے پہلے بیانوں میں ثابت کردی گئی تھی اُس کے اعادے کی ضرورت نہیں اور اُس کے تین جزو ہیں سے یَتۡلُوۡا کے متعلق تحصیل الفاظِ قرآنیہ کا مضمون بھی اس کے قبل بیان کیا جاچکا ہے پس اس وقت صرف جزوِ عملی کا بیان ہوگا باقی محض مضامین سابقہ کا مختصراً اعادہ بطور استحضار تمہید کے مکرر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر مقصود میں خواہ وہ ادنیٰ درجے کا ہو یا اعلیٰ درجے کا ہو دو جزو ہوتے ہیں ایک جزو علمی اور ایک جزوِ عملی۔ مثلاً اگر ہم کوئی دنیاوی کام کرنا چاہیں تو اوّل ہمیں اُس کا علم ہوگا پھر اُس کے بعد ہم اُس پر عمل کریں گے۔ یا جیسے میں نے پہلے بیان میں عرض کیا تھا کہ طبیب اُسکو کہیں گے جس کو علمِ ادویات بھی ہو اور اُن کا استعمال بھی جانتا ہو۔ اسی طرح ہر مقصود کے اندر یہی دو جزو ہیں تو دین بھی چونکہ مقاصدِ عُلیہ سے ہے اس لئے اُس میں بھی یہ دو جزو معتبر ہوں گے۔ اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ علوم میں ایک مرتبہ دال کا ہوا کرتا ہے اور ایک مرتبہ مدلول کا۔ سو جس طرح تقسیم الی الجزئین ہر مقصود میں ہوتی ہے کچھ دین کی تخصیص نہیں اسی طرح دال و مدلول کا مرتبہ بھی ہر مقصودِ علمی میں ثابت ہوگا۔ اس میں دین کی تخصیص نہ ہوگی۔ مثلاً طب کے الفاظ کہ وہ دال ہیں معانیِ مقصودہ پر اُن کے بغیر اُن معانی کا سمجھنا مشکل ہے۔ پس الفاظ دال ہوئے معانی مدلول ہوئے۔ یہاں سے الفاظ کے دال علی المعانی اور کافی فی الدلالۃ ہونے کے متعلق ایک عجیب کام کی بات یاد آئی کہ وہ اہل باطن کے لئے بہت مناسب ہے

چونکہ مجمع میں اس قسم کے لوگ بھی ہوں گے اس لئے اُس کا ذکر مفید ہوگا وہ یہ ہے کہ بعض اہلِ باطن یہ سمجھتے ہیں کہ سلوک طے کرنے کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں اور اس خیال کی وجہ سے اگر کسی کو تجویز کرتے بھی ہیں تو پھر اُس کو چھوڑ دیتے ہیں بالخصوص اگر قلب میں کچھ حرکت و حرارت عبادت میں کسی قسم کی لذت آنے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہم کامل ہوگئے حالانکہ تکمیل اُس کو کہتے ہیں جسے اہل فن تکمیل کہدیں۔ بچہ ایک دو کتاب پڑھ کر سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوگیا حالانکہ علم سے ابھی اُس کو مناسبت بھی نہیں ہوتی ہاں جب اہلِ علم یہ تجویز کردیں کہ اب یہ عالم ہوگیا ہے اس وقت کہا جائے گا کہ اُس کو کمال فی العلم ہوگیا۔ ان لوگوں کی بعینہ وہ حالت ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ بندر کے ہاتھ ایک ہلدی کی گرہ آگئی تھی کہنے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں تو جیسے وہ بندر ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بنا تھا ایسے ہی یہ لوگ بھی اپنے خیال میں ذرا سی قلب کی حرارت وغیرہ کو دیکھ کر اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے. بہرحال تکمیل سے مراد وہ ہے کہ جس کو اہلِ فن تکمیل سمجھیں. تو اگر قبل تکمیل شیخ کی وفات ہوجائے تو دوسرے سے رجوع نہیں کرتے بالخصوص اگر کشفِ قبور ہی ہو کہ اس صورت میں تو اپنے کمال میں شبہ بھی نہیں رہتا کیونکہ کشفِ قبور کے لئے صاحبِ نسبت فنا ہونا ضروری ہے تو جب صاحب نسبت بھی ہوگئے پھر کیا کسر رہی حالانکہ کشف قبور کوئی کمال نہیں ہے نہ مطلق نسبت کا حصول دلیل کمال ہے. کشف قبور کے نسبت فنا پر موقوف ہونے پر مجھے ایک محقق کی حکایت یاد آئی کہ اُن سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے اُس شخص نے کہا کہ مثلاً میں ہوں. فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کتنا بڑا مسئلہ اور کس طرح دو جملوں میں حل کردیا۔ یہ بات اہل علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ اُن کو جواب سائل کے تابع ہرگز نہ ہونا چاہیئے. اور جو طرز جواب کا اُن کے لئے مصلحت ہو اُس کو اختیار کرنا چاہیئے گو وہ اُن کی رائے کے خلاف ہو یہ ضروری نہیں کہ جس راہ سائل لے چلے اُسی راہ چلیں جس طرح اس حکایت میں سائل. نے تو یہ چاہا کہ پوری تحقیق مسئلے کی بیان کی جائے اور محقق مجیب نے اُس کو بے کار سمجھ کر اُن کی حالت کے

مناسب جواب دیدیا کہ تم پورے مسئلے کو کیا کرو گے اپنا تعلق جس قدر مسئلے سے ہے اُسکو سمجھ لو کہ تم کو تبور سے نفع نہیں ہوسکتا۔ پس سائلین تو یہ چاہتے ہیں کہ جس راہ ہم لے چلیں اُس راہ اگر چلیں تو ہم جانیں گے کہ ہمارے سوال کا جواب ہوا ورنہ ہم سمجھیں گے کہ جواب نہیں ہوا۔ مجیبوں نے جب دیکھا کہ اُن کی یہ حالت ہے تو جس چال انھوں نے چلایا اُسی چال انھوں نے چلنا اختیار کیا۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہوئی کہ سائلین کے امراض میں ترقی ہوتی گئی اور شبہات ترقی پذیر ہوتے گئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے طبیب کے پاس کوئی مریض جائے کہ جس کو مرض دق بھی ہو اور زکام بھی ہو اور جا کر حکیم سے فرمائش کرے کہ اوّل زکام کا علاج کر دیجئے تو اگر طبیب زکام کے علاج میں ایک مدید مدت صرف کر دے تو وہ خائن ہے۔ اُس کو چاہئیے کہ مریض کو رائے دے کہ ہرگز ایسا نہ کرو اوّل دق کی خبر لو اگر مریض اس تجویز پر یہ کہے کہ حکیم صاحب کچھ نہیں جانتے تو طبیب اُس وقت کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کے جہل پر رحم کرے گا اور پھر بھی اپنی ہی تجویز اور اُس کی مصلحت پر عمل کرے گا اور اگر اس نے مریض کا اتباع کیا تو وہ خود غرض ہے۔ اسی طرح محقق پر واجب ہے کہ جواب مصلحت کے موافق دے نہ کہ سائل کی مرضی کے موافق سوال میں جتنا ناشائستہ جز ہو اُس کو نکال دے اگر سارا ہی ناشائستہ ہو تو جواب ہی نہ دے اور اگر جواب دے تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا جواب دے بلکہ جتنا مناسب ہو اُتنا جواب دے مجھے یاد آیا کہ مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سود لینا کیوں ناجائز ہے تو اُن کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مُدلّل جواب دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا اُن کی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کیوں ناجائز ہے یہ اُس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں یہ تھا جواب اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے وہ صحیح ہوتے۔ اتفاق سے وہ شخص ایک مرتبہ مجھ سے ملے وہ تو مجھے پہچانتے تھے لیکن میں نہ پہچانتا تھا کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھے نہ پہچانا ہوگا میں نے کہا بیشک میں نے نہیں پہچانا کہنے لگے کہ میں وہی شخص ہوں جس کے پاس سے اس قسم کا سوال جناب کے پاس آیا تھا اور اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس قسم کا جواب کیوں

دیا تھا. جب میں نے دیکھا کہ یہ جواب کو ابھی تک نہیں سمجھے تو میں نے اُن کی سمجھ کے موافق اس استفسار کا ایک دوسرا جواب دیا میں نے کہا کہ آپ ایک عہدیدار ہیں آپ کو ہر قسم کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے کیا آپ سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں یا احباب کے ساتھ دوسری قسم کا برتاؤ ہے اور اجانب کے ساتھ دوسری قسم کا کہنے لگے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے علیحدہ برتاؤ ہوتا ہے میں نے کہا کہ جب یہ ہے تو افتاء کا بھی ایک محکمہ ہے اس میں بھی اسی طرح کسی کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کسی کو دوسری قسم کا میں چونکہ آپ کی حالت سے واقف نہ تھا. اس لئے میں نے آپ کو ضابطہ کا جواب دیا اور اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اب انشاء اللہ تعالیٰ اس قسم کا جواب نہ آئے گا لیکن اس ملاقات کا جیسا اثر مجھ پر ہوگا آپ پر بھی ہوگا آپ کے پاس سے بھی اس قسم کا لغو سوال کبھی نہ آئے گا. غرض اس وقت یہ ایسی آفت ہے کہ مجیب سائل کے تابع ہوجاتے ہیں مگر اُن محقق کا جواب نہایت ہی نفیس تھا کہ اگر فیض لینے والا تو ہے تو نہیں تو مقصود یہ ہے کہ قبور سے جو فیض ہوتا ہے تو صاحب نسبت فناء کو ہوتا ہے خیر یہ حکایت تو تبعًا بیان ہوگئی. اصل بیان اس کا ہے کہ طالب اگر صاحب کشف بھی ہوجائے تب بھی اسکو شیخ سے استغناء جائز نہیں کیونکہ اُس میں کفایت نہیں ہوتی وجہ یہ ہے کہ فیض کی دو قسمیں ہیں ایک بہ دلالتِ لفظیہ یعنی تعلیم و تلقین ایک غیر لفظیہ یعنی تقویت نسبتہً افادہ اور استفادہ میں لفظیہ بہت مفید اور ممد ہے پس صرف قبور سے استفادہ پر بس کرنا غلطی ہے کیونکہ قبور سے اتنا فیض ہوتا ہے کہ حالتِ موجودہ میں ترقی ہوتی ہے دلبس بخلاف زندہ کے کہ اگر کوئی شبہ ہو تو اُس کو پیش کر کے حل کرسکتا ہے خوب مشبع طور سے تو اس کی برابر ہرگز فیضِ قبور نہیں ہوسکتا یہ اس کی فرع تھی کہ الفاظ کی برابر افادہ نہیں ہوسکتا یہی میں نے اجمالاً بیان کیا تھا پس علم کے متعلق دو جز ہوئے الفاظ اور معانی اور تیسرا مقصود عمل ہوا یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ میں نے بیان کردیا تھا کہ الفاظ کے متعلق کافی بحث ہوگئی ہے اور چونکہ اور علوم میں الفاظ کی ضرورت مقصود نہیں ہے اس لئے اُس میں اردو وغیرہ نفس مقصود کے حصول میں سب برابر ہیں اور قرآن شریف میں بخصوصہا الفاظ بھی مقصود ہیں اس کو خوب بیان کردیا تھا البتہ الفاظ کے متعلق ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی وہ اب بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ الفاظ کے کچھ حقوق ہیں مثلاً یہ کہ

وہ اپنی ہئیت کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محفوظ رہیں کیونکہ عربیت ایسی ہی ہے جیسے اُردو سو اگر اردو کے قواعد پر رہے تو وہ اُردو کہلائیگی ورنہ نہیں جیسے آج کل تشبّہ کے لئے اُردو غلط بولنے لگے ہیں ظاہر ہے کہ وہ اردو نہیں ہے میں نے خود اسٹیشن کان پور پر دیکھا کہ ہندوستانی شخص نے اُردو کو خراب کر کے ایک شخص سے کہا کہ ہم یہ بات سُننا نہیں مانگتا۔ اور صحیح اُردو کا چھوڑنا محض اس نیت سے کہ انگریزوں سے تشبُّہ ہو۔ افسوس ہے کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ہم کو اُردو آجائے اور ہم اس کوشش میں ہیں کہ جو کچھ آتی ہے وہ بھی خراب ہو جائے۔ میں نے پہلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ وہ تو ہماری چیزیں لیتے جاتے ہیں اور ہم اُن کی چیزیں اختیار کرتے جاتے ہیں یہ بھی اُسی کا ایک شعبہ ہے کیا انتہا ہے کہ الفاظ میں بھی باوجود اختیار اور قدرت کے اُن کے موافق ہونے کی کوشش کی جاتی ہے غرض جیسے یہ اردو نہ تھی اسی طرح اگر عربی کو بگاڑ کر پڑھا جائے تو وہ عربی نہ ہوگی۔ اس وقت جو لوگ قرآن شریف کے پڑھنے کی طرف توجہ کرتے ہیں وہ بھی اُس کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اکثر علماء کو بھی اس کا خیال نہیں ہے حالانکہ اس پر توجہ نہ کرنے سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں قرآن شریف میں تین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں ایک تو وہ کہ جن کو عوام بھی سمجھتے ہیں دوسرے وہ جن کو خواص سمجھتے ہیں تیسرے وہ جن کو خواص الخواص سمجھتے ہیں اسکی ایک مثال اردو میں پیش کرتا ہوں مثلاً لفظ پنکھا بولتے ہیں تو نون کے بعد کاف ہے اور نون ساکن ہے لیکن نون کو اُسکے مخرج سے نہیں نکالتے بلکہ اُس کو خیشوم سے نکالا جاتا ہے اس کو سب جانتے ہیں اس کو اصطلاح میں اخفا کہتے ہیں یہ اظہار اور ادغام کے بین بین ہوتا ہے تو پنکھا میں نون اخفا کے ساتھ ہو تو اگر کوئی یہاں اظہار کرے یعنی نون کو اُس کے مخرج سے نکالے اس طرح پَنْ تو سب ہنسیں گے اور اُس کو اردو نہ کہیں گے اس لئے کہ اخفا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اگر قواعد سے زبان ہے تو اصلی ہے ورنہ نہیں۔ بس اسی طرح عربی زبان میں بھی ہے مثلاً موقع اخفاء میں اخفاء واجب ہوگا جیسے پنکھا اظہار کے ساتھ غلط ہے اسی طرح عربی میں بھی اگر اخفاء کی جگہ اخفا نہ ہوا تو لفظ غلط ہے کتنی موٹی بات ہے مگر اسکو کوئی نہیں سمجھتا تو جیسے پنکھا اظہار سے اردو نہ رہے گا اسی طرح عربی لفظ بھی اخفاء کی جگہ اظہار کرنے سے عربی نہ رہے گا اور خدا تعالےٰ فرماتے ہیں قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا تو جب قرآن عربی میں ہے اور تجوید کے خلاف کہنے سے عربی نہ رہے گا تو قرآن عربی میں نہ پڑھا۔

عاقل کے لئے یہ تقریر بالکل کافی ہے میں نے علماء قرآءت کے اقوال اس لئے نقل نہیں کئے کہ لوگ ان کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک مثال دے دی جس کو سب ملتے ہیں اور یہ ایک مثال نمونے کے طور پر بتلادی ہے اسی طرح بہت سے قاعدے ہیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کثرت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ہے یا وَلَا الظَّآلِیْنَ لیکن اس کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو کام تلفظ کا ہے اُس کو کتابت سے نکالا جاتا ہے حالانکہ تلفظ کا کام کتابت سے کیسے ادا ہو کتابت میں تو صرف صفات آسکتے ہیں باقی جو امور مدرک بالسمع ہیں وہ کس طرح کتابت میں آجائیں گے کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

اگر مُصَوِّر کی بنائی ہوئی تصویر لوگوں کے دلوں کو کھینچ لے گی لیکن میں حیران ہوں کہ اس محبوب کے ناز و انداز کس طرح دکھائے گا۔

اگر محبوب کی تصویر مُصوّر بنا بھی لے گا تو اُسکے ناز و ادا کو کیونکر دیکھا جائے گا تو اگر ض کی صفات لکھ کر بھیجدے تو اُسکے ادا کرنے کی کیفیت تو نہیں لکھ سکتا۔ کوئی فوٹو گراف تو نہیں کہ اس کو بھیجدیا جائے ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک قاری بھیجدیا جائے تو خیر غرض یہ سخت غلطی ہے کہ کتابت سے کام نکالنا چاہیں بلکہ اگر سیکھنا چاہیئے۔ تو تجوید کی ضرورت ثابت ہوگئی اور بدوں اسکے جس طرح آپ جاہلوں کو غلط بولتے دیکھتے ہیں اور اُن پر ہنستے ہیں اسی طرح مجوّدین آپ پر بھی ہنستے ہیں مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مدنی لکھنؤ میں آئے اور انھوں نے قرآن سُنایا ہندوستانی ذہین تو ہوتے ہیں ایک لڑکے نے اُن کی قراءت کا چربہ اُتارا لوگوں نے اُس کو خوب مشق کرائی اور جب اپنے نزدیک وہ قاری صاحب سے افضل ہوگئی تو اپنا کمال ظاہر کرنے کے لئے قاری صاحب کے پاس اُس لڑکے کو لے گئے اور کہا کہ اسنے کچھ تبرکاً آپ کا اتباع کیا ہے انھوں نے کہا کہ ہاں سُنایئے چنانچہ لڑکے نے سُنایا جب سُنا چکا تو یہ لوگ داد کے منتظر ہوئے قاری صاحب نے کچھ نہ کہا تو خود ہی پوچھا کہ اس نے کیسا پڑھا قاری صاحب نے کہا کہ ایسا پڑھا جیسا ہم نے ایک لغات اردو بنایا ہے کہ اَلْجَنَادُ بفتحتین ککری اَلْحَطَبُ بفتحتین لکری اَلْعَنکَبُوْتُ بفتحتین مکری۔ اُسوقت حقیقت معلوم ہوئی کہ کیسا قرآن صاحبزادے نے

پڑھا ہے۔ دیکھئے اگر کوئی شخص ککری اور لکری کہنے لگے تو کیا اس کو اردو بولنے والا کہیں گے ہرگز نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی مہتمم ملی سے ایک عربی نے کہا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے عرب میں رہتے ہیں لیکن اب تک عرب جیسا قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے انھوں نے کہا کہ غیر زبان میں اہل زبان کی سی مہارت نہیں ہو سکتی کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہو سکتی آخر ہم اردو بولتے ہیں انھوں نے کہا کہ آپ ہرگز اہل زبان کے برابر نہیں بول سکتے اور اگر بول سکتے ہیں تو کہیئے ٹٹو۔ ٹھٹھا۔ اُن بیچارے نے کہا تو تتو، تتا ہی نکل سکا مگر یہ تو دفع الوقتی تھی وہ لوگ تو اس کے مکلف نہیں کہ اردو صحیح بولیں اور ہم تو مکلف ہیں قرآن صحیح پڑھنے کے مگر خدا کا شکر ہے کہ اب چند روز سے علماء نے اس پر توجہ کی ہے مدارس میں قراء بھی نوکر رکھے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ سب ادھر متوجہ ہوں اور کچھ لہجہ کی ضرورت نہیں صرف حروف کو صحیح کر لینا چاہیئے اور اس میں کچھ زیادہ مدت نہیں لگے گی صرف اٹھائیس حرف ہیں اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ ان کی مشق کی ضرورت ہی نہیں البتہ بعض حروف کی مشق کی ضرورت ہے جیسے ت ط ۔ ض ظ ۔ کی ترقیق تفخیم تو اگر ایک ایک حرف کے لئے تین تین دن لئے جائیں تو ایک ماہ سے زیادہ صرف نہ ہوگا اور قرآن شریف صحیح ہو جاوے گا رہے محسنات سو ان کا سیکھنا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں نیز سارے قرآن کو سیکھنے کی ضرورت نہیں قواعد کے موافق اگر تھوڑا بھی پڑھ لیا جائے تو کافی ہے پھر سب خود صحیح ہو جائے گا ہاں کسی اُستاد سے پیش کرنا سارے قرآن شریف کا ضروری ہے اور یہ مضمون بہت ہی ضروری ہے اس کی طرف علماء کو بالخصوص توجہ کرنا چاہیئے۔ اس وقت اگر پچاس مولویوں کو جمع کر کے قرآن شریف سنا جائے تو بمشکل دو آدمی صحیح قرآن شریف پڑھنے والے نکلیں گے کتنے افسوس کی بات ہے کہ طلبہ فلسفہ پڑھتے ہیں منطق پڑھتے ہیں اور راس العلوم قرآن شریف کو نہیں پڑھتے اور پھر غضب یہ کہ ایسے لوگ امام ہو جاتے ہیں

اور اس میں دنیوی خرابی یہ ہے کہ بعض اغلاط پر عوام بھی مطلع ہو جاتے ہیں اور علماء کی بے قدری کرتے ہیں ایک صاحب نے سورۂ ناس میں مِنَ الْجِنَّاتِ وَالنَّسْ پڑھا ایک صاحب نے سورۂ ابی لہب میں تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَحَبْ پڑھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ حضور اتنے بڑے عالم ہو کر غلط پڑھتے ہیں کہنے لگے کس طرح پڑھوں ان صاحب نے آہستہ سے بتلایا کہ اَبِیْ لَھَبْ آہستہ اس لئے بتلایا کہ کوئی سنے نہیں ناحق کی رسوائی ہے تو وہ بزرگ اس آہستگی ہی کو مقصود سمجھ کر فرماتے ہیں۔ ہاں زور سے نہ پڑھا کروں ہلکے سے پڑھا کروں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ سمجھانے پر بھی نہ سمجھے بات یہ ہے کہ بلا حاصل کے ہوئے کچھ آتا نہیں۔ دیکھئے آجکل اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریزوں کا لب ولہجہ آجائے اور اس کیلئے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کوئی اپنے اولاد کو لندن بھیجتا ہے کسی نے اپنے بچوں کو میموں کے سپرد کر دیا ہے حالانکہ اس پر نہ پاس ہونا موقوف ہے نہ ڈگری لیکن باوجود اس کے اس کی طرف تو اتنی توجہ کہ اس کے صرف پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں بلکہ لب ولہجہ حاصل کرنے کی بھی تمنا اور کوشش ہے اور قرآن شریف کو ایسا چھوڑا جائے کہ اول تو پڑھا ہی نہ جائے اور اگر پڑھیں بھی تو یوں خراب کر کے ۔ صاحبو ! اگر قرآن شریف کو ہم چھوڑ دیں تو بتلائیے کہ پھر اور کون اس کو پڑھے گا۔ ہر شخص کو قرآن شریف اس طرح پڑھنا چاہیے کہ معلوم ہو کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پڑھ رہے ہیں ۔ واللہ اس میں ایسی لذت ہے کہ اگر ادراک میں تھوڑی سی صحت ہو تو ساری تغنی ایک طرف اور تلاوت قرآن شریف ایک طرف۔

ایک بزرگ تھے مولوی کرامت علی صاحب۔ انھوں نے قرآن شریف عرب میں سیکھا تھا۔ ایک مغنّی نے ان کو پڑھتے سُنا اور کہا اس سے اچھی بھیرویں میں نے آج تک نہیں سُنی ۔ مولوی صاحب نے فرمایا میں کیا جانوں بھیرویں کیا ہوتی ہے ۔ کہنے لگا آپ کو خبر نہیں کہ یہ بھیرویں ہے ۔ تو قرآن شریف ایسی عجیب چیز ہے کہ ہر

لہجے میں ڈھل جاتا ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب کو خبر بھی نہیں مگر اس مغنی کو اس کے مذاق کے موافق لطف آیا ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد　　　برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنیٰ را

اس عالم کی دلکش بہار دل و دماغ کو تازہ کردیتی ہے　　　اصحاب صورت کے رنگ معنی ادا ہوجاتے ہیں

کبھی مکہ معظمہ جانا ہو تو دیکھئے گا کہ ہر گوشے سے کیسی پیاری پیاری آوازیں آتی ہیں واللہ انسان محو ہوجاتا ہے اور ہم کو جو مزہ نہیں آتا تو اس لئے کہ ہم کو پڑھنا آتا نہیں ورنہ صحیح پڑھنے والوں کو خود مزہ آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کی تو خاصیت یہ ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (قرآن سن کر ان اللہ سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں) اور ہم میں یہ اقشعرار ہے نہیں تو کیا بات ہے کچھ تو قلوب ہی درست نہیں کچھ غلط پڑھنے کی بدولت اور جب کبھی کوئی صحیح پڑھنے والا آجاتا ہے تو غور کرکے دیکھ لیجئے کہ قلوب کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پڑھنے میں جو ہم کو مزا نہیں آتا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو پڑھنا نہیں آتا لہذا اس کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم کو پڑھنا آئے۔ یہ حصہ لفظی علم کا تو بحمداللہ ختم ہوگیا اب علم معانی کا درجہ اور عمل باقی رہ گیا آج اس میں جو رہ گیا تھا قابل بیان ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت کتنی بے التفاتی علوم دینیہ سے ہورہی ہے اب دیکھئے کہ یہ مضر ہے یا نہیں۔ میں فضائل بیان نہیں کرتا کیونکہ ضرورت کے بتلا دینے کے بعد فضائل کے ذکر کی حاجت نہیں تو میں صرف اتنا بیان کروں گا کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت کوئی شخص رہتا ہے اس کو اس گورنمنٹ کے قوانین جاننے کی ضرورت ہے اور قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں جلب منفعت اور دفع مضرت ہے لیکن اگر ان کو نہ سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں کیونکہ ہار جانا خسارہ ہے جرم نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں کہ ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے اس کا سیکھنا واجب ہوتا ہے خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر جیسے ایک شخص تجارت کرنا چاہے تو اس کے لئے

ضروری ہے کہ یہ دریافت کرے کہ کس کس چیز کی تجارت کی اجازت ہے اور جب معلوم ہو کہ مثلاً کوکین کی تجارت کی اجازت نہیں تو اس سے رُکے اب یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں اور دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ کے کچھ قوانین ہیں کہ نہیں اگر ہم اسکی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحب قوانین نہ ہوتا تب تو چنداں فکر نہ تھی اور جبکہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدون قوانین سیکھے چارہ نہیں خدا تعالےٰ کی عملداری سے باہر نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو قدرۃً محیط ہے ہر مذہب کے لوگ بلکہ حکماء بھی اس کو جانتے ہیں۔ رہا دوسرا جُز تو اس کو سب مسلمان بلکہ ہر مذہب کے لوگ مانتے ہیں۔ اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا اُن کی مخالفت جرم اور بغاوت بھی ہے۔ سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے کہیں اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ نے خرید و فروخت حلال کی ہے اور سود حرام کیا ہے) لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا (دور رہو زنا سے) غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے ہمارے معاشرت اور معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدم اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے پھر کیا شبہ رہ گیا۔ آج کل لوگ قوانین خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے نماز روزے ہی میں کونسا اہتمام کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوتی تھی۔ مگر چونکہ زمانہ ترقی کا ہے ہر چیز کو ترقی ہوتی ہے اس کو بھی یہاں تک ترقی ہوئی کہ تحریراً اور تقریراً یہ کہا جاتا ہے کہ جس غرض سے نماز مقرر ہوئی تھی یعنی تہذیب نفس۔ اب بوجہ غلبۂ تہذیب کے چونکہ وہ ضروری نہیں رہی اس لئے نماز کی ضرورت نہیں۔ روزہ کے متعلق

کہتے ہیں کہ فدیہ دیدیں تو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ خرابی اس کی ہے کہ ہر شخص قانون شریعت کے معنی بیان کرنے میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کہدے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ اس وقت قانون کی کتابیں موجود ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی فیصلہ ہائی کورٹ میں جا کر منسوخ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماتحت نے اس دفعہ کے معنے نہیں سمجھے اب دیکھئے کہ ماتحت بھی جج ہے اور حاکم بالا بھی جج ہے مگر چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہائی کورٹ کے جج کی برابر کوئی قانون کو نہیں سمجھتا تو سب اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ گو قانون عام ہوا اور سب کے پاس ہو مگر پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بعض لوگ اس قدر سمجھتے ہیں کہ دوسرے نہیں سمجھتے۔ اب میں اس کی شرح کرتا ہوں کہ قرآن شریف کے سمجھنے والے ایک ابوبکرؓ وعمرؓ وحنیفہؒ تھے۔ ایک آج کل کے زید وعمر ہیں تو اپنے اور ان کے علوم کا مقابلہ کر کے دیکھ لیں بلکہ ان حضرات کے متبعین ہی کے علوم سے مقابلہ کر لیں جو کہ اپنے کو ان سے بدرجہا کمتر سمجھتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان ہی کے علوم سے زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہوگا اور ابوحنیفہؒ کے علم سے تو کیا جانے کتنا فرق ہوگا تو دیکھئے کہ ہائی کورٹ کے جج اور ماتحت جج باوجودیکہ دونوں یکساں ہیں مگر پھر بھی فرق مانا گیا تو دین میں اس کا قائل کیوں نہ ہوا جائے گا خود رائی کی اجازت کیونکر دی جائیگی ان سلف صالحین کے مقابلہ میں اگر ہم تفسیر کرنے بیٹھیں تو وہ تفسیر ایسی ہوگی جیسے کہ ایک غیر ملکی دیہاتی کے پاس ایک من کا بورا تھا جب وہ اسٹیشن پر پہونچا تو پلیٹ فارم پر جانے کے وقت ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ اس کی بلٹی لاؤ کہنے لگا کہ ہمارے پاس یہ ٹکٹ ہے یہ ہی کافی ہے ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے ہم اس اسباب کا ٹکٹ مانگتے ہیں کیونکہ یہ پندرہ سیر سے زائد ہے۔ اب یہ دیہاتی صاحب قانون ریلوے کی تفسیر کرتے ہیں کہ پندرہ سیر کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس لئے کہ ہندوستانی لوگ اس سے زائد اسباب اپنے ہاتھ میں اٹھا نہیں سکتے اور ہم چونکہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے یہ حد ہمارے واسطے نہیں بلکہ جس قدر ہم اٹھا سکیں اس قدر ہی ہم کو اجازت ہے۔

آپ اس تفسیر کو سنکر اندازہ کیجئے۔ کیا یہ تفسیر ٹکٹ کلکٹر کے مقابلہ میں صحیح مانی جائے گی اور کیا ٹکٹ کلکٹر کے ذمہ یہ واجب ہے یا اس کو جائز ہے کہ اس کو اس تفسیر کی اجازت دے نیز کیا اس کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ مناظرہ کرے یا صرف یہ کافی ہے کہ اس کو ڈانٹ دے اور اس سے محصول وصول کرے اور کیا اس کا یہ کہنا کہ منشار قانون کا یہ ہے کہ ہندوستانی پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے قابل سماعت ہے اور کیا ٹکٹ کلکٹر پر یہ ضروری ہے کہ اس کو نہایت ٹھنڈے دل سے سُن کر نہایت اطمینان سے اس کو سمجھا دے کہ نہیں بھائی تم غلط سمجھے قانون کا یہ منشار نہیں اور اگر وہ غصہ ہو تو کیا وہ قابلِ ملامت ہے جیسے آجکل علمار پر الزام دھرا جاتا ہے کہ ان کو بہت جلد غصہ آجاتا ہے ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ صاحب فن غیر فن داں سے کلام کرنے کو اپنے لئے عار اور تضیع اوقات سمجھتا ہے اور بزبانِ حال وہ کہتا ہے کہ ؎

تو ندیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبانِ مرغاں را

(تو تم نے حضرت سلیمان علیہ السلام تک کو نہ دیکھا تم چڑیوں کی زبان کیا جانو گے)

بلکہ غیر فن والوں پر واجب ہے کہ بجائے مناظرے کے وہ یہی کہدے کہ

؎ من نہ دیدم گہے سلیماں را ٭ چہ شناسم زباں مرغاں را

(میں نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہ دیکھا میں چڑیوں کی زبان کیا جانوں)

باقی سوالات کا پیدا ہونا وہاں بھی ہے جس نے کبھی قوانین نہ سُنے ہوں اس کو بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ پندرہ سیر کی اجازت کیوں ہوئی چودہ سیر یا سولہ سیر کی اجازت کیوں نہ ہوئی تو اگر اس دیہاتی کی رائے مقبول ہے تو آج کل کے عقلار کی رائے بھی مقبول ہے۔

صاحبو! کیا فن داں اور غیر فن داں برابر ہو سکتے ہیں کبھی نہیں۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ

يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ (کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں) معلمین خوب جانتے ہیں کہ ان کو اپنے طالب علموں کی کم فہمی پر اکثر غصہ آتا ہے کہ کمبخت سمجھتا ہی نہیں تو گیا ان لوگوں کو طالبعلموں سے عداوت ہوتی ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ طبعی قاعدہ ہے غرض دیکھئے کہ باوجود اس بات کے کہ اس دیہاتی کی تفسیر ناواقف کے دل کو لگتی ہے مگر جس نے ریلوے کا یہ قاعدہ بچپن سے سنا ہے اس لئے اس کی تفسیر پر ہنسی آتی ہے۔ کاش اگر اہلِ علم کو قابلِ اعتماد سمجھتے تو ان کے مقابلے میں کوئی مخترع تفسیر آپ کے دل کو نہ لگتی۔ صاحبو! کیا تیرہ سو برس کے بعد آج قرآن شریف کے معنی حل ہوئے ہیں۔ دوسرے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج کل کے قاعدہ کے موافق کثرت رائے سے ہر بات طے ہوتی ہے اور اگر کسی بات پر اتفاق رائے ہو جائے تو بہت ہی قوت کے ساتھ وہ بات طے ہو جاتی ہے۔ سو مسائل شرعیہ تو تیرہ سو برس سے آج تک مسلمہ متفقہ چلے آتے ہیں اور اگر یہ بات بھی نہ ہو تو کثرت کے بعد غیر ممبروں کی رائے کوئی قابل وقعت نہیں شمار ہوتی بس اسی طرح دین میں بھی کثرت رائے کے بعد چند ناواقفین کا اختلاف کرنا کوئی چیز نہ سمجھا جائے گا افسوس سے کہا جاتا ہے کہ روزے کے بارے میں اس قدر گڑبڑ کی ہے کہ جس کی حد نہیں اور آیت کی تفسیر بالکل اہلِ رائے سے خلاف مقصود کی ہے حالانکہ اس کی حقیقت کو اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو کچھ شوق ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے مرتبے سے زیادہ سمجھنا چاہا کرتے ہیں اگر ان کی اصلی جواب دیا جائے تو سمجھتے نہیں اور اگر دوسرا جواب دیا جائے تو زبردستی پر محمول کرتے ہیں۔ روزے ہی کو لیجئے کہ يُطِيْقُوْنَ کا ترجمہ اثبات کا کیا اور نسخ سے انکار کر دیا حالانکہ یہ آیت معنی اثبات پر منسوخ ہے اور عدمِ نسخ کی تقدیر پر معنی نفی پر محمول ہے تو ایک توجیہ پر تو اصول کے جاننے کی ضرورت ہے اور دوسری توجیہ پر عربیت کے جاننے کی ضرورت ہے اور جس کا ذہن دونوں سے

خالی ہو وہ تو اس کو بات بنا تا ہی سمجھے گا اور اگر نفس فن سے مناسبت ہو تو تھوڑے اشارے سے اس کو شفا ہو جاتی ہے۔ ایک منطقی صاحب کو شبہ ہو گیا کہ قرآن شریف سے مسئلہ غلامی کا ابطال ثابت ہوتا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (یا تو یونہی احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر) اور یہ صیغہ حصر کا ہے پس غیر منّ اور غیر فدا منفی ہوگا۔ ایک عالم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے اُن سے کہا کہ یہ قضیہ کونسا ہے کہنے لگے منفصلہ پھر انھوں نے پوچھا کہ حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو اس کو سن کر ان منطقی مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں اور شبہ زائل ہوا اور بے انتہا خوش ہوئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ حقیقیہ ہے انھوں نے تنبیہ کر دیا کہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو تو وہ تو چونکہ ذی علم تھے اس لئے ایک اشارہ کر دینے سے ان کو حل ہو گیا لیکن جس شخص کو معلوم ہی نہ ہو کہ حقیقیہ مانعۃ الخلو یا مانعۃ الجمع کس کو کہتے ہیں وہ تو اس کو گھیر گھار کا جواب ہی سمجھے گا اگر ایک شخص سے کہا جائے کہ مثلث کے تین زاوے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں اور فن اقلیدس سے واقف نہ ہو تو کسی طرح بھی آپ اُس کو نہ سمجھا سکیں گے اگرچہ ہزار دفعہ ناپ کر دکھلا دیجئے جیسے ہمارے ہاں ایک شاعر تھے کہ وہ اپنے اشعار کے مصرعے دھاگے سے ناپ کر برابر کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے کہا کہ آپ کا ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہے کہنے لگے کہ یہ تو اوپر سے ہوتی آئی ہے۔ الٰہی غنچۂ امید بکشا۔ اس کو تو کھینچ کھینچ کر پڑھا۔ گلے از روضۂ جاوید بنما اس کو جلدی سے پڑھ دیا۔ دیکھو اس میں بھی مصرعۂ ثانی چھوٹا ہے۔ اب جو لوگ فن شعر سے واقف ہیں وہ اس کو سُن کر داد دیں گے اور سمجھیں گے کہ اس شخص کو کسی طرح بھی نہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مصرعے برابر ہیں۔

واللہ اے صاحبو! علماء کے نزدیک آج کل کی دلیلیں اس سے بھی بدتر ہیں جیسے یہ شاعر سمجھا تھا کہ میں نے بہت بڑی دلیل

قائم کردی ہے۔ ایسے ہی آجکل کے عقلاء اپنے دلائل کو نہایت مدلل سمجھتے ہیں حالانکہ وہ علماء کے نزدیک اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ (مکڑی کے جالے سے بھی کمزور ہوتے ہیں) علماء فضلاء اُن پر ہنستے ہیں اور ان بیچاروں کو قابلِ رحم سمجھتے ہیں اور جس طرح وزن اور تقطیع نہ جاننے کی وجہ سے اس شاعر کو نہیں سمجھا سکتے تھے اسی طرح مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو نہ جاننے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی نہیں سمجھا سکتے مگر جاننے والوں سے پوچھئے کہ یہ ایک چھوٹا سا لفظ سن کر ان کی کیا حالت ہوئی کہ وجد آنے لگا۔ اِسی طرح اس یُطِیْقُوْنَہٗ کے دو جواب ہیں ایک موقوف ہے عربیت جاننے پر دوسرا اصول جاننے پر مگر ناواقف لوگ دونوں کو زبردستی کا جواب کہتے ہیں، اچھا صاحب زبردستی ہی کا جواب سہی لیکن جیسے اُس دیہاتی کا علاج حکومت سے ہوگیا ایسے اگر آج یہ بات حاصل ہو تو ہم بھی بتلادیں کہ ایسے لوگوں کے لئے اصلی جواب کیا ہے۔ باقی اس کے سوا تو اگر دفتر کھول کر بھی سامنے رکھدیجئے تو تسلی نہیں ہوسکتی اس وقت علماء سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسا جواب دیں جس سے تسلی ہوجائے صاحبو! وہ اسباب بھی تو پیدا کرو جو موجب تسلی ہیں یعنی علوم حاصل کرو۔ علیٰ ہذا آج ایک یہ مرض بھی عام ہو رہا ہے کہ احکام میں علتیں نکالی جاتی ہیں چنانچہ روزے میں یہ علت نکالی گئی ہے کہ چونکہ ابتداء میں بہیمیت کا غلبہ تھا اس لئے روزہ اس کی کسر کے لئے مشروع ہوا تھا اور اب چونکہ ہم مہذب ہوچکے ہیں اس لئے ہم کو ضرورت نہیں افسوس ہے کہ ہم لوگ تہذیب ہی کو نہیں سمجھتے۔ صاحبو! تہذیب یہ ہے کہ تمام رذائل نفس کے دور ہوجائیں نہ یہ کہ مزاج میں قدرے نظافت یا تکلف آجائے ہم لوگوں میں ہرگز تہذیب نفس

نہیں ہے ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم میں تواضع تحمل، بُردباری، ایثار کا نام تک نہیں بلکہ خودغرضی غضب چھچھوراپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے میں ایک زندہ مثال دیتا ہوں کہ اگر ہم میں سے ایک شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دے رکھی ہو اور یہ شخص خوش حال فارغ البال ہو اور اسی دوران میں ایک دوسرا شخص بھی اسی عہدے کی درخواست دے جو کہ نمبر درخواست میں اس کے بعد ہو لیکن یہ دوسرا شخص مفلوک الحال غریب مقروض ہو تو ایسی صورت میں ہم نے کبھی سُنا بھی نہیں اس پہلے فارغ البال نے اُس کی فلاکت پر ترس کھا کر اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور اس کو اپنے سے مقدم کردیا ہو علیٰ ہٰذا ہر معاملہ میں۔ تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ہم میں ایثار کی صفت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ اخلاق درست ہیں تو یہ دیکھو کہ اس کا منشا کیا ہے سو تہذیب اخلاق کے دو منشا ہوتے ہیں کبھی تو مصلحت تمدن کے لئے اپنے اخلاق کو گونہ مہذب کیا جاتا ہے اور کبھی ضرورت دینیہ کے لئے جیسے ایک تاجر اس لئے سچ بولتا ہے کہ اس میں دکان کی بات بنی رہے گی اور لوگ اعتبار کریں گے۔ اور دوسرا اس لئے بولتا ہے کہ خدا خوش ہو تو سمجھئے کہ دنیاوی اور تمدنی مصالح چونکہ ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں اگر اس کو کبھی معلوم ہو کہ اب جھوٹ بولنے میں یہ مصلحت حاصل ہوگی تو وہ فوراً جھوٹ بولے گا اور دین کے مصالح چونکہ متبدل نہیں ہوتے اس لئے اس میں یہ احتمال نہیں ہے اس کا کتنا ہی نقصان ہو تب بھی یہ جھوٹ بولنا گوارا نہ کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ مرضئ خدا کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تہذیب اخلاق خدا کے خوف سے ہو تو وہ مستحکم ہے

ورنہ نہیں تو اول تو تہذیب کے وجود ہی میں کلام ہے اور اگر وجود مان بھی لیا جائے تو اس کی پائیداری میں کلام ہوگا اور یقیناً وہ بالکل ناکافی ہوگا تو اگر تہذیب نفس ہی نماز روزے کی علت ہوتی تب بھی ہم کو چھوڑنا ناجائز تھا کیونکہ ہم کو تہذیب بھی حاصل نہیں۔ اور بالخصوص جبکہ نماز روزے سے غرض بھی دوسری ہو کہ یہ ثابت ہو کہ یہ کسی کا غلام ہے کہ اس کے حکم پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اگر کہو کہ بعض نصوص کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے میں شہوت کا انکسار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حکمت ہے اور میں اس کے حکمت ہونے کی نفی نہیں کرتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ امور علت نہیں ہیں جن پر نفیا اور اثباتاً مدار حکم ہو حکمت وہ ہے کہ حکم پر مرتب ہو اور علت وہ ہے کہ اس پر حکم مرتب ہو تو نماز روزے کا وجوب اس کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ وجوب محض خدا کے حکم سے ہوا اس پر یہ حکمتیں مرتب ہوئیں اور اگر کوئی امر علت بھی ہو تو جب موجب نے خود اس کو متعین نہیں فرمایا تو ہماری کیا مجال ہے۔

کسی بزرگ سے پوچھا کہ معراج میں خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کیا باتیں ہوئی تھیں انھوں نے جواب میں فرمایا کہ۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان ٭ بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کسے ایسا دماغ ہے جو مالی سے پوچھے بلبل نے کیا کہا کہ پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا۔)

حقیقت میں ہمارا کیا منصب ہے کہ ہم پوچھیں کہ اس حکم کی کیا علت ہے اور اس کی کیا حکمت ہے بانیانِ قوانین سے عام رعایا کو ہرگز یہ مجال نہیں کہ کسی ایک قانون کی وجہ بھی دریافت کرلیں تو خدا تعالیٰ سے باز پرس کرنے کی کیونکر اجازت ہوگی۔ البتہ اگر کوئی مشیر قانون ہو تو اس کو ایسی اجازت ہے تو اگر ہم کو کوئی سارٹیفکیٹ خدا تعالیٰ کے ہاں سے مل گیا ہو تو پیش کریں

کتنی غضب کی بات ہے کہ یہ معترض ایک سلطنت دنیوی کا ممبر تو نہ بن سکے اور خدا کی حکومت میں دخیل ہو جائے۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کو تو پارلیمنٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پس ہمارا تو مذہب یہ ہونا چاہیئے کہ ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو
نیگیختن علت از کار تو

(آپ کا ذکر کرنا چاہیئے نہ آپ کے کاموں کی علت)

دیکھئے خدا تعالیٰ کے تو بہت سے حقوق ہیں۔ حاکم ہونے کا بھی محبوب ہونے کا بھی۔ فرض کیجئے اگر کسی بازاری عورت سے پوری محبت ہو جائے اور وہ بے ڈھنگے ہی حکم کرے تو ان کو نہایت خوشی سے پورا کرو گے یا نہیں تو اگر خدا تعالیٰ کی طلب ہی نہیں تب تو ایسے لوگوں سے گفتگو ہی نہیں ورنہ یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو　　در بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو　　ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر مجھے زندہ کیجئے تو آپ کی عطا ہے اگر مجھے مار ڈالئے تو میں آپ پر قربان ہوں بہرحال روح کو آپ سے تعلق ہے جو چاہیں کر سکتے ہیں)

آج کل لوگوں کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے کچھ بھی محبت ان کو نہیں ہے اگر محبت ہوتی تو کیا اتنا بھی نہ کیا جاتا جتنا ایک بازاری عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلےٰ کے تعلق سے کم کیسے ہو سکتا ہے اس کے عشق میں سراپا ذلت بنجانا بہتر ہے)

بہرحال محبت کی رو سے دیکھئے یا حکومت کی رو سے دیکھئے ہر طرح سر تسلیم خم کر دینا واجب ہے۔ بعض لوگوں کو تو اس طرح ترقی ہوئی اور بعض لوگ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوئے۔ یعنی وہ نماز روزے میں شبہات

نکالتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ روزہ ہے تو اچھی چیز لیکن فروری کے مہینے میں ہونا چاہیئے تھا گویا آپ نے خدا تعالےٰ کو یہ رائے دی۔ افسوس اول تو ہم کو رائے دینے کا حق کیا ہے دوسرے رائے بھی مہمل کیونکہ فروری میں سردی تمہارے ملک میں ہوتی ہے نہ کہ سارے عالم میں خدا تعالےٰ کی کیا عجب حکمت ہے کہ سارے عالم کو مساوی حالت میں رکھا کہ ایک سال ہندوستان میں سردی میں ہے تو دوسرے ممالک میں گرمی میں ہے اور اگر دوسرے ممالک میں سردی میں ہے تو ہندوستان میں گرمی میں ہے تو اس میں سب کا اوسط برابر ہوگیا جو عین عدل ہے بعض لوگوں نے ایک اور شبہ نکالا ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں نماز روزہ کیسے کریں گے۔ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ احکام خداوندی کی عظمت نہیں۔ دیکھئے قوانین حکومت میں کبھی آپ کو یہ شبہ نہ ہوا کہ ڈاکخانہ کا ۔ر کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ نہ ہوگا اور اگر عہ کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ ہو جائے گا۔ جو لوگ اس کا راز جانتے ہیں ان کو تو چھوڑیئے جو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی کبھی شبہ نہیں ہوتا اور اگر شبہ کریں تو احمق بنائے جائیں اور سب اُن کو ہنسیں اور یہ ہی جواب دیں کہ قانون یہی ہے۔ جب یہی جواب ہے تو اگر کوئی مولوی بھی آپ کے لغو سوالات کا یہی جواب دے کہ قانون یہی ہے تو وہ جواب زبردستی پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور اس کو قابل سماعت کیوں نہیں سمجھا جاتا اور علماء کو کیوں متعصب کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون شریعت کی عظمت دل میں نہیں اور قانون حکومت کی عظمت دل میں ہے اور جب قانون شریعت کی عظمت نہیں تو پھر

کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ تو ایسے شبہات، اسی وقت دل میں آتے ہیں جب عظمت نہ ہو۔ ایسا ہی یہ شبہ بھی ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہو تو وہاں کیونکر نماز پڑھیں اور کیسے روزہ رکھیں مجھے اس پر ایک واقعہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا۔ ایک مرتبہ وہ ریل میں انٹر میں سفر کر رہے تھے اور برابر کے درجہ میں چند نوجوان آکر بیٹھے جو وضع سے انگریزی طالب علم معلوم ہوتے تھے اُن کے قبل سے ایک معمر شخص سوار تھے جو صورت سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور کسی ضرورت سے اس وقت اُتر گئے تھے ان نوجوانوں نے ان بیچارے کا اسباب منتشر کر کے اپنا سامان رکھ دیا وہ مولوی صاحب جو آئے اور معلوم ہوا تو اُن پر بہت ملامت کی کہ آپ لوگوں کو اس تحکم کا کیا حق تھا۔ غرض یہ سب شرمندہ ہوئے اور براہِ شرارت یہ چاہا کہ ان مولوی صاحب کو بھی کسی بات میں شرمندہ کریں۔ اتنے میں مولوی صاحب نماز پڑھنے لگے تو ان کو ایک بات ہاتھ آئی بعد فراغ ان میں سے بعض نے ان مولوی صاحب سے کہا کہ کیا ہم آپ سے کچھ دریافت کر سکتے ہیں۔ آجکل کی تہذیب میں یہ بھی لازم ہے کہ اگر کچھ پوچھے تو اول اجازت لے۔ چنانچہ ان مولوی صاحب نے اجازت دی اس پر ان لڑکوں نے یہ سوال کیا کہ مولوی صاحب، نماز فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ کہنے لگے کتنے وقت کی فرض ہے مولوی صاحب نے کہا پانچ وقت کی۔ کہنے لگے سب پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں ہر مکلف پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ کہنے لگے سب جگہ فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ اس پر کہنے لگے کہ کیوں؟ جس مقام پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں بھی نماز پانچ ہی وقت فرض ہے اگر یہ ہے تو سال بھر میں پانچ ہی نماز فرض ہوئیں۔ مولوی صاحب

نے ایک نہایت دانائی کا جواب دیا۔ کہ تم لوگ وہاں سے آرہے ہو یا وہاں
جانے کا قصد ہے کہنے لگے کہ صاحب! نہ آرہے ہیں نہ جانے کا قصد ہے۔
مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب دونوں باتیں نہیں تو یہ سوال قبل از وقت
ہے۔ جب اس کی ضرورت پڑے گی اس وقت پوچھنا۔ لیکن ان شریروں
نے اس جواب کی قدر نہ کی بلکہ سب ہنس پڑے۔ اور ان مولوی صاحب کو
شرمندہ کرنا چاہا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص پختہ عمر کے بھی بیٹھے
تھے جو وضع سے کوئی معزز اہلکار معلوم ہوتے تھے وہ بھی ہنسنے میں
شریک تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب کو ان صاحب پر نہایت غصہ آیا کہ یہ
تو لڑکے بھی نہیں ان کو کیا شامت سوار ہوئی۔ غرض کوئی اسٹیشن آیا
مولوی صاحب اپنے درجے سے ان کے درجے میں پہونچے مگر وہ لڑکے
تو اتر گئے اور وہ صاحب موجود رہے۔ انھوں نے نماز کے لئے وضو کیا
تب تو مولوی صاحب کو زیادہ غصہ آیا کہ ماشاء اللہ نمازی ہو کر ان کی
یہ حالت ہے مولوی صاحب نے ان سے عہدہ اور فرائض عہدہ دریافت
کرکے پوچھا کہ آپ کے ذمہ دن رات میں کتنے گھنٹے کام کرنا ہے۔ انھوں
نے مثلاً چھ گھنٹہ بتلایا مولانا نے کہا کہ اگر ایسے مقام پر جہاں چھ مہینہ
کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے گورنمنٹ کی حکومت ہو جائے اور
آپ کی وہاں بدلی ہو جائے تو کیا وہاں بھی رات دن میں چھ گھنٹے کام کرنا ہوگا
تو سال بھر میں چھ گھنٹے کام کرنا پڑا اس کا حساب کس طرح ہوگا۔ کہنے لگے
اندازہ کرلیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ افسوس دنیوی حکومت کے
قانون پر جو اشکال وارد ہو اس کی توجیہ تو اس طرح آسانی سے ہو سکتی ہے
اور یہی توجیہ اس اشکال میں نہ ہو سکی بلکہ اُس پر تمسخر کرتے ہوئے شرم نہیں
آتی بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ کی۔ غرض اس قسم کے شبہات ہونے لگے ہیں۔
ایک صاحب کہنے لگے کہ شب قدر میں فضیلت ہے تو کہاں کی شب قدر میں۔ ہندوستان کی یا لندن

کی. کیونکہ غروب ہر جگہ کا مختلف ہے. مولانا احمد حسن صاحب نے خوب جواب فرمایا کہ بعض مواسم میں کچہری دس بجے ہوتی ہے تو کہاں کے دس بجے مراد ہوتے ہیں ہندوستان کے یا لندن کے جو جواب اس کا ہے وہی اُس کا ہے کہ ہر جگہ کی شب قدر میں فضیلت ہے خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے. جب یہاں غروب ہو یہاں کیلئے. جب وہاں غروب ہو وہاں کیلئے. یہ دو چار مثالیں نمونے کے طور پر بیان کر دی ہیں. اس قسم کے لغو شبہات بہت سے ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ احکام شریعت کی عظمت دلوں میں نہیں رہی اور وجہ دوسری یہ کہ ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ انسان جس چیز کو ضروری سمجھا کرتا ہے اس میں شبہات نہیں نکالا کرتا مثلاً اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جاوے اور وہ نسخہ لکھ کر دے اور مرض سخت ہو تو اعتماد کے بعد یہ سوال نہیں کرتا کہ آپ نے فلاں دوا کیوں لکھی یا فلاں دوا کا یہ وزن کیوں لکھا اس کا دونا یا نصف کیوں نہیں لکھا کیونکہ جانتا ہے کہ اگر ذرا بھی بے ڈھنگا کیا تو حکیم صاحب خفا ہو کر مطب سے نکال دیں گے اور نسخہ بھی نہ دیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ میں مروں گا۔ اگر شریعت کو بھی ضروری سمجھتے تو احکام کے بتلانے والوں کا وجود غنیمت سمجھتے جیسے طبیب کا وجود غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اگر نسخہ پینا ہی نہ ہو تو اس میں جتنے چاہیں عیب نکال دیتے ہیں۔ صاحبو! واللہ اگر دین کی طلب ہوتی تو غنیمت سمجھتے کہ احکام کے معلوم ہونے کے ذرائع موجود ہیں مگر چونکہ کام کرنا نہیں ہے اس لئے طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور انواع انواع کے بے ڈھنگے سوالات کئے جاتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی میں نے کہا کہ تمہاری ناک منہ پر کیوں لگی ہے گدّی پر کیوں نہ لگی کہنے لگے کہ گدّی پر اگر لگتی تو بُری لگتی میں نے کہا کہ بُری تو جب لگتی کہ صرف تمہاری ناک گدّی پر ہوتی اور اگر سب کی گدّی پر ہوتی تو ہرگز بُری نہ لگتی تو کیا وجہ کہ سب کے ناک گدّی پر کیوں نہیں لگی میں کہتا ہوں کہ اول اپنی خبر لیجئے اس کے بعد نماز وغیرہ تک نوبت آئے گی۔ بہت بہتر ہے کہ انسان

اپنی دنیا کی تحقیقات میں لگے دین کی تحقیق ہو چکی ہے اس پر عمل کافی ہے دوسرے جب تیرہ سو برس کی تحقیق آپ کے نزدیک غلط ثابت ہوئی تو تیرہ منٹ کی تحقیق کیوں کر صحیح یقینی ہے۔ صاحبو! سلامتی کی بات یہ ہی ہے کہ شاہرہ پر چل کر سیکڑوں پار ہو گئے اس کو چھوڑ کر ایک غیر مجرب پگڈنڈی کو اختیار نہ کرو نیز کیا آپ سے قبل کوئی عاقل اور ہمدردانِ اسلام ہوا ہی نہیں۔ کیا ابوبکرؓ و عمرؓ کو دین کا کچھ درد ہی نہ تھا اور کیا ان کو آپ کے برابر بھی عقل نہیں تھی اور اگر عقل نہ تھی تو کیا وجہ کہ ہرقل اور کسرے تک پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے مصاحبین کی گفتگو کا اثر ہوتا تھا۔ ان کی عقلوں کا اندازہ اس سے کرو کہ ان کے پاس نہ نقشے تھے نہ جغرافیہ اور جب مصر دمشق قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو ان مقامات پر کس طرح قبلہ رُخ نہایت ٹھیک سمت میں مسجدیں بنائیں کہ آج تک آلاتِ ہندسہ سے سب برابر ثابت ہوئیں اور یہ ایک چھوٹی سی بات ہے اس سے بڑی بڑی ہزاروں باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت درجہ عاقل تھے اور بہت بڑے مدبر تھے دیکھئے ملکی انتظام کس طرح کا کیا پھر ان کو وہ شبہات کیوں نہ پیدا ہوئے وہ اتنے مہذب تھے انھوں نے کیوں نمازیں نہ چھوڑیں کیوں روزہ میں ترمیم نہ کی۔ معلوم ہوا کہ اول کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرنا نہایت خطرناک ہے نابینا کے لئے یہ ہی مناسب ہے کہ کسی بینا کے ساتھ ہو لے اور جدھر کو وہ لے چلے اُدھر کو چلے اور اگر کسی موقع پر بینا نے کہا کہ یہاں نالی ہے اور نابینا صاحب لگے دلیل پوچھنے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہاتھ چھوڑ دے گا اور یہ گر کر مریں گے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ یہ ترمیمیں جو پیش کی جاتی ہیں ان سے غرض کیا ہے آیا دنیا کا فائدہ یا دین کا سو ظاہر ہے کہ دین کا تو کوئی فائدہ نہیں ہاں

دنیا کا فائدہ ہے کہ نماز پڑھنے سے بچیں گے پھر وہ نہ رہے گا تو آزادی نصیب ہو گی سود حلال ہو جائے گا تو مال میں ترقی ہو گی ہر مسئلہ طویل الذیل ہے میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر فرضاً مصلحت نکل سکتی تو صرف یہ ہی نکل سکتی ہے اور فرضاً اس لئے کہا کہ ہنوز اس میں بھی کلام ہے کہ ان کو مصلحت کہنا بھی درست ہے یا نہیں لیکن اگر مان بھی لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ مصالح تو بغیر دین میں کلام کئے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مال میں ترقی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ سود کو حرام سمجھا جائے اور پھر اس کا مرتکب ہو اجائے کیونکہ ترقی تو فقط سود لینے سے ہے نہ کہ سود کے حلال کہنے سے تو اگر برباد ہی ہوتا ہے تو سود ہی لو سود کو حلال تو نہ کرو کہ ایمان بھی جاتا رہے اور سود لینے سے تو فقط تم گنہگار رہو گے آئندہ نسلیں تو ایمان سے خارج نہ ہوں گی۔ برخلاف اس کے کہ اگر سود کو حلال کہا تو تم بھی ایمان سے خارج ہوئے اور آئندہ نسلیں بھی۔ علیٰ ہذا پردے سے گھبرانا سو اول تو یہ عجیب بات ہے کہ پردے میں رہیں تو عورتیں اور جی گھبرائے مردوں کا خیر اگر تمہارے نزدیک پردے کا توڑ دینا ہی مصلحت ہے تو پردے کو واجب سمجھ کر ہی توڑ دو بے پردگی کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو جائے گا اور تمہارے نزدیک اس واسطے کہا کہ واقع میں پردے کا توڑنا ہرگز مصلحت نہیں ہو سکتا اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ صاحب جب طبائع میں فساد ہوتا ہے تو پردے میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے سو یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے۔ واقع میں جو کچھ خرابیاں وہ بے پردگی یا ادھورے پردے کی وجہ سے ہوئیں۔ بھلا کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مرد کبھی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور عورت کبھی اجنبی مرد کو نہ دیکھے اور پھر ان میں کسی قسم کا فساد ہو سکے اور جب ذرا سی بے پردگی اتنے

فساد ہوئے تو پوری بے پردگی میں جتنے فساد ہوں کم ہیں اسی طرح اگر نماز کو چھوڑنا ہی ہے تو فرض سمجھ کر بھی تو چھوڑا جا سکتا ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ فرضیت سے انکار کر کے ایمان بھی برباد کر لو۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر سود کو حلال نہ سمجھیں تو قوم ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ حرام سمجھنے کی صورت میں کم لوگ سود لیں گے میں نے کہا کہ اول تو آپ کو دوسروں کی کیا فکر دوسرے حلال کہہ کر بھی تمام قوم ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ جو مسلمان قوت ایمان سے سود کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ تمہارے یا مولویوں کے کہدینے سے بھی کبھی نہ لیں گے بلکہ یوں کہیں گے علماء بگڑ گئے تو حلال کہہ کر بھی سود خواروں کی تعداد دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

ایک صاحب نے قربانی پر اعتراض کیا کہ اس سے کیا فائدہ کہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبا دیا اور وجہ اس فساد کی یہ ہے کہ اپنے خیال میں احکام کا ایک مبنیٰ تراش کیا ہے مثلاً قربانی کا مبنیٰ یہ تراش لیا ہے کہ مساکین کو نفع ہو اور چونکہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبانے سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اس لئے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب صرف اس قدر کافی ہے کہ۔ ع۔ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا ست۔ میں بیان کرتا ہوں کہ اگر قربانی کر کے ایک حبہ گوشت کا بھی کسی کو نہ دو تو قربانی کا ثواب ملتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مقصود قربانی کا نہیں کہ لوگوں کو نفع ہو ورنہ صرف ذبح کرنے سے کیوں ثواب ملتا اب رہی یہ بات کہ پھر کیا حکمت ہے تو حکمت یہ ہے کہ بندے کو بحیثیت محب ہونے کے یہ مناسب تھا کہ اپنی جان فدا کرتا اس کا بدل خدا تعالیٰ نے یہ مقرر فرمایا کہ ایک پیارے جانور کو ذبح کر دو اور دلیل تاریخی اس کی یہ ہے کہ اول ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم ہوا تھا کہ ہماری راہ میں بیٹے کو ذبح کرو۔

بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہوتا ہے تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جان جان مانگی گئی تھی اسی کو قرآن شریف میں فرماتے ہیں سُنَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ (تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) تو مقصود یہ تھا کہ اپنی جان دی جائے مگر اس کا بدلہ یہ مقرر فرمادیا کہ جانور کو ذبح کردو۔ اور محبت ایسی چیز ہے کہ موقع پر لوگوں نے اپنی جانیں بھی قربان کردی ہیں ایک وکیل صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بزرگ صاحب حال جن کو لوگ مسخرا سمجھا کرتے تھے حج کرنے کے لئے گئے جب خانۂ کعبہ کے سامنے پہونچے تو مطوف کی زبان سے یہ نکلا کہ یہ کعبہ ہے اُس وقت اُن پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنّا

(جب محبوب کے کوچہ میں جاؤ تو جان مضطر کو حاضر کردو ہوسکتا ہے دوبارہ اس تمنا کو نہ پہونچ سکو۔)

یہ کہتے ہی ایک چیخ ماری اور جاں بحق ہوگئے اور سیکڑوں اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ ایسے اوقات میں ان کی جان نکل گئی۔ حضرت نجم الدین کبریٰ کی حکایت ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ پڑھ دیا۔ جان بدہ و جاں بدہ وجاں بدہ۔ آپ نے فرمایا کہ محبوب جان طلب کر رہا ہے مگر افسوس کوئی جان دینے والا نہیں اور پھر فرمایا کہ جاں دادم وجاں دادم وجاں دادم۔ اور یہ کہتے ہی جان نکل گئی۔ لیکن پھر بھی ایسے لوگ بہت کم ہیں فرماتے ہیں۔ وَلَوۡ اَنَّا کَتَبۡنَا عَلَیۡھِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ دِیَارِکُمۡ مَّا فَعَلُوۡہُ اِلَّا قَلِیۡلٌ مِّنۡھُمۡ (اگر ہم ان پر

یہ فرض کر دیتے کہ تم اپنی جان مار لو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو تھوڑے ہی لوگوں نے ایسا کیا) اور اگر سب کے سب ایسے ہی ہوتے بھی تو ایک سال میں سب کے سب ختم ہو جاتے یہ تو رحمت ہے کہ اگر خیر جانور ہی دیدو تو وہ بھی کافی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ جانور عزیز ہو۔ حدیث میں ہے سمنوا ضَحَایَاکُمْ فَاِنَّھَا عَلَی الصِّرَاطِ مَطَایَاکُمْ (تم موٹی تازہ قربانی کیا کرو صراط مستقیم پر یہ ہی تمہاری سواریاں ہوں گی) حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جب سورۂ بقرہ ختم کی تو ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھی۔ الحاصل یہ معلوم ہو گیا کہ حکمت قربانی کی وہ نہیں ہے جو کہ اس وقت لوگوں نے تراش رکھی ہے بلکہ یہ حکمت ہے اور یہ بھی ہم نے تبرعاً بتلا دیا ورنہ اصل مسلک ہمارا یہ ہے کہ ؎

حدیث از مطرب دمے گو وَ رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

ساقی شراب کی بات کرو گردش ایام کو کچھ نہ کہو اس معمّے کو نہ کوئی کھول سکا نہ کھول سکے گا۔

خدا تعالےٰ کے اسرار کا احاطہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور جب ضرورت ثابت ہو گئی تو ہم کو حکمت یا اسرار کے دیکھنے اور بتلانے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہرحال دین میں اختراع نہ کرو۔ بلکہ علم کی تکمیل کرو یا علماء کی تقلید کرو اور بدون ان دونوں باتوں کے ہمارا مذہب اور دین بالکل ڈانواں ڈول ہے۔ بالخصوص اس آزادی کے زمانے میں اسی ضرورت علم دین کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ اس میں مختلف تفسیریں ہیں میرے خیال میں حکمت سے مراد علوم اجتہادیہ اور کتاب سے مراد علوم منصوصہ۔ اور میں اس وقت

اس کی تفصیل نہیں کرتا۔ مگر اس وقت کے رفع اغلاط کے لئے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ اجتہاد ہر شخص کا معتبر نہیں بلکہ اس کا اجتہاد معتبر ہے جس میں سامان اجتہاد بھی ہو اور یہ طے ہو گیا ہے کہ ہم میں قوتِ اجتہادیہ نہیں ہے۔ اس کے لئے میں ایک مسئلہ مثال کے لئے عرض کرتا ہوں اس سے پورے طور پر سمجھ میں آجائے گا کہ ہم میں قوتِ اجتہادیہ بالکل نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو شخص جنگل میں ہوں اور ایک کو غسل کی ضرورت ہو اور دوسرے کو وضو کی ضرورت ہو اور پانی وہاں ہو نہیں اس لئے دونوں نے تیمم کیا اور یہ دونوں شخص جمیع صفاتِ علمیہ و عملیہ میں مساوی ہوں سوائے اس تفاوتِ مذکور کے تو اگرچہ امامت دونوں کی جائز ہے لیکن گفتگو اس میں ہے کہ افضل کس کی امامت ہے سو ہمارے اجتہاد سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کو وضو کی ضرورت ہے اس کی امامت افضل ہے کیونکہ اس میں حدث اصغر تھا اور اس لئے نجاست حکمی اس میں کم تھی اور طہارت میں دونوں برابر ہوئے تو وضو والے کی طہارت اکمل ہوئی مگر فقہا کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حکم برعکس ہے اور وجہ یہ ہے کہ تیمم خلیفہ ہے غسل اور وضو کا اور غسل افضل ہے وضو سے تو افضل کا خلیفہ بھی افضل ہوگا تو غسل کا تیمم افضل ہوگا وضو کے تیمم سے۔ اب دیکھئے فقہائے متاخرین کا یہ اجتہاد ہے مگر ہم اس تک بھی نہ پہونچ سکے کیونکہ اجتہاد محض پڑھنے سے نہیں ہوتا بلکہ احادیث کے جمع کرنے اور تعمق پر عبور ہونے اور اس کے بعد تقویٰ و طہارت کے حاصل ہونے سے ایک خاص ملکہ ہوتا ہے اور جب ہم میں یہ سب باتیں نہیں تو ہم کو سوائے تقلید کے چارہ نہیں۔

اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ مسلمانوں میں علم کیونکر عام ہو،

کیونکہ یہ تو بہت مشکل ہے کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں آج کل لوگ اس سے بھی گھبراتے ہیں کہ علماء اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں سو میں کہتا ہوں کہ ہم سب کو مولوی نہیں بناتے بلکہ اگر سب بنیں بھی تو ہم روک دیں کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں ہمت اور قناعت اور دانائی اور ورع نہ ہو ان کو مقتدار بنا دینے سے بہت سی خرابیاں دین میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ہمت سے مراد دین کی ہمت ہے نہ کہ دنیا کمانے کی ہمت۔ اور ایسے ہی طماع لوگ ہیں جنھوں نے دنیا داروں کے سامنے دست طمع دراز کر کے اکثر لوگوں کو علم دین سے متنفر کر دیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علم دین کا ثمرہ یہ ہوتا ہے تو اگر ہماری اولاد پڑھے گی تو ان میں بھی یہ ہی باتیں پیدا ہوں گی لہذا ایسے لوگوں کو ہم ہرگز مولوی ہونے کی رائے نہ دیں گے۔ بلکہ مولوی ہونا اور خدمت دین اس کا کام ہے جس کی یہ حالت ہو ؎

اے دل آن بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل شراب گلگوں سے خراب رہ اور بے مال و دولت
قارون کی سینکڑوں عزت پر بھاری رہ)

یہ تو مال میں اس کی حالت ہو اور جاہ میں یہ حالت ہو کہ ؎

در رہ منزل لیلی کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(لیلی کے گھر جانے کے راستے میں جان پر بڑے خطرے ہیں۔
تو اولین شرط یہ ہی ہے کہ مجنوں بن جاؤ)

اور یہ حالت ہو کہ صرف ایک کا طالب ہو ؎

دلا رامے کہ داری دل درد بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر محبوب رکھتے ہو تو دل اس سے بند رکھو اور تمام دنیا سے آنکھ بند رکھو اور یہ حالت ہو کہ عاشقاں را مذہب و ملت جدا است ۔ اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ سب کے سب ایسے کہاں ہیں تو اگر سب کو مولوی بنایا جاوے تو کس قدر خرابیاں پیدا ہوں ۔

میں نے ایک استفتاء دیکھا کہ اس میں ایک مولوی صاحب نے ساس کو حلال کر دیا تھا اور کیونکر چالاکی سے یعنی یہ لکھا کہ اس شخص کی بیوی بوجہ جہالت کلماتِ کفر و شرک میں ہمیشہ سے مبتلا ہے اس لئے اس کا نکاح اس مسلمان سے صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح نہیں ہوا تو ساس ساس نہ ہوئی اور حرمتِ مصاہرۃ حنفیہ کا مذہب ہے ہم پر حجت نہیں پس بیوی کو چھوڑ کر ساس سے نکاح درست ہے خوب کہا ہے ؎

بدگہر را علم و فن آموختن
دادنِ تیغست دست راہزن

بے اصل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے ۔ تو اگر اس مذاق کے لوگ مقتدا بنیں گے تو کیا کچھ خرابیاں ہوں گی ۔ اس لئے مولویت کے لئے انتخاب صحیح ہونا چاہیئے سو آپ بھی اپنے بچوں میں سے انتخاب کیجئے اور اگر کہو کہ دیہاتی یا غریب لوگ تو پڑھ رہے ہیں تو سمجھو کہ وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ آپ کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اس لئے وہ آپ کی اصلاح نہیں کر سکتے ۔ لہذا شہر والوں کے لئے شہر والے اور گاؤں والوں کے لئے گاؤں والے مولوی ہونے چاہئیں اور غرباء کے لئے غرباء اور امراء کے لئے امراء کیونکہ غرباء کی وقعت امراء کی نظر میں نہیں دوسرے

اپنے کام میں لگے ہیں اس لئے بھی امرار کو توجہ کرنا نہایت ضروری ہے یہ اپنی اولاد میں سے منتخب کریں لیکن خدا کے لئے ایسا انتخاب نہ کیجئے جیسا کہ اب تک کیا ہے کہ اولاد میں جو سب سے زیادہ بیوقوف ہوا اس کو عربی پر متوجہ کر دیا۔ بلکہ زیادہ فطین زیادہ ذکی ہو اس کو عربی کے لئے انتخاب کیجئے اور اس کے اخلاق درست کیجئے اس میں تواضع پیدا کیجئے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اپنے سے جُدا کر کے کسی صاحب دل کے پاس بھیجدیجئے۔ چند روز بھی اگر وہاں رہے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ انسانیت آجائے گی اس کے بغیر انسانیت نہیں آتی دیکھئے انگریز اپنے بچوں کو کتنی تھوڑی عمر سے جدا کر دیتے ہیں۔

ایک بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے اپنے لڑکے کو کسی معلم کے سپرد کیا۔ ایک روز دیکھا کہ معلم صاحب گھوڑے پر سوار ہیں اور شہزادہ سائیس کے مثل پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے بادشاہ کو یہ دیکھ کر سخت ناگوار ہوا لیکن ضبط کر کے معلم سے بہ آہستگی دریافت کیا معلم نے کہا کہ حضور چند روز میں یہ بادشاہ ہوگا مخلوق اس کی جلو میں ہوگی اگر اس وقت پیدل نہ دوڑیگا تو اس وقت کیسے خبر ہوگی کہ پیدل دوڑنے والوں پر کیا گذر رہی ہے۔ اس لئے میں نے اس کو دوڑایا کہ یہ اپنی حالت یاد کر کے دوسروں پر رحم کرے۔ تو یہ برتاؤ باپ نہیں کرسکتا اور استاذ کرسکتا ہے مگر ایسے استاذ نہیں جیسے آجکل کے استاذ ہیں ظالم اور قصائی جن میں شفقت نام کو نہیں۔ میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ چار برس سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوگی اور لڑکے اس کو ڈنڈا ڈولی کئے لا رہے ہیں۔

ع　پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

افسوس ہے کہ اکثر بچے انہی ذابحین کے قبضے میں آتے ہیں اور وہ تباہ برباد ہوتے ہیں کہ ان کے برتاؤ سے تو طبیعت کُند ہو جاتی ہے

یا پڑھنا چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ حافظ جی ۔ ہڈی ہماری چمڑہ تمہارا۔ صاحبو! استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مربی ہو۔ اور اگر ایسا نہ کرسکے تو وہ استاذ بننے کے قابل نہیں۔ تو ایک طرف تربیت ہو ایک طرف تعلیم۔ پھر دیکھئے کہ یہ شخص کس شان کا نکلتا ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لڑکوں کو علوم دینیہ پڑھا جائے تو یہ لوگ کھائیں گے۔ کہاں سے ؟ تو اول تو امرار کو یہ سوال ہی کرنا نہ چاہیئے اور غربار کے لئے ساری قوم کو ادھر متوجہ ہو کر اس کے لئے سرمایہ جمع کرنا چاہیئے کہ ان کی خدمت کریں ۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر بچپن سے امارت میں گذرے تو ان کو روز اول ہی سے استغنار کی عادت ہو جائے بڑے ہو کر حرص وغیرہ نہیں پیدا ہوتی اور اگر اول ہی سے سوال اور ذلت کا خوگر ہو جیسا آج کل قوم کی بے توجہی سے ہو رہا ہے تو بڑے ہو کر وہی عادت رہے گی۔ پس آجکل جو اکثر طلبہ پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ واقع میں اپنے اوپر الزام ہے کیوں یہ نہیں کیا جاتا کہ قوم طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح رکھے مثلاً جس کے چار بچے ہیں وہ ایک طالب کو ملا کر پانچ سمجھے اور اس طالب علم کی ہر طرح امداد کیا کرے۔ عالمگیر نے یہ کیا تھا تو ایک جماعت کی جماعت جو پریشانی میں مبتلا تھی کیسے آرام سے فارغ ہوئی اور انھوں نے کتنے بڑے بڑے کام کئے لیکن چونکہ عالمگیر رحمدلی کے ساتھ مدبر بھی تھے ترکیب یہ کی تھی کہ طالب علموں کو جو پریشان دیکھا اور بیت المال کو بار سے بچانا چاہا تو صورت یہ کی کہ ایک امیر دربار سے نماز کے فرائض پوچھے تو وہ بالکل کورے تھے۔ عالمگیر نے اس کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اتنے طالب علم شہر میں ہیں تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے تھوڑی دیر مسائل سیکھ لیا کرو۔ پھر کیا تھا ہر شخص طالب علموں کا طالب ہو گیا اور اس طرح سب طالب علم ولباس و تنخواہ

سے بے فکر ہو گئے مگر یہ سب حکومت کے بدولت تھا کہ حکومت عجیب چیز ہے۔ مگر اب اتفاق باہمی بھی اس سے زیادہ عجیب کام کر سکتا ہے جب اس کی ضرورت ثابت ہو چکی ہے تو ضرور اس پر توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ تدبیر تو مولوی بنانے کی تھی۔ اب رہے وہ لوگ جو کہ مولوی نہ ہوں ان کے لئے ضروریات کی تعلیم ہونی چاہیئے خواہ اردو میں ہو یا عربی میں مگر انگریزی کے قبل ہو کیونکہ پائدار اثر نقش اول کا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ کھولتے ہی انگریزی میں ان کو لگا دیا جائے۔ تو اول تو قرآن شریف پڑھاؤ اگر پورا نہ ہو تو دس[1] سیپارے ہی سہی اور اس کے ساتھ ہی اس کے روزانہ تلاوت کا بھی التزام رکھو اور اس کے بعد کچھ رسالے مسائل دین کے اگرچہ اردو ہی میں ہوں ان کو کسی عالم سے پڑھواؤ اس کے بعد اگر ضرورت معاش مجبور کرے تو انگریزی بھی پڑھاؤ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر دین کے خلاف اس میں کوئی بات پیدا ہو تو فوراً اس کو تنبیہ کرو اور اگر باز نہ آئے تو انگریزی چھڑا دو۔ اب رہے وہ لوگ جو کہ بالکل ہی نہیں پڑھے ان کے لئے یہ ترکیب ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں ہر ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ کسی سے مسائل اور اخلاق کی کتابیں پڑھوا کر ان کو سنوا دیں اور عورتوں کے لئے یہ کیا جائے کہ جو ان میں سے پڑھ سکیں ان کو تو پڑھایا جاوے اور جو نہ پڑھ سکیں ان کو ان کے مرد دینی رسالے سنا دیا کریں۔ اور جن کے مرد پڑھے نہ ہوں وہ خواندہ عورتوں سے سُن لیا کریں۔ اور ساتھ ہی جو مسائل پیش آئیں ان کو مرد بلا واسطہ اور عورتیں

[1] لوگوں کو اپنی حالت پر شرم کرنا چاہیئے کہ حکیم الامت مایوس ہو کر کسقدر تنزل کرکے رائے پیش کرتے ہیں ۱۲ جامع

بواسطہ مردوں کے علماء سے پوچھتی رہیں یہ وہ ترکیب ہے کہ اگر اس پر کاربند ہوا جائے۔ تو چند ہی روز میں ساری جہالت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام قوم میں دین پھیل جائے گا۔ یہ تو علم کے متعلق تھا اب تیسری چیز یشوکی میں عمل ہے اگر وہ نہ ہو تو علم کچھ بھی نہیں تو عمل کی تقسیم یہ ہے کہ ایک تو اعمال ظاہری ہیں اور ایک اعمال باطنی اس وقت جو لوگ عمل کرتے بھی ہیں وہ صرف اعمال ظاہری پر متوجہ ہیں ورنہ باطن کی یہ حالت ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عز و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے کافر کی قبر کی طرح مزین ہو اور نیچے اللہ کا عذاب ہے
اوپر سے بایزید پر طنز کرتے ہو اور اندر سے یزید جیسا
شخص شرماتا ہے)

کیا معنی کہ باطن اکثر لوگوں کا درست نہیں باطن کی درستی ایک تصحیح عقائد ہے جس کو کم وبیش حاصل بھی کیا جاتا ہے۔ دوسرے تہذیب اخلاق جس کو تصوف کہتے ہیں اور وہ بالکل متروک ہے جس کی دو وجہ ہیں ایک تو بے التفاتی اہلِ دنیا کی۔ دوسرے بے عنوانی منتسبین الی التصوف کی یعنی آجکل رسوم کا نام تصوف رکھ چھوڑا ہے۔ حقیقت تصوف کی ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال و افعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ ہے کہ قلب کی حالت درست ہو یعنی ایک تو اخلاق باطنی درست ہوں توکل ہو شکر ہو۔ رذائل کو دور کیا ہو جیسے حبِ دنیا وغیرہ یہ ہے تصوف۔ تو اس وقت لکھے پڑھے بھی صرف ظاہر کو لئے ہوئے اور جنھوں نے باطن کو لیا انھوں نے ظاہر کو چھوڑ دیا تو گویا تقسیم کرلیا

ہے کہ جو ظاہر کو لیں وہ باطن کو چھوڑ دیں اور جو باطن کو لیں وہ ظاہر کو چھوڑ دیں اور بعض نے دونوں کو چھوڑ دیا وہ نہ نماز روزہ کریں نہ تصفیۂ باطن۔ بلکہ حُبِّ دنیا میں حبِ جاہ میں غرق ہیں اور یہ تینوں قسم کے لوگ تصوّف سے بمراحل دور ہیں۔ غرض تصوف اصلاحِ ظاہر و باطن کا نام ہے نہ کہ رسوم کا بلکہ احوال متعارفہ کا نام بھی نہیں۔ یہ احوال اگر نہ بھی ہوں تو نسبت مع اللہ پیدا ہوسکتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں سہولت ہو اور بدوام ذکر پہ توفیق ہو رہی ﷺ رسوم کہ قبر پر کپڑے چڑھانا عرس کرنا کپڑے رنگیں پہننا سماع سننا۔ سو اس کو کوئی تعلق تصوف سے نہیں ہے اور احوال اگرچہ کبھی مقامات پر مترتب ہو جاتے ہیں لیکن وہ تصوف کے اجزاء یا اس کے لوازم نہیں اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر میں کبھی ان کو وجد وغیرہ ہونے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود حاصل ہو گیا اور اگر نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ کچھ فائدہ ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر سے مقصود یہ نہیں بلکہ حقیقی مقصود یہ ہے کہ حکم ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) جس کا ظہور آخرت میں ہوگا اور عاجل مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر سے نسبت مع اللہ ہو جائے اور اس سے سہولت فی الطاعۃ ہو تو یہ ایک غلطی تو متصوفین کو ہوئی دوسری غلطی منکرین کو ہوئی کہ انھوں نے صوفیہ کو خشک دماغ بتلایا حالانکہ وجد وغیرہ کا سبب یہ نہیں اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی اس میں تھوڑا دخل احوالِ طبعیہ کو بھی ہوتا ہے غرض ان کو عین تصوف سمجھنا بھی غلطی ہے اور بالکل مبائن خارج سمجھنا بھی غلطی ہے فیصلہ یہ ہے کہ داخل تو نہیں مگر متعلق ہے۔

اور ایک درستی قلب کی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں اس کو مفصل بیان کر چکا ہوں۔ جس کے اعادے کی ضرورت

نہیں ہاں رہا عمل ظاہر تو وہ ظاہر ہی ہے۔ پس یہ آیت علم و عمل کی تمام شاخوں کو جامع ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے اور وہ یہ اہتمام کریں گے۔ اب آپ کو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ یہ تینوں چیزیں کیسی ضروری ہیں دوسرے یہ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے شفیق تھے کہ ایسی باتیں بتلائیں کہ اگر ان کو چھوڑا جائے تو دین اور دنیا سب بگڑ جائے دین کا بگڑنا تو ظاہر ہے اور دنیا اس لئے کہ مسلمانوں کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہے کہ جب یہ دین چھوڑتے ہیں تو دنیا بھی ان سے رخصت ہو جاتی ہے۔ دوسرے دنیا نام ہے راحت کا اور دین کو چھوڑ کر راحت نصیب نہیں ہوتی۔ تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی بڑی رحمت ہیں تو اب یہ دیکھئے کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق کیا ادا کیا۔ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں ایک یہ کہ آپ کے ساتھ محبت ہو۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی عظمت قلب میں ہو۔ تیسرے یہ کہ آپ کی متابعت کی جائے اس وقت بعض نے عظمت کو تو لیا مگر محبت اور متابعت دونوں کو بالکل چھوڑ دیا تو بعض نے متابعت تو کی مگر محبت اور عظمت کو چھوڑ دیا اور بعض نے محبت وعظمت دونوں کو لیا مگر متابعت چھوڑ دی۔ میں نے اس مضمون کو القاسم میں لکھدیا ہے یہ ایک ماہواری رسالہ ہے جو کہ بہت ہی مفید ہے۔ میں یہ بھی رائے دیتا ہوں کہ لوگ اس کو خریدیں اس میں اختلافی مسائل نہیں ہیں بلکہ محض متفق علیہ اصلاح ہے۔ بہرحال یہ حقوق ہیں آپؐ کے۔ اور آپ اللہ کی بڑی نعمت ہیں اور نعمت کی قدر یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کریں اور وہ ابھی مذکور ہوئے ہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور خدا تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو توفیق نیک عطا فرمائیں آمین ؂

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

وعظ چہارم ملقب بہ

طریق القرب

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

وعظ چہارم ملقب بہ

طریق القرب

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
قصبہ قنوج مسجد جامع	۱۰ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ یوم جمعہ	سوا دو گھنٹہ	بیٹھ کر	طریق قرب حق	مولوی سعید احمد صاحب	پانچ سو	عوام اہل شہر کا مجمع زیادہ تھا اور اہل حدیث بھی تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ

وَسَلَّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَمَا اَمْوَالُکُمْ وَلَا اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَھُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ۔

(باری تعالیٰ فرماتے ہیں۔ تمہارے مال اولاد مجھ سے قریب نہیں ہو سکتے بلکہ قریب وہ ہے جو ایمان لایا اور اچھے کام کئے ان کے لئے کرنے کا دگنا بدلہ ہے وہ بہترین کمروں میں پناہ گزیں ہوں گے)

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے اس میں خدا تعالےٰ نے اپنی بندوں کی ایک بڑی دولت کا پتہ اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا ہے اور جو غلطیاں ان سے واقع ہوگئی ہیں ان پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت کے ترجمہ سے اس دولت کا پتہ چل جاوے گا۔ مگر اول مجملاً اس کا پتہ بتلاتا ہوں کیونکہ بہت لوگ اس کو سمجھتے ہیں اور اہلِ دنیا تو کیا سمجھتے اکثر اہلِ دین بھی اس پر نظر کم کرتے ہیں اور وہ دولت قربِ خداوندی ہے اور وہی اس آیت میں مذکور ہے اور اس قرب کی حقیقت عنقریب معلوم ہو گی اس لئے کہ وہاں قرب جسمانی تو ہے نہیں کہ فاصلہ کم ہو جائے کیونکہ یہ خواص جسم سے ہے باقی جو چیزیں مادی نہیں ہیں اگرچہ حادث اور ممکن ہوں ان میں بھی یہ قرب متصور نہیں ہے تو جو ذات پاک امکان اور حدوث سے بھی منزہ ہے اس میں یہ قرب کیونکر متصور ہو سکتا ہے۔ اور یہاں سے ان عوام الناس کی غلطی معلوم ہو گئی ہو گی جو خواص کی صورت میں ہیں اور خواص سے علماء مراد نہیں

کیونکہ وہ ایسی غلطیوں سے محفوظ ہیں بلکہ مشائخ اور صوفیہ مراد ہیں تو جو لوگ ان حضرات کی صورت بناتے ہیں اور حقیقت میں وہ عامی ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرب خداوندی بھی قرب جسمانی ہے اور اس کا پتہ ان کی مثالوں سے چلتا ہے اور اگر محققین سے اس قسم کی کوئی مثال منقول ہو تو ہم اس میں تاویل کریں گے لیکن یہ عوام اس قسم کے اقوال میں تاویل بھی نہیں کرتے بلکہ ان کی ظاہری متبادر معنی مراد لیتے ہیں اور اس قسم کے اقوال بولنے والے بعض تو وہ ہیں کہ خدا کو دریا اور اپنے کو موج کے ساتھ تشبیہ دیتے اور بعض لوگ قطرہ اور دریا کی تشبیہ دیتے ہیں تو اگر تشبیہات کسی معتبر کلام میں پائے جائیں گے تو ہم اس کی تاویل کریں گے کیونکہ محض تشبیہ پر انکار کرنا تو غلو ہے۔ قرآن شریف میں خود تشبیہ موجود ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ ۔

(اللہ تعالےٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا
اس نور (ہدایت) کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو)
ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا ہے اور)
وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل ایک
طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف)
ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو)

اس میں تصریح ہے کہ نور خداوندی کی صفت ایسی ہے جیسے کہ ایک طاقچہ ہو کہ اس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو اور اس شیشہ کی یہ حالت ہو جیسے کہ ایک درخشاں ستارہ الیٰ آخر القول۔ پس جب قرآن میں خود تصریح تشبیہ کی ہے تو

اگر مطلق تشبیہ مذموم ہوتی تو قرآن میں یہ تشبیہ کیوں مذکور ہوتی اور یہ اس واسطے میں نے ذکر کر دیا کہ آج کل بعض متشددین بہت غلو کرنے لگے ہیں کہ محض ظاہری الفاظ دیکھ کر معنی میں غور نہ کر کے کفر و بدعت کے فتوے لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ ارشاد خداوندی ہے لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ کہ حق سے آگے نہ بڑھو کہ یہ غلو فی الدین ہے مثلاً جس چیز کا نظیر قرآن میں موجود ہو اس کو علی الاطلاق حرام کہہ دیا جائے۔ ہاں وجہ شبہ متعین کرنی چاہیئے تو سمجھ لو کہ تشبیہ میں مشارکت ہوتی ہے دو چیزوں کی کسی خاص امر میں مثلاً کسی کے چہرہ کو چاند سا کہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس میں یہ اور چاند شریک ہیں یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چہرہ بھی اسی قدر بڑا جسم ہے جس قدر چاند یا چاند میں بھی آنکھ ناک۔ کان خدوخال موجود ہیں یا جیسے چاند کے ہاتھ پیر نہیں اس شخص کے بھی نہیں۔

علیٰ ہذا خدا تعالیٰ نے جو تشبیہ دی ہے تو مطلق نورانیۃ میں تشبیہ دی ہے کہ کمال نورانیۃ میں اس کے مشابہ ہے۔ اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ دونوں کمال ایک درجہ کے نہیں ہیں جس طرح کلی مشکک کے افراد مختلف ہوتے ہیں برابر نہیں ہوتے مگر کوئی امر مشترک اس میں ضرور ہوتا ہے مثلاً شدت ضیاء اور مشبہ بہ کا اکمل ہونا بھی ضروری نہیں البتہ اوضح یا اشہر ہونا ضروری ہے تو اسی طرح سے اگر کسی محقق کے کلام میں خدا کو دریا اور اپنے کو قطرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہو تو وہ کسی خاص امر میں ہوگی جیسا کہ مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ؎

زدریا موج گوناگوں برآمد ٭ زبے رنگی بہ رنگ چوں برآمد

(دریا سے بڑی بڑی موجیں اٹھتی ہیں جس طرح بے رنگ سے رنگ نکلتا ہے)

افسوس ہے کہ آج یہ حالت ہے کہ جنھوں نے ایک پارہ قرآن بھی نہیں پڑھا وہ ان اشعار کو پڑھتے اور سنتے ہیں اور ان پر وجد کرتے ہیں حالانکہ خاک بھی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ سمجھتے ہیں تو یہی کہ خدا پھیلا ہوا ہے اور ہم اُس سے نکلے ہیں اور یہ سمجھ کر اپنا دین برباد کرتے ہیں ایسے اشعار کا ان لوگوں کے سامنے پڑھنا بھی جائز نہیں ہے اور اس عدم جواز کے حکم سے کوئی تعجب نہ کرے دیکھئے حکماء امت نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے حج کو ناجائز کہدیا ہے۔

مثلاً ایک ایسا شخص کہ جس کے پاس زادراہ بھی نہ ہو بیوی بچوں کے دینے کو بھی کچھ نہ ہو اس کے لئے سفر حج کو بالکل ناجائز کہا جاویگا اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں دیکھو عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا نصاً ناجائز ہے۔ حالانکہ نماز کتنی بڑی عبادت ہے۔

علیٰ ہذا عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر عبادت میں کچھ قیود وجوب کے ہوتے ہیں اور کچھ شرائط جواز کے ہوتے ہیں تو حج میں استطاعت وجوب حج کی شرط ہے اور اہل وعیال کا حق ضائع نہ ہونا جواز حج کی شرط ہے۔

اس کو حضرت مسعود بک رحمۃ اللہ علیہ اور واقعی حضرت کا کلام بدون علم ظاہری کے سمجھنا نہایت دشوار ہے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمانے کا ہر شخص مخاطب ہے مگر واقع مخاطب ایسے ہی لوگ ہیں سو فرماتے ہیں۔ ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید ٭ معشوق در یں جاست بیائید بیائید

(حج کو گئی ہوئی قوم کہاں ہو کہاں ہو ارے یہاں آؤ یہاں آؤ معشوق اسی جگہ ہے)

یعنی تمہارے لئے محبوب اسی جگہ ہے کیونکہ مقصود رضائے حق ہے تو اگر بحالت مذکورہ بالا مکہ مکرمہ جاوے گا تو خلاف رضائے حق ہوگا اس لئے خدا نہ ملے گا اس واسطے کہ محض سفر مکہ مکرمہ سے خدا نہیں ملتا۔ مثلاً اگر کوئی نفل حج کر کے بیوی کا حق ضائع کر دے تو خدا تعالےٰ کب راضی ہو سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں حج کرنا بھی ناجائز ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایسے شخص کے سامنے کعبہ کے حالات بیان کرنا جس سے وہ مغلوب الشوق ہو کر سفر میں چلا جاوے جائز نہیں۔ دیکھو ظاہر نظر میں یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آتی لیکن واقع میں بالکل صحیح فرمایا ہے اس واسطے کہ حالات سُن کر سفر کا شوق پیدا ہوگا اور بوجہ عدم استطاعت کے یہ سفر معصیت ہوگا تو اس کا جو سبب ہے وہ بھی معصیت ہوگا واقعی اوّل اوّل جس نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سُنا ہوگا اس نے امام کو کافر کہا ہوگا حالانکہ امام بالکل ٹھیک لکھ رہے ہیں کہ جب سفر معصیت ہے اور تذکرہ اس کا سبب ہے تو تذکرہ بھی معصیت ہوگا۔ غرض کیسی ہی عبادت ہو وہ کسی نہ کسی وقت ناجائز ہو جاتی ہے۔

ایک اور مثال یاد آئی نیک کام میں چندہ دینا عبادت لیکن بعض اوقات یہ بھی جائز نہیں۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا چندہ لینے سے اس لئے انکار فرمادیا کہ وہ اس واقعہ سے پہلے خود سوال کر چکا تھا تو اس چندہ دینے کا مال یہ ہوتا کہ جب اپنے پاس کچھ نہ رہتا تو پھر سوال کرتا۔ خوب سمجھ لو بس شریعت جو کچھ حکم کرے وہ کرو جہاں شریعت پڑھنے کی اجازت دے پڑھو جہاں روک دے رُک جاؤ۔ بالکل مسلمان کی وہ حالت ہونی چاہیئے کہ جیسے ایک شخص نے

ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کھایا کرتے ہو کہنے لگا جو کچھ آپ کھلاویں گے وہی میری غذا ہے اور بزبان حال یہ کہا ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جان شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر مجھے زندہ رکھے تو آپ کی عطا ہے اور اگر مار ڈالے تو میں آپ پر قربان ہوں۔ بہر حال روح کو آپ سے تعلق ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں)

جب غلام کی شان آقا کے سامنے یہ ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے سامنے بندہ کی یہ شان بھی نہ ہو غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے سامنے ایسا ہو جائے جیسے مردہ بدست زندہ اور آپ کے احکام جیسے کبھی منصوص ہوتے ہیں اسی طرح کبھی غیر منصوص اور مستنبط بھی ہوتے ہیں اور یہ سب حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے احکام ہیں اور فقہ اور حدیث میں یہ ہی فرق ہے کہ حقیقت ایک ہے لباس جدا جدا ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش
من انداز قدت را مے شناسم

(آپ جس رنگ اور لباس میں رہیئے مجھے تو آپ کے قد کا اندازہ ہے خوب جانتا ہوں)

عاشق کی یہ شان ہوتی ہے کہ محبوب جس جوڑہ میں بھی آوے وہ پہچان لیتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ عاشق نہیں تو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ہیں ان کو حدیث فقہ سب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشادات نظر آتے ہیں۔

بہرحال شریعت کے احکام یہ ہیں اور یہ واجب العمل اور متبوع ہیں تو جب حج کو جانا بعض کو ناجائز ہے تو یہاں سے قیاس کر کے دیکھ لو کہ جب بعض وقت عبادت ناجائز ہو جاتی ہے تو ایسے اشعار گو وہ صحیح ہوں

ذکر کرنا ان لوگوں کے سامنے جبکہ ان میں کوئی مفسدہ ہو اگر ناجائز ہو جائے تو عجب کیا ہے اسی لئے حدیث میں ہے کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ (کلام کرو لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق) ایک حدیث میں ہے کہ جب کسی کے سامنے اس کی عقل سے بڑھ کر کلام کیا گیا تو وہ اس کے لئے فتنہ ہوگا تو اب جو ایسے اشعار عوام کے سامنے پڑھے جاتے ہیں کہ ان کے سمجھنے میں نہیں آتے اگرچہ وہ حافظ اور مغربی ہی کے ہوں تو یہ عوام کے لئے فتنہ ہوں گے یا نہیں۔ ان حضرات کے کلام کے صحیح ہونے میں کلام نہیں جو کچھ انھوں نے کہا صحیح ہے لیکن اس کے سمجھنے کے لئے فہم صحیح اور طبیعت سلیم درکار ہے تو مولانا ایسے ہی نازک مضامین کی نسبت فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ پولاد ست تیز
گر نداری تو سپر واپس گریز

(کہ بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سپر سے مراد فہم یعنی اگر فہم نہ ہو تو دور رہو۔) آگے فرماتے ہیں۔

پیش ایں الماس بے سپر میا
کز بریدن تیغ را نبود حیا

(کہ اس کے سامنے بدون سپر نہ آؤ کیونکہ ایمان اگر اس کے سامنے پڑے گا یہ اس کو قطع کردے گا۔)

اور اسی واسطے ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یحرم النظر فی کتبنا (ہماری کتابوں میں نظر کرنا حرام ہے) رہا یہ شبہ کہ جب کتاب کے دیکھنے کی اجازت نہیں تو پھر لکھا تھا کیوں یہ شبہ اکثر بڑے لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے تو وجہ یہ ہے کہ وہ حالات جو ان پر طاری ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی طاری ہو سکتے ہیں تو انھوں نے اپنے سے

پچھلے لوگوں کے لئے جن پر وہ حالات طاری ہوں اپنے قول واحوال کو مدون کیا ہے تاکہ پچھلوں کے پاس معیار رہے ورنہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ہماری طاعت مقبول ہے یا مردود اور جب پہلوں کے حالات مدون ہیں تو نہایت آسان ہے کہ اس پر منطبق کرکے دیکھ لو اگر مطابق ہو تو صحیح ورنہ باطل ۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے جیسوں کے لئے لکھا ہے نہ عوام الناس کے لئے اسی لئے اس کو دیکھنے سے منع کردیا بلکہ وہ اخفار کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ ان کے سامنے ان مضامین کا اگر کوئی انکار بھی کرتا ہے تب بھی ان کو جوش نہیں آتا اور وہ بیان نہیں کرتے ۔ بلکہ یوں کہتے ہیں ؎

با مدعی گوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے راز نہ بتائے بلکہ چھوڑ دیجئے کہ وہ خود پرستی کے رنج میں جاتا ہے)

رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اعلان کرے اور ولی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اخفار کرے اس لئے ان کو کبھی ہیجان بھی نہیں ہوتا۔ البتہ اپنے خواص سے بیان کرتے ہیں تو کوئی کلام غیر اہل کے سامنے بیان نہ کرو۔ تصوف کے اجزار بہت سے ہیں منجملہ ان کے احوال بھی ہیں ان کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اپنے خاص معاملات ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کے ظاہر کرنے سے اپنا باطنی نقصان ہوتا ہے۔

نیز ایک جزء اس میں علم مکاشفہ اور اسرار بھی ہیں ان کو بھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے اور بہت سی غلط فہمیاں سننے والے کو ہو جاتی ہیں جن سے اس کا بہت نقصان ہو جاتا ہے اور عوام کے نہ سمجھنے کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

دیکھو اگر کسی شخص نے کبھی آئینہ نہ دیکھا ہو اور اس کے سامنے آئینہ

کی کیفیت بیان کی جاوے تو کیسی ہی جامع مانع حقیقت بیان کرو لیکن
اس کے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کسی نے کہا ہے۔

پُرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو ما شوے بدانے

(ایک عاشق سے کسی نے پوچھا عاشقی کیا ہے اس نے کہا جب مجھ
جیسے ہو جاؤ گے تو معلوم ہو جائے گا)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور وجدانیہ وجدان ہی سے سمجھ میں آتی ہیں اور وجدان محض سننے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی واسطے محققین اجانب پر کبھی ظاہر نہیں کرتے اب بے احتیاطی ہوگئی ہے کہ عام مجالس میں اس قسم کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا میں ایسے لوگوں سے بہت ملا ہوں کہ ان الفاظ کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا ہی شخص مجھ سے ملا اور پوچھا کہ تصور شیخ جائز ہے یا نہیں۔ میں جائز کہنے کو تھا بشرائط مگر میرے ذہن میں آیا کہ شاید یہ تصور شیخ کے معنی غلط سمجھ رہا ہو اس لئے میں نے اس سے پوچھا کہ تصوّر شیخ کے کیا معنی ہیں کہنے لگا خدا کو بشکل شیخ سمجھنا۔ انا للہ حالانکہ قرآن شریف میں تصریح ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور یہ جو بعض آیات میں يَدُ اللهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے) وغیرہ آیا ہے وہاں ید وغیرہ سے مراد یہ نہیں کہ ہم جیسے ہاتھ پیر ہیں بلکہ جو اس کے مناسب ہوں ہم اس کی حقیقت دریافت نہیں کر سکتے۔

ہماری مثال عدم احاطہ حقیقت میں ایسی ہے جیسے کہ ایک پانی کا کیڑا انسان کی مصنوعات ریل اور تار وغیرہ کو دیکھے اور ان کی ناتمام حقیقت دریافت کر کے اندازہ کرے کہ جس نے یہ بنایا ہوگا وہ اس قسم کا ہوگا کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کی حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے

خدا تعالےٰ اس مثال سے بھی بالا تر ہیں لیکن تقریب فہم کے لئے اس مثال کے ضمن میں اُس کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وہم　　　وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　　ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(ہمارے خیال قیاس گمان وہم سے بلند ہے اور ہر چیز سے جسے ہم بولتے سنتے پڑھتے ہیں۔ ہم نے تمام دفتر پوری عمر میں چھان مارا لیکن جس طرح ہم پہلے وصف اول میں تھے وہیں اب بھی ہیں۔)

غرض خدا تعالےٰ کو کیا کوئی پہچان سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ اَعْلَمُنَا بِاللّٰہِ۔ جیسا کہ خود ارشاد فرمایا ہے اِنِّیْ اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ آپ بھی اس سے اپنا عجز ظاہر فرماتے ہیں۔ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (اللہ کی حمد سے ہماری زبان قاصر ہے) یہاں تو منتہائے ثنا یہ ہے کہ ؎ خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست (خاموشی ہی تیری حد درجہ کی حمد ہے) اور یہی خاموشی حاصل ہے حدیث مذکور کا۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اس عجز کو عجیب عنوان سے فرماتے ہیں ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست　　　محمد صلی اللہ علیہ وسلم چشم برراہ ثنا نیست
خدا مدح آفریں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بس　　　محمد صلی اللہ علیہ وسلم حامد حمد خدا بس

(نہ خدا کو ہماری حمد کا انتظار ہے اور نہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ثنا کیلئے چشم براہ ہیں بلکہ خدا تعالےٰ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مسرور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور حامد کافی ہیں)

خدا تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خدا کی تعریف کافی ہے۔

آگے فرماتے ہیں ؎

مناجاتے اگر خواہی بیان کرد — بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو مے خواہم خدا را — الٰہی از تو حب مصطفٰے را صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(اگر چاہو تو تمنائیں بیان کی جاسکتی ہیں اور صرف ایک شعر پر قناعت ہوسکتی ہے آپ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے خدا کو چاہتا ہوں اور خداوند آپ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کا طلب گار ہے)

حقیقت میں بے مثل مضمون ہے۔ باقی کوئی یہ نہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ (یعنی آپ کی ثنا شمار ہی نہیں کرسکتا) اور مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ثنا کرنا کافی ہے بات یہ ہے کہ یہ کفایت ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا تعالیٰ کو کما حقہٗ کوئی نہیں پہچان سکتا ؎

دور بیناں بارگاہ الست — جز ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

یعنی اتنا معلوم ہوا کہ موجود ہے باقی یہ کہ کیا ہے اور کیسا ہے اس کے لئے بس یہ سمجھئے کہ ؎

اندریں رہ آنچہ مے آید بدست
حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

(ہمیں اس راستہ میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ حیرت ہی حیرت ہے۔)

شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم — کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم
محیط ست علم ملک بر بسیط — قیاس تو بروے نگردد محیط
دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار — کہ پیدا نشد تختہ بر کنار

(کتنی راتیں میں اس منزل میں اسیر رہا ہوں کہ بالآخر حیرت نے میری دستگیری کی ہے تمام دنیا پر ایک بادشاہی کا علم محیط ہے۔ تمہارا قیاس اس کا احاطہ نہیں کرسکتا اس طوفان میں ہزاروں کشتیاں اس طرح ڈوبیں کہ کنارے پر ایک تختہ تک باقی نہیں)

کون احاطہ کر سکتا ہے خدا تعالیٰ کے کمالات کا ہاں ہم ایمان لاتے ہیں کہ ہم اس سے آگے رائے سے کلام نہیں کر سکتے۔ دیکھو افعال تک کا تو پتہ لگ ہی نہیں سکتا تو صفات کا کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہاں تو اقرار عجز کی بالکل وہ حالت ہونا چاہیئے کہ جیسے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ شب معراج میں کیا کیا گفتگو خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کس میں یہ مجال ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا تھا گل نے کیا سنا تھا اور ہوا کیا کر گئی)

حقیقت میں کس کی مجال ہے اور جو کچھ کہہ دیتے ہیں وہ اوچھے ہیں کہ اوچھلتے ہیں ورنہ اہل کمال کا یہی مشرب ہے جو میں نے بیان کیا ہے اسی طرح اسرار خداوندی کا بھی جو متعلق اکوان کے ہیں احاطہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی نسبت عارف شیرازی کہتے ہیں ؎ حدیث مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو ٭ کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معما

(شراب و ساقی کی بات کرو اور گردش زمانہ کی گفتگو چھوڑو کہ اس معمہ کو نہ کوئی حل کر سکا ہے نہ کر سکے گا)

جب راز دہر کے پیچھے پڑنے سے منع کرتے ہیں تو راز حق کی تو کیا انتہا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر شفیق تھے کہ جس چیز کو بے سود دیکھا اور فلاح دین و دنیا میں اس کی حاجت نہ دیکھی اس میں گفتگو کرنے سے منع کر دیا اور ایسے دقائق دغوامض پر چونکہ نجات موقوف نہیں اس لئے اسکی حاجت نہیں۔ پس ان میں کلام کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ اضاعۃ عمر ہے اور احتمال ضرر۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک مرتبہ مسئلہ قدر میں کچھ گفتگو فرما رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور سنا فرمایا کہ تم لوگ کیا گفتگو کر رہے تھے معلوم ہوا تو عتاب فرمایا کہ تم اس میں گفتگو کرتے ہو کیا میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں

اور فرمایا کہ جو اس میں گفتگو کرے گا اس سے باز پرس ہوگی یعنی پوچھ ہوگی کیوں اس میں گفتگو کی اور ایک لطیف معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ سوال ہوگا ذرا ہم بھی سنیں تم نے اس بارہ میں کیا تحقیق کیا ہے اس سے وہ شخص دم بخود رہ جاوے گا اور عجز کی وجہ سے کچھ جواب نہ دیگا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اس قسم کے علوم میں گفتگو کرنے سے ممانعت کی طرف اشارہ کردیا کیونکہ یہ علم وہبی ہے دلائل سے کبھی حل نہیں ہوسکتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان امور کے اظہار کی حاجت تو ہے نہیں جیسا اوپر بیان ہوا اور الفاظ وضع ہوئے ہیں حاجت کی چیزوں پر دلالت کرنے کے لئے سو ان مفہومات کے لئے الفاظ موضوع نہیں ہیں تو اگر ان مضامین کو الفاظ سے تعبیر کیا جاوے گا تو وہ تشبیہات ہوں گی اور وہ بالکل ناکافی ہیں۔

تشبیہات کے ناکافی ہونے کی مثال کے لئے ایک قصہ عرض کرتا ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک اندھے مادرزاد کی دعوت اس کے کسی شاگرد نے کی حافظ جی نے پوچھا کہ کیا پکاؤ گے شاگرد نے کہا کہ کھیر پکاؤں گا کہنے لگا کھیر کیسی ہوتی ہے شاگرد نے کہا کہ سفید کہنے لگا کہ سفید کس کو کہتے ہیں اس نے کہا جیسے بگلا حافظ جی نے کہا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے شاگرد نے ہاتھ سے اس کی ہیئت بنائی حافظ جی نے اس کو ٹٹول کر دیکھا اور کہنے لگا کہ بھائی یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے حلق میں کیسے اترے گی۔ اب غور کیجئے کہ کھیر جو اتنی ٹیڑھی ہوگئی اس کا کیا سبب ہوا یہی کہ اس کو تشبیہات میں بیان کیا گیا تو اس اندھے مادرزاد کو اگر ساری دنیا بھی سمجھا دینے کی کوشش کرتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ ہاں سمجھانے کی یہ صورت ہے کہ ایک انگلی لے کر اس کے منہ میں دیدی جاوے کہ وہ ہونٹ چاٹتا رہے۔ اور لیجئے اگر کسی نابالغ بچے کو لذت مجامعت سمجھانا چاہیں تو عمر ختم ہوجائے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ البتہ جب وہ بالغ ہوجاوے گا تو خود بخود بغیر سمجھائے سمجھ میں آجاوے گی۔

اسی طرح کملاء کے سامنے نااہل لوگ مثل اطفال نا بالغ کے ہیں بڑے بڑے حکماء ارسطو، افلاطون ان کے سامنے ایسے ہیں جیسے بچے تو ایسوں کے سامنے یہ مضامین بیان کرنا بچے کے سامنے لذت مجامعت کو بیان کرنا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

خلق اطفالند جز مرد خدا

نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

جو شخص نفسانی خواہشات سے چھوٹ گیا وہی بالغ ہے باقی اس کے مقابلہ میں سب نا بالغ ہیں تو ان کے سامنے جو کچھ بیان کیا جاوے گا وہ تشبیہات میں بیان کیا جاوے گا اور تشبیہات میں غلطیاں واقع ہوں گی لہذا اسرار وجدانیہ کسی کے سامنے بیان نہ کرنے چاہئیں۔

آج کل افسوس ہے کہ لوگوں نے اسی جمع عبارات کا نام تصوف رکھ لیا ہے اور اکثر اسی قسم کے اسرار کہنے والے خود بھی رسمی لوگ ہوتے ہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

حرف درویشاں بدزدد مرددوں

تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(ایک پست انسان فقیروں کی چند باتیں اس لئے اڑا لیے کہ جاہلوں کے سامنے سحر کاری کر سکے)

کہ چند الفاظ سنے سنائے یاد کر لئے اور انہیں کو مختلف مجالس میں گاتے پھرے اور اگر کوئی آگے پوچھ بیٹھے تو خاک بھی نہیں۔

صاحبو! محض ملفوظات کے یاد کر لینے کا نام تصوف نہیں ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ملفوظات یاد کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس کی سعی کرو کہ تم بھی ایسے ہو جاؤ کہ تمہاری زبان سے وہی باتیں نکلنے لگیں جو ان کے منہ سے نکلیں اور وہ حالت بنا لو کہ

بینی اندر خود علوم انبیاء

بے کتاب بے معید و اوستا

(علوم انبیاء علیہم السلام میں خود کو بغیر کسی استاذ اور بغیر کسی مذکر کے دیکھو تو بات ہے)

اور اگر یہ نہ ہو تو محض دعوے و تصنع سے کیا ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

کہ گہے آہے در دروغے میزنی | از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبے تمام | در غلط اندازے تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آرے جملہ راست | باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن | رایت اخلاص و صدق افراشتن

(کبھی کبھی محض فریب سے آہیں کھینچتے ہو مکھن کے لئے چھاچھ بلوتے ہوئے مجھے مخلوق پر رحم آتا ہے تم نے فریب تام سے ہر خاص و عام کو مبتلائے غلطی کر دیا ہے مخلوق کے ساتھ ہر قسم کے کام روا ہیں لیکن خدا کے ساتھ فریب کاری کہاں روا ہے ان کے ساتھ معاملہ درست رہنا چاہیئے صدق و اخلاص کے پرچم کو بلند رکھنا چاہیئے)

امام صاحب کا واقعہ ہے کہ آپ چلے جا رہے تھے ایک شخص نے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ یہ پانچسو رکعتیں روزانہ پڑھتے ہیں آپ اس کو سن کر رونے لگے اور اُسی روز سے اتنا ہی عمل شروع کر دیا۔ کیونکہ جانتے تھے کہ مخلوق تو دھوکہ میں آسکتی ہے لیکن خالق کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں چل سکتا۔

آج یہ حالت ہے کہ لوگ اپنی نسبت تقوے و طہارت کے لئے مشہور ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے تدابیر کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کلکتہ میں گیا اور اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے چند گرگے اس غرض کے لئے چھوڑ دیئے کہ اس کو مشہور کریں۔ بہر حال علم میں خواہ حال و قال میں مکر کرنا سخت غلطی ہے غرض جو حال یا سر ہے بدوں حصول سمجھ میں نہیں آتا اور جو سمجھ میں آوے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہیئے نہ دوسرے کو بتلانا چاہیئے۔ تعلیم اسی چیز کی دینی چاہیئے کہ جس کی ضرورت ہے ورنہ محض مجلس گرم کرنے کے لئے بے ضرورت باتیں یا محتمل الفرد مسائل کو ہر گز بیان نہ کرنا چاہیئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قدر کے بارہ میں گفتگو کرنے کی ممانعت سے سبق لینا چاہیئے۔ دیکھو بچے کے سامنے کتنے ہی نفیس کھانے ہوں لیکن جب کافی مقدار پیٹ میں پہونچ جاتی ہے

تو شفیق ماں کھانے سے روک دیتی ہے۔ بچہ ضد کرتا ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتی اس کی نظر مصلحت اور فائدہ پر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم کو چاہیئے کہ جن امور کو ہمارے لئے غیر ضروری یا مضر قرار دیا ہے ان کے درپے ہم نہ ہوں اور اپنا یہ مذہب رکھیں ؎

بدرد صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ما ریختہ عین الطاف است

(تلچھٹ ہو کہ صاف شراب تمہیں مجال نہیں کہ بچالو ساقی نے جو کچھ دیا ہے وہ عین الطاف ہے)

اور اسی کی نظیر ہے کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو تنگدل نہ ہو کیونکہ کبھی کبھی دیر لگانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالےٰ کو اپنے بندہ کا گریہ وزاری پسند ہوتا ہے۔ بزرگوں نے اس کی مثال لکھی ہے کہ جیسے کوئی حسین عورت کسی سے سوال کرے تو وہ ٹالتا ہے تاکہ اس کو مکرر سوال کی نوبت آوے اور اس کے ذریعہ سے اس سے خطاب کا موقع مل جاوے۔ اور دیکھئے آپ اپنے بچہ کے لئے کوئی چیز لاتے ہیں مگر اس کو دق کر کے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچہ رونے لگتا ہے اور آپ کو اس کا رونا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب جن لوگوں کی دعا قبول ہو جاتی ہے وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور جن لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی وہ سخت نالاں رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ قبولیت دعا مقبول ہونے کی علامت ہے نہ عدم مقبولیت مردود ہونے کی علامت ہے۔ خدا تعالےٰ انسان کی اسی حالت کی شکایت فرماتے ہیں۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ. آگے فرماتے ہیں كَلَّا یعنی جب خدا تعالیٰ انسان کو فراغت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے میرا بڑا اکرام کیا اور جب رزق تنگ کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے مجھے ذلیل کیا اور خدا تعالیٰ مجھے چاہتے نہیں۔

ارشاد ہوا ہے کہ ہرگز یعنی یہ بات نہیں ہے کہ رزق کی فراغت دلیل اکرام ہو اور عسرت دلیل اہانت ہو۔ تو اسی طرح اگر دعا بھی قبول نہ ہو تو وہ دلیل عدم قبولیت اور مردودیت کی نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ دیتے ہیں۔ تشریعًا بھی اور تکوینًا بھی غرض جو علم نہ دیا اس کا نہ دینا ہی نعمت ہے۔ جیسا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قدر میں گفتگو کرنے سے ممانعت فرمادی۔ اور اسی حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جو امور غامضہ ہیں ان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی ان میں گفتگو نہ کرنی چاہیئے۔

یہ سلسلہ اس پر چلا تھا کہ قرب کے معنی یہ نہیں جو دریا و قطرہ میں سمجھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ کو لغوی معنی پر محمول کرنا غلطی ہے۔ بلکہ مراد اس قرب سے جو اس آیت میں مذکور ہے رضا ہے یعنی خدا تعالےٰ کا راضی ہونا مراد ہے کیونکہ قرب کے مختلف درجے ہیں ایک تو قرب علمی ہے اور وہ خدا تعالےٰ کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۔ اور ارشاد ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اور ایک قرب رضا کا ہے اور وہ بعض کو حاصل ہے اور اس آیت میں قرب رضا مراد ہے قرب علم مراد نہیں کیونکہ وہ مؤمن اور صالح کے ساتھ خاص نہیں اور یہ قرب رضا بڑی دولت ہے مگر اس کو اہل دنیا تو کیا مقصود سمجھتے بہت سے اہلِ دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے۔ پس اس آیت میں حق تعالےٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے۔ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ اَلْاٰیۃ یعنی مال اور اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ ذریعہ قرب نہیں ہوسکتے بلکہ ایمان اور عمل صالح اس کے ذرائع ہیں اور ظاہر ہے کہ ایمان وعمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو کیونکہ ناقص پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور وہ ذریعہ رضا کا کیسے بن سکتا ہے۔

اور اس کا کامل ہونا موقوف ہے تین چیزوں پر علم وعمل دائم حال۔ اور دین کے

یہ ہی شعبے ہیں۔ سو اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہوگی اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع کا نفع کیا ہوا۔ اور اگر علم نہیں تو اگرچہ بظاہر عمل کا ہونا کافی معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ اس میں خلوص اور بقاء کی امید نہیں اور حال سے مراد ملکہ ہے۔ اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کسی سے محبت ہو جاوے اور اس کو کھلاؤ پلاؤ تو ایک تو یہ حالت دوسرے یہ کہ اس کی محبت میں بے چینی ہونے لگے۔ پہلی حالت عمل ہے۔ دوسری حالت حال ہے اور پہلی حالت یعنی ترا عمل بلا حال پائدار نہیں۔ اور حال ہو جانے کے بعد پائدار ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کر کرتا ہے اگر ایک وقت چھوٹ بھی جاوے تو کچھ زیادہ قلق نہیں ہوتا۔ اور ایک دوسرے کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک وقت نماز بھی چھوٹ جاوے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسرا صاحب حال ہے اسی کو کہتے ہیں ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم اگر باغ دل میں گنجائش کم تھی)

اور اس کا پیدا کرنا گو واجب نہیں کیونکہ اگر تکلف سے بھی کرتا رہا لیکن اخلاص ہو کہ عبادت سے کوئی دوسری غرض نہ ہو تو خدا تعالےٰ کے یہاں مقبول ہے کچھ کمی اس میں نہیں لیکن ہے خطرناک حالت کیونکہ جب قلب میں تقاضا نہیں تو خدا جانے کہاں گاڑی اٹک جاوے اور کہاں پہنچکر عمل کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حال کو بھی پیدا کرلے اس کو کہا ہے ؎

صنما رہِ قلندر سزدار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(قلندر کی راہ میں بڑے صنم ہیں لیکن میں پارسائی کی راہ و رسم سے خوب واقف ہوں) دراز دور کے معنی یہ ہی ہیں کہ عمل ہو اور حال نہ ہو تو رشتہ قطع ہوجائیگا لیکن بڑی دشواری اور مشکل سے قطع ہوگا۔ اور اسی معنی میں مولانا نے فرمایا ہے قال را بگذار مرد حال شو (قال کو چھوڑو حال ہو جاؤ) آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ پیش مرد کامل پامال شو (مرد کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ) یعنی یہ حالت لکھنے پڑھنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محض محبت سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ ملکہ ہے اور ملکہ صحبت سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ارژنگ چین لے کر خط کی مشق کرے تو کبھی وہ ملکہ پیدا نہیں ہوگا جو کہ مثلاً منشی شمس الدین کی خدمت اور صحبت سے پیدا ہوگا اسی طرح حال باطنی کی بھی کیفیت ہے تو علم اور عمل اور حال ان تینوں چیزوں کی ضرورت ہوئی اگر ان میں سے ایک بھی نہیں تو کچھ بھی نہیں اور یہی دین ہے۔ اسی حال کی تعلیم اس آیت میں بھی ہے۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرف جلد توجہ کرو ایسا نہ ہو کہ ایک زمانہ گذر جانے سے قلب میں قساوت پیدا ہو جاوے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حال کی تاکید بھی کسی درجہ میں قرآن سے ثابت ہے۔ غرض ارادہ اور قصد تو ضروری ہے اور حال مصلحت ہے کہ اس سے تسہیل ہو جاتی ہے اور یہ ہی وہ شان ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنَ (آپ کا اخلاق قرآن تھا) جب کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے تو آپ نے یہ جواب دیا کہ قرآن آپ کا امر طبعی بن گیا تھا آپ کا جی اسی چیز کو چاہتا تھا جس کو خدا چاہے ہے۔ جس شخص کی حالت ہوگی وہ کبھی انشاء اللہ تعالےٰ راجع نہ ہوگا نہ واقف ہوگا بلکہ برابر ترقی

کرتا چلا جاوے گا کیونکہ اول تو قلب میں ایک چیز محرک ہے دوسرے اس حالت کی برکت سے یہ محب ہونے کے ساتھ محبوب بھی ہوجاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کی وہ حالت ہوتی ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُ دَارَ (کہ یہ جس طرف ہوں حق بھی اسی طرف ہوجائے) ظاہر تو یہ تھا کہ آپ یہ دعا دیتے کہ ادرہ مع الحق۔ لیکن آپ نے بجائے اس کے یہ فرمایا اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ اور یہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی بات فرمائی اور بہت بڑی دعا دی اور یہ بتلا دیا کہ ان کی محبوبیت ایسی ہوجاتی ہے کہ اگر ان سے معاملات یومیہ میں اجتہادی غلطی بھی ہو تو اسباب ایسے جمع ہوجاتے ہیں کہ وہ حق واقعی ہوجاتا ہے مثلاً اگر دو شخصوں میں لڑائی ہوجاوے اور ایک ایسا ہی محبوب حق اپنے حق اجتہاد سے ان میں سے کسی ایک کی طرف ہوجاویں جو کہ واقعی میں حق پر نہ ہو تو خدا تعالیٰ حق کو اسی کے ساتھ اس طرح کردیتے ہیں کہ وہ شخص تائب ہوکر حق پر ہوجائے اور ان کو اس کی طرف دائے سے پھرنا نہ پڑے یا اگر خود انہیں سے کسی کے مقابلہ میں غلطی ہوجائے تو خدا تعالیٰ حق کو ان کے ساتھ اس طرح کردیتے ہیں کہ ان کا مقابل جو ابھی تک مظلوم تھا انتقام لینے میں حد جائز سے آگے نکل جاوے۔ پس انتقام کی وجہ سے ان کا ظلم عفو ہوجاوے گا اور مقابل کے اعتدار کی وجہ سے اب یہ مظلوم ہوجاویں گے اور حق ان کے ساتھ ہوجاوے گا۔

الحمدللہ یہ بالکل نئی بات ہے اور اس تفصیل سے آج ہی ذہن میں آئی ہے اور اس کی ایک نظیر حدیث میں صاف آئی ہے۔ فرماتے ہیں رب اشعث اغبر لا یوبہ لہٗ مدفوعٌ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبرہ۔ یعنی بہت سے ایسے پراگندہ مو غبار آلودہ خستہ حال

لوگ ہیں کہ کوئی ان کی پرواہ بھی نہیں کرتا مگر حالت ان کی یہ ہے اگر کسی امر کے متعلق قسم کھا بیٹھیں کہ یوں ہوگا تو خدا تعالیٰ اسی طرح کر دیتے ہیں تو یہ مضمون بھی اسی کے قریب ہے کہ واقعہ ان کی قسم کے موافق بدل جاتا ہے۔

میں نے ایک سیاہ سے سنا کہ کسی مقام پر انھوں نے ایسی چیز دیکھی کہ اس کا ایک حصہ پتھر ہے ایک لکڑی ایک کنکر ایک غیر معلوم الجنس اور لوگوں نے اس کا قصہ یہ بیان کیا کہ اندھیرے میں کسی بزرگ کی ٹھوکر لگی تھی انھوں نے فرمایا یہ کیا ہے پتھر ہے یا لکڑی یا کنکر یا کچھ اور اس میں ان سب چیزوں کا تھوڑا تھوڑا جزو پیدا ہو گیا یعنی کچھ حصہ لکڑی کا ہو گیا کچھ پتھر کچھ کنکر کچھ غیر معلوم الجنس۔

مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ میاں ان کے کہنے میں ہیں ہر گز نہیں بلکہ یہ حضرات خود حق تعالیٰ کے کہنے میں ہیں اور یہ اسی کی برکت ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ کبھی کبھی ان کے کہنے کے خلاف بھی کر دیتے ہیں۔ اور کسی کا تو کیا منہ ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں فرمائیں۔ ان میں سے دو قبول ہوئیں اور ایک نامنظور ہوئی سو اس سے سمجھ لیجئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں منظور اور ایک نامنظور ہوئی تو اور کون ہوگا جس کا سب کہنا ہو جاوے اور میں اس مضمون کو کہتا بھی نہیں مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض آپ فرماتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ ادر الحقّ معہٗ حَیْثُ دَارَ اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے اور غالب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ ہوتے ہیں اور خداوند تعالیٰ ان کے ذہن میں ادراک پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ خلاف حق چلتے ہی نہیں۔ غرض ان کو مرتبہ محبوبیت کا عطا ہوتا ہے جس سے وہ خلاف نہیں کہتے یہ وجہ ہوتی ہے صاحب حال کی ترقی و استقامت کی پس علم و عمل و حال کا جمع کرنا یہ طریقہ ہے قرب اور رضا کا جو کہ بہت بڑی دولت ہے۔ کیونکہ دولت راحت قلب ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی۔ کہ اس کا محبوب حقیقی اس سے راضی اور قریب ہو

یہ راحت کسی کو بھی نصیب نہیں بلکہ اس دولت میں تو اگر کچھ محنت بھی ہوتی وہ اس پر بھی راضی ہوتے۔

چنانچہ کبھی ایسی حالت ابتلاءً گو پیش آتی ہے تو قانع ہوتا ہے اس وقت ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

دمادم شراب الم درکشند
دگر تلخ بینند درکشند

(لمحہ بہ لمحہ شراب الم کھینچتے ہیں اگرچہ دوسرے لوگ اسے دیکھ کر ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں)

لوگ جس کو کلفت سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی راحت سمجھتا ہے۔

مجنوں کو اس کے اقارب خانہ کعبہ میں لے گئے اور کہا کہ کہہ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ مِنْ لَیْلٰی وَحُبِّہٖ تو وہ کہتا ہے اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ حُبَّ لَیْلٰی اور یہ شعر پڑھا ؎

اِلٰھِیْ تُبْتُ مِنْ کُلِّ الْمَعَاصِیْ اِلَیْکَ فَقَدْ تَکَثَّرَتِ الذُّنُوْبُ
فَاَمَّا مِنْ ھَوٰی لَیْلٰی وَتَرْکِیْ زِیَارَتِھَا فَاِنِّیْ لَا اَتُوْبُ

(الٰہی میں بہت گناہگار ہوں آپ سے میں ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت اس کی زیارت سے توبہ نہیں کرتا ہوں۔)

غور کرو کہ ایک عورت کی محبت میں یہ حالت تھی۔ اب مولانا کا قول سنو! فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود
گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلیٰ سے کیسے کم ہوسکتا ہے وہ اولیٰ ہی رہیگا)

یعنی کیا خدا تعالےٰ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہو گئی ہرگز نہیں تو اب غور کیجیے کہ وہ کیسی لذت کی چیز ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا قرب بڑی دولت

ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ بڑی مصیبت میں ہیں گو ان کے پاس اموال و اولاد بھی ہو اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو معلوم ہو گا کہ جنھوں نے دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے وہ کس قدر مصیبت میں ہیں۔ عیش کے ذرائع سوچتے اور جمع کرتے ساری عمر گذر گئی اور کھانے پینے کو وہی چار چپاتیاں اور تین کپڑے ہی ملے جو کہ سب کو ملتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اس قدر انہماک کے بعد بھی ذرائع عیش نصیب نہ ہوئے اور غضب یہ کہ آج تک بھی اس کا حس نہیں ہوا اب تک بھی وہی ترقی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اگر پورا عیش حاصل ہو بھی گیا تو یہ کیا عیش ہے کہ خوب کھا لیا اگر یہی عیش ہے تو بیل کو سب سے زیادہ عیش میسر ہے کہ اس کو نہ گذشتہ کل کی یاد نہ آئندہ کل کی سوچ اس کی برابر سلطان بھی عیش میں نہیں۔

غرض محض بے فکری سے کھالے نا کوئی عیش نہیں۔ عیش یہ ہے کہ نہ کہ ماضی کی فکر ہو نہ مستقبل کا اندیشہ ہو۔ بس نرا ابن الحال ہے کہ جو اس پر گذرتا ہے سب کو خوشی سے برداشت کرتا ہے اور اس کو نعمت سمجھتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔

صوفی ابن الحال باشد اے رفیق

یعنی جو حالت اس پر طاری ہو وہ اسی میں راضی ہے اور یہ کہتا ہے کہ

ہر چہ از دوست میرسد نیکو ست

اگر طیش بھی ہو تو عیش ہی ہے اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے دیکھئے اگر ایک مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو کہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے نہ بات کی ہمت ہو نہ سلام کی جرات ہو اور اسی حالت میں محبوب اس پر رحم کرے کہ اس کو سینہ سے لگالے اور خوب دبا دے کہ اس کا دم نکلنے لگے اور اسی حالت میں اس کا کوئی رقیب آجاوے اس کو دیکھ کر محبوب دریافت کرے کہ اگر تم کو تکلیف ہو رہی ہو تو میں تم کو چھوڑ کر اس کو دبانے لگوں تو اس وقت کیا کہے گا کیا یہ تکلیف اس کو محسوس ہو گی اور کیا اس کی وجہ سے وہ محبوب کے علیحدہ ہونے پر

راضی ہوگا کبھی نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا کہ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(نصیب دشمناں یہ نہ ہو کہ آپ کی تیغ سے ہلاک ہو بلکہ ہم تو خنجر آزمائی کے لئے کافی ہیں)

اور یہ کہے گا کہ ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہ ہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

توجب آدمی کی محبت میں یہ حالت ہے تو خدا تعالیٰ کی محبت میں کیا عالم ہوگا بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ ؎

عجب داری از سالکان طریق
کہ باشند در بحر معنے غریق

(سالکین کی عجب راہ ہے کہ وہ ہمیشہ معانی کے سمندر میں غرق رہتے ہیں)

اور ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من
دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی خوشی ناخوشی میری جان پر ہے دل تو محبوب ہی کا ہے)

اور وہ یوں کہتے ہیں ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا ؛ گر طرب باز دانی از بلا !

یعنی اگر طرب اور بلا میں فرق کیا تو تم طالب خدا نہیں بلکہ طالب مخلوق ہو ایک مخلوق کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کو لیا ہے جس نے اس کی حقیقت سمجھ لی اس کی برابر کوئی دولت مند نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑی دولت ہے۔ جو اس سے محروم ہو وہ محروم بھی ہے مرحوم بھی ہے مرجوم بھی ہے۔ محروم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور مرحوم اس لئے کہ اہل اللہ کو ایسے شخص پر رحم آتا ہے۔ ہاں اگر باغی ہو

تو اس پران کو رحم نہیں آتا۔ اس لئے کہ خدا کو اس پر رحم نہیں آتا لیکن اگر باغی نہ ہو بلکہ گنہگار ہو تو ان حضرات کو اس پر بہت رحم آتا ہے اور وہ اس کو ذلیل نہیں سمجھتے کیونکہ جانتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی یہ شان ہے ؎

گنہ آمرز رندانِ قدح خوار
بطاعت گیر پیران ریا کار

(رند شراب خور کے گناہوں کو بخشتا ہے اور ریا کاروں کی اطاعت کو پکڑتا ہے)

کسی نے خوب کہا ہے ؎

غافل مرد کہ مرکب مردان مرد راہ　　در سنگ لاخ بادیہ پہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش　　تاگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت ہو کہ مرد خدا پتھر بھی زمینوں جنگلوں کو طے کرتا ہے ہم سے نا امید مت ہو کہ رند شراب نوش اچانک منظر میں منزل تک پہونچ جاتے ہیں)

دوسرے کہتے ہیں ؎

گنہ آئینہ عفو و رحمت است لے شیخ
مبین بچشم حقارت گناہگاراں را

(گناہ عفو و رحمت کا آئینہ ہے گناہگاروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو)

یعنی حقیر نہ سمجھو البتہ قابل رحم سمجھو اور وہ برتاؤ کرو جیسے کہ تمہارا بیٹا بیمار ہو جائے اور اس کے ساتھ تم برتاؤ کرتے ہو۔ دیکھو اگر وہ تم پر ہگ بھی دے تو تم کو غصہ نہیں آتا بلکہ رحم آتا ہے تو مسلمان وہ ہے کہ مسلمان کی حالت پر آنسو بہا دے نہ یہ کہ ان کو ذلیل حقیر سمجھے اور برا بھلا کہے:

تا یار کرا خواہد و میلش بہ کہ باشد

(جب تک یار کسی کو چاہتا ہے اس کا رجحان اسی طرف ہوتا ہے)

اور اگر اصلاح کی امید نہ رہے تو خدا کے سپرد کرو اور دعا کرو یہ ہے اسلامی شان۔

آج کل ذراسی بات پر بدعت اور وہابیت کا الزام لگا دیا جاتا ہے صاحبو کس کی بدعت کس کی وہابیت۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں بعض مختلف فیہ بھی ہیں کوئی کسی طرف گیا کوئی کسی طرف تو اس کے لئے لڑتے کیوں ہو اور اگر کوئی مسئلہ متعین الصواب ہے اور اس میں کسی کو لغزش ہے تو اس کے غیر کے لئے دعا کرو۔ خوب کہا ہے ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے
بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(اگر یہ مدعی دوست کو پہچان لیتے تو دشمن کی تلوار سے مشغول نہ ہوتے)

دیکھو ایک مجلس میں محبوب بھی ہو اور اس نے اجازت دے دی ہو کہ میری طرف دیکھو اور یہ دیکھنے میں مشغول ہو کہ اتنے میں ایک شخص آکر اس کی انگلی کو چھو دے اب بتاؤ کہ وہ کیا کرے گا۔ کیا محبوب کی طرف سے نظر ہٹا کر اس شخص کو دیکھنے لگے گا یا اس سے الجھنا شروع کر دے گا۔ ہرگز نہیں وہ کبھی دوسری طرف التفات بھی نہ کرے گا اور اگر التفات کرے گا تو محبوب سے حرمان ہوگا۔ اور یہ توجہ و استغراق اسی وقت ہوگا کہ دوست کو پہچانے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

اگر ایں مدعی دوست بشناختے
بہ پیکار دشمن نہ پرداختی

اگر ادھر متوجہ ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم سے کوئی مناظرہ کرے تو تم کبھی مناظرہ نہ کرو اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔

میں عوام میں سے جس کو بیعت کرتا ہوں اس سے یہ بھی کہتا ہوں کہ بدعت کو چھوڑو لیکن بدعتی لوگوں سے مت لڑو خدا تعالیٰ تم سے یہ نہ پوچھے گا کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا اور قرآن مجید سے بھی اس مشرب کی تائید ہوتی ہے فرماتے ہیں

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ الخ (تم میں ایک جماعت بھلائی کی طرف بلاتی ہے) لفظ منکم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کام کے لائق نہیں ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے ان کا کہنا لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے اور جو لوگ اہل ہیں ان کا کہنا چنداں گراں نہیں گزرتا نیز علماء جو کچھ کہتے ہیں تہذیب سے اور شائستگی سے کہتے ہیں غرض یہ طعن و تشنیع کا شیوہ مناسب نہیں ہے اپنے کام میں لگے رہو اگر کوئی برا ہو تم اس پر ترحم کرو اور اس کے لئے دعا کرو۔

چنانچہ اہل اللہ دنیا داروں پر رحم کرتے ہیں جیسے بیمار کو دیکھ کر اس پر رحم آیا کرتا ہے بلکہ وہ مال داروں کو دیکھ کر بھی رحم کرتے کہ بیچارے حمال ہیں لدے ہوئے ہیں ہانپے جارہے ہیں۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ جب کسی امیر کو دیکھتے تو کہتے الحمد للہ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔

یہ دعا حدیث میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے کہ جب کسی بیمار کو دیکھو تو یہ دعا پڑھو۔ تو دنیا کی محبت سے زیادہ کونسی بیماری ہوگی کہ قلب کی بیماری ہے اور قلب کی بیماری سب سے بدتر ہے جیسا ارشاد ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ (ان کے دلوں میں بیماری ہے بڑھایا اللہ نے ان کی بیماری کو)

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اس کو سمجھے اور انھوں نے مرض کی حقیقت معلوم کی غرض دنیا دار بیمار ہیں اور اس بیماری سے بچا رہنا خدا کی نعمت ہے جو قابل شکر ہے۔

اکبر پور کا واقعہ ہے کہ ایک خاں صاحب نے ایک جلاہے سے براہ تمسخر پوچھا کہ میاں جی کیا کر رہے ہو کہنے لگا کہ خدا کا شکر کر رہا ہوں کہ مجھ کو خاں صاحب نہ بنایا کسی غریب پر ظلم کرتا اور دوزخ میں جاتا۔ خانصاحب چپ ہی تو ہو گئے حقیقت میں خدا کی یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ گناہ کا سامان ہی نہ دے سے

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند
او مصلحت تو از بہتر داند

(ہر وہ شخص جو تیری مالداری کو نہیں سمجھتا ہے۔ وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے)

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ لوگ رحم کے قابل ہیں کہ ایک بڑی مصیبت میں پھنسے ہیں مگر ان کو خبر بھی نہیں ان کی وہ حالت ہے جیسے ایک سرحدی وحشی ہندوستان میں آیا تھا کہ کسی حلوائی کی دوکان پر حلوا رکھا دیکھا قیمت پاس تھی نہیں آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھا گئے حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع دی حاکم نے یہ سزا مقرر کی کہ ان کا منہ کالا کر کے جوتیوں کا ہار گلے میں ڈالا جائے اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جاوے اور بہت سے لڑکے ساتھ کر دیئے جائیں کہ وہ ڈھول بجاتے پیچھے پیچھے چلیں، چنانچہ ایسا کیا گیا۔ جب یہ حلوا خور صاحب اپنے گھر واپس گئے تو وہاں کے لوگوں نے پوچھا کہ آغا ہندوستان چگونہ ملک است کہنے لگے ہندوستان خوب ملک ست حلوا خوردن مفت ست فوج طفلاں مفت ست سواری خر مفت ست ڈم ڈم مفت ست ہندوستان خوب ملک ست بس دنیا داروں کا خوب ملک ست کہنا ایسا ہی ہے جیسے اس آغا نے ہندوستان کو خوب ملک ست کہا اور دنیا کے حشم و خدم پر ناز کرنا ایسا ہی ہے جیسا اس نے سواری خر اور فوج طفلاں پر ناز کیا تھا۔

صاحبو! یہ بے حسی ہے واللہ اگر حس صحیح ہو تو یہ سب عذاب نظر آنے لگے حکومت دنیوی کی نسبت حدیث شریف میں ہے کہ جس کی دس آدمیوں پر بھی حکومت ہو گی قیامت میں اس کو مشکیں کس کر لایا جاوے گا اگرچہ اس کے بعد چھوٹ ہی جاوے آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم میں اگر صاحب

حکومت نہ ہوگے تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ہم بھی کہتے ہیں کہ حاکم ہوں لیکن کون شخص ہو اس کا فیصلہ خود حدیث میں موجود ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْقُضَاۃُ ثَلَاثَۃٌ اِثْنَانِ فِی النَّارِ وَوَاحِدٌ فِی الْجَنَّۃِ اور اس واحد کو عالم باعمل بتلایا ہے تو حکومت ضروری ہے مگر حکومت کے لئے متبحر عالم ہونا چاہیئے ورنہ بدون علم کے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور امتحان علم کا یہ ہے کہ ان کے سامنے جتنے واقعات و مقدمات پیش ہوں ان میں اپنی رائے لکھیں اور اس کے بعد اہل علم سے ان کا حکم دریافت کریں پھر دونوں میں موازنہ کریں واللہ زمین آسمان کا فرق نکلے گا۔

دوسری اس میں ایک اول شرط ہے کہ حکومت کی خود درخواست نہ کرے کیونکہ جو درخواست کرے گا وہ خود غرض ہوگا۔ اور نفسانیت سے کام کرے گا اس کو لوگوں کی مصلحت پر ہرگز نظر نہ ہوگی بلکہ اپنی مصلحت پر نظر ہوگی اور اس سے جتنی خرابیاں پیدا ہوں کم ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قضا کا عہدہ قبول کرنے کے لئے کہا انھوں نے انکار کردیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم منظور نہیں کرتے تو اپنے انکار کی کسی کو خبر نہ کرنا کیونکہ ایسا نہ ہو سب ہی انکار کردیں۔

اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سلف صالحین رحمہم اللہ حکومت کو کیسا سمجھتے تھے اور حقیقت میں ایسا ہی شخص کام کرسکے گا۔

اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دنیا کے لوگ حقیقت میں بڑی تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہیں اور دولت حقیقی دوسری چیز ہے۔ تو خدا تعالےٰ اس آیت میں اس دولت کو بتلاتے ہیں اور اس کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اور مروج طریقہ کو رد کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

تمہارے مال اور اولاد اس قابل نہیں کہ تم کو ہم سے

قریب کریں البتہ ایمان اور عمل صالح اس کا ذریعہ ہے۔
جیسا بیان ہوا اور اس میں آج کل کے اہل مذاق جدید کا بھی جواب ہوگیا یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترقی دنیا سے ہمارا مقصود ترقی دین ہے تو خدا تعالٰے نے بتلا دیا کہ ترقی دین کی یہ صورت نہیں کہ بہت سا مال سمیٹ لو۔ ہم اس آیت کا ترجمہ کئے دیتے ہیں اگر تین پانچ کرنا ہو تو خدا تعالٰے سے کرو اور پوچھو کہ یہ کیوں فرمایا۔
آج کل یہ بھی ایک عجیب عادت ہوگئی ہے کہ لوگ ہر بات کا ذمہ دار مولویوں کو سمجھتے ہیں۔ صاحبو مولوی تو صرف منادی کرنے والے ہیں دیکھو اگر کلکٹر کسی سے منادی کرادے تو اس منادی کی حکمت منادی کرنے والے سے نہیں پوچھی جاتی کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ اس کا ذمہ دار نہیں پھر کیا وجہ کہ مولویوں کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اگر یہ کچھ بتلا دیں تو ان کا احسان ہے باقی ان کے ذمہ کچھ نہیں۔ غرض مال اور اولاد ذریعہ قرب نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالح ذریعہ قرب ہیں اور یہ دونوں طویل الذیل ہیں مگر میں ان کے متعلق کچھ مختصر سا بیان کرتا ہوں۔ سو بعض لوگ تو ہم سے ایسے ہیں کہ وہ ایمان ہی کو بگاڑ بیٹھے ہیں اگرچہ ان کے عمل کسی درجہ میں اچھے ہیں لیکن عقیدہ بالکل ہی تباہ ہے۔
بہت سے لوگ پیروں سے اس قدر علاقہ رکھتے ہیں کہ خدا تعالٰے سے بھی اتنا علاقہ نہیں رکھتے وہ ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسا ایک سرمنہ چڑھا سررشتہ دار ہو کہ جو کچھ کہہ دے گا اسی پر دستخط ہو جاویں گے اور ان کے نام پر کہیں ہنسلی چڑھاتے ہیں کہیں منتیں مانتے ہیں بعض نے تعزیوں کو اس قدر ضروری سمجھ رکھا ہے کہ ان کا سارا دین ایمان رہی ہیں۔
ایک شخص کہنے لگے کہ جب سے میں نے گیارھویں شریف

چھوڑی ہے اس وقت سے مجھ پر آفتیں آنی شروع ہوگئیں۔ استغفر اللہ میرا یہ مطلب اس سے نہیں ہے کہ بزرگوں کو ایصال نہ کرو مطلب یہ ہے کہ اپنا عقیدہ خراب نہ کرو بلکہ اس نیت سے ایصال ثواب کرو کہ انھوں نے ہمارے ساتھ دینی احسان کیا تھا ہم ان کو ثواب پہنچائیں۔ باقی یہ بات کہ ان سے ہمیں مال یا اولاد ملے گی یہ کچھ نہ ہونا چاہیئے اور غور کرکے دیکھو کہ اس نیت سے ایصال ثواب کرنا کیسی بے ادبی ہے۔ دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی شخص مٹھائی لے کر آوے اور پیش کرنے کے بعد کہے کہ جناب آپ سے میرا فلاں کام ہے تو تمہارے دل پر کیا اثر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ خوشی اس کے مٹھائی لانے سے تم کو ہوئی ہوگی وہ سب خاک میں مل جاوے گی۔ اور سمجھوگے کہ یہ سب خوشامد اسی غرض کے لئے تھی۔

دوسرے جب وہ حضرات اپنی زندگی میں اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی نہ رکھتے تھے تو اب مرنے کے بعد کیوں ان کو دلچسپی ہوگی تو ایمان کی درستی جب ہوگی کہ اس قسم کی ساری باتوں سے توبہ کرو۔

دوسری چیز ہے عمل صالح اس کے متعلق یہ حالت ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بلکہ عقائد کی درستی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ جب عمل نہیں تو نری عقائد کی درستی کیا کرے گی۔ اور جو لوگ عمل کو ضروری بھی سمجھتے ہیں تو صرف دیانات روزہ نماز وغیرہ کو باقی معاملات بالکل ہی خراب ہیں۔ میں نے بہت سے متقی ایسے دیکھے کہ ان کے معاملات نہایت گندہ در گندہ ہیں۔ خدا جانے کیسا تقویٰ ہے کہ وہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں گویا بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ بس ایک دفعہ

کر کے عمر بھر کو چھٹی ہو گئی۔ بعض لوگ ایسے کہ ان کے معاملات بھی اچھے ہیں لیکن اخلاق نہایت خراب ہیں نہ خدا کی محبت نہ خوف نہ توکل نہ صبر و شکر نہ توحید بلکہ ان کے بجائے تکبر ریا عجب حسد کینہ وغیرہ سے پُر ہیں۔ یہ حال ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پُر حلل !
واندروں قہر خدائے عز وجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید
و از درونت ننگ میدارد یزید

(او پر سے تو کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر اللہ کا عذاب ہے۔ اوپر سے بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر طعنہ کرتے ہو اور اندر یزید کی طرح ہے)

تو عمل صالحہ میں یہ اخلاق باطنی بھی آگئے اور یہی ہے وہ چیز جس کو تصوف کہتے ہیں۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

(خبردار ہو کہ اولیاء اللہ کو خوف و ملال نہیں اور وہ لوگ جو ایماندار اور متقی ہیں)

اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ تصوف نہیں بلکہ غیر معمولی چیز ہے۔ تو سمجھو کہ اہل فن کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی تصوف ہے۔ حواشی قشیریہ میں ہے۔

اَلتَّصَوُّفُ تَعْمِيْرُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ ۔

اور باطن کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک عقیدہ اور دوسرے اخلاق ان سب کی اصلاح بھی قرآن میں ہے مگر صوفیہ نے

اس کو تصوف سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے تو تصوف کی حقیقت یہ ہے۔ ثمرہ اس کا یہ ہے تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ۔

الحمد للہ اس وقت دو غلطیاں رفع ہوئیں ایک تو یہ کہ لوگ تصوف کی حقیقت کو غلط سمجھے ہوئے تھے۔ یعنی تصوف میں تین چیزیں ہیں ایک تو ایمان اور عمل صالح کہ یہ عین تصوف ہیں ایک وہ کہ ان کو تصوف سے کچھ بھی علاقہ نہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مباحات دوسرے ممنوعات۔ جیسے یہ عقیدہ کہ طریقت میں سب کچھ مباح ہوجاتا ہے یا یہ کہ میرے پیر کو سب کچھ خبر ہے جیسے چند روز ہوئے ایک پیر صاحب نے کہا کہ میرے سپرد پولیس کا کام ہے۔ اور ہر جمعرات کو سب اولیاء پیران کلیر میں جمع ہوتے ہیں اور اشرف علی بھی وہاں آتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے میں سنکر خوش ہونگا اور ان کی تعریف کرونگا مگر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں ان کو یقینی کاذب سمجھنے لگا۔ تو گویا خدائی کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کے اختیار میں کچھ سمجھنا بھی ایسا ہی ہے یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ معاصی لعینہ ہیں۔ دوسری وہ چیزیں کہ وہ معصیت لغیرہ ہیں جیسے سماع کا سُننا کہ اگر کسی سے مجبوری کی وجہ سے سن لینا منقول ہے تو وہ حجت نہیں اور بلا عذر ناجائز ہے اور اب تو اس کی حالت نہایت گندر در گند ہوگئی ہے اور واقع میں یہ سب اعمال فقیہہ ہیں ان کو تصوف سے کچھ علاقہ نہیں۔ اور بعض وہ اعمال ہیں کہ ان کو تصوف سے علاقہ تو ہے مگر وہ عین تصوف نہیں جیسے احوال کہ کثرت ذکر سے کبھی مرتب ہوجاتے ہیں تو مقصود کے متعلق چار چیزیں ہوئی ایمان اور اعمال اور اخلاق اور حالات کہ ان کو تصوف سے تعلق ہے بعض کو عینیت کا اور بعض کو ترتب و مناسبت کا جیسے احوال کہ اگر ہوں تو اچھا ہے نہ ہوں کو کچھ مضائقہ نہیں

اور یہیں سے شیخ کامل کی پہچان بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اس کے اندر ایک تو ایمان خالص ہونے کی ضرورت ہے دوسرے اعمال صالحہ کی۔ تیسرے اخلاق کی کہ اس میں صبر و شکر ہو دنیا سے اس کو نفرت ہو کہ اس کی صحبت سے بھی دنیا سے جی ہٹ جاوے اور ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی طرف عوام کم متوجہ ہوں اور اہل علم و فہم زیادہ متوجہ ہوں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش پر اہل دنیا زیادہ ہجوم کریں معلوم کر لینا چاہیئے کہ یہ خود بھی دنیا دار ہے کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس اور جس کی طرف صلحاء زیادہ متوجہ ہوں وہ ہادی ہونے کے لائق ہے۔ جب ایسا شخص مل جاوے تو اس کی صحبت اختیار کرو۔ اور جس کو یہ سب حاصل ہو جائیں ان کے لئے خدا تعالیٰ آگے فرماتے ہیں کہ

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۔

یعنی ان کو اس سے امن ہوگا کہ ان کو بُعد ہو چونکہ آج کل جاہل صوفی گمراہ کرتے پھرتے ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تصوف کی حقیقت اور کاملین کی علامات کو بیان کر دوں تاکہ لوگ ان کے پھندے سے بچ سکیں۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق نیک عطا فرمادیں۔ آمین۔

ناظرین وعظ کی خدمت میں جامع وعظ (و ناشر وعظ) کی عاجزانہ التماس ہے کہ بارگاہ رحمت میں میرے لئے حسن خاتمہ اور عفو و عافیت کی دعاء فرمادیں۔

بالخیر تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

فَضَائِلُ الْعِلْمِ وَالْخَشْیَۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبدالمنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافرخانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ۱

دعواتِ عبدیت جلد سوم

کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

فضائلُ العِلم وَالخشیۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
بانس بریلی مدرسہ اشاعۃ العلوم	۱۳ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ہجری	۴ گھنٹے	کھڑے ہو کر	فضائل علم دین وخشیت حق	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی	تقریباً ۵۰۰ آدمی	طلبہ عربی اور نو تعلیم یافتہ کثرت سے تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ۝

(خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے) یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس مضمون کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے اس کے لئے چونکہ یہ ٹکڑا کافی تھا اس لئے اس پر اکتفا کیا گیا مضمون کی تعیین آیت کے ترجمے معلوم ہو جائے گی اور اس کا ضروری ہونا بھی اجمالاً ساتھ کے ساتھ ہی معلوم ہو جائیگا اس جملہ کے قبل آیت میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے مضامین ہیں اس جملہ سے بھی ان ہی مضامین کو تقویت مقصود ہے بوجہ اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کی مخالفت سے حزن و غم غالب رہتا تھا اور اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت شفقت و صفت تراحم کی ثابت ہوتی ہے یعنی آپ ان لوگوں کے راہ راست پر نہ آنے سے بہت ہی بے چین ہوتے تھے اور سوچا کرتے تھے کہ کونسی تدابیر ایسی ہوں کہ یہ لوگ اس کفر و ضلالت سے باز آ کر سیدھے رستہ پر آجائیں اور عذاب دائمی سے نجات پائیں آپ کی وہ حالت تھی جیسا کہ ایک شفیق باپ اپنے نافرمان بیٹے کی حکایت پر کڑھتا ہے اور پریشان ہوتا ہے اور ہر وقت کسی نہ کسی تدبیر میں لگا رہتا ہے کبھی مصلحین سے مشورہ کرتا ہے کبھی کسی سے دعا کراتا ہے کبھی تعویذ لکھواتا ہے کہ کسی طرح یہ ٹھیک رستہ پر آجائے غرض اس کو بیٹے کی نافرمانیوں پر اس سے عداوت نہیں ہوتی بلکہ اس پر رحم آتا ہے اور کڑھتا ہے۔ اگر کبھی اس کو اپنے گھر سے نکالنے کا قصد بھی کرتا ہے تو بہ نیت ادخال کے کرتا ہے۔ اس کو چھوڑ دینے یا اس سے قطع تعلق کر لینے کی نیت کبھی نہیں ہوتی اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کفار سے یہ حالت تھی کہ تمام عمر آپ کو یہی غم لگا رہا حتیٰ کہ آپ کے غلبہ غم کی وجہ سے آپ کو تسلی دینے کے لئے خاص اس مضمون کی بار بار آیتیں نازل فرمائیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ جس کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کہ آپ سے ان لوگوں کی حالت کا سوال نہ

کیا جائے گا یعنی پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لاتے نہ لائیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ کہ آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ ضرور ہی ان سے تعمیل کرالیں آپ کا کام صرف تبلیغ ہے کیونکہ آپ مبلغ ہیں رہا عمل کرانا یہ کام مصیطر کا ہے اور آپ مصیطر مقرر نہیں ہوئے۔ پھر اگر یہ لوگ عمل نہیں کرتے اور تبلیغ کو نہیں مانتے تو آپ کو کیا غم ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ط (اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈھ لو۔ پھر کوئی معجزہ لے آؤ) ایک جگہ فرماتے ہیں وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ط اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ کہ آپ زبردستی تو ان کو ایمان دار نہیں بنا سکتے گو ان کی قسمت میں دولت ایمان نہ ہو ایک اور جگہ ارشاد ہے وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ ۝ کہ آپ ان کی حالت پر غم نہ کیجئے اور ان کے مکروں سے تنگدل نہ ہوجئے۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ۝ کہ ہم جانتے ہیں ان لوگوں کے اقوال سے جو تنگدلی آپ کو ہوتی ہے سو آپ تسبیح وتحمید میں لگئے اور عبادت کو اپنا مشغلہ بنا لیجئے۔ کہ اس سے یہ تنگدلی دفع ہو جائے گی اور یہ غم ہلکا ہو جائیگا غرض بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کفار کی حالت پر بہت ہی حزن وغم تھا۔ نیز ان آیات سے اس کے مبنیٰ کا بھی پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر وضلالت سے باز آجائیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو ان لوگوں سے نفسانی عداوت اور بغض نہ تھا بلکہ ان کی اس ردّی حالت پر رحم آتا تھا اور دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کیونکہ اگر آپ کو ان کے ساتھ اس قسم کی عداوت اور بغض ہوتا تو آپ ہرگز ان کے ایمان لانے اور راہ راست پر آجانے کی تمنا نہ کرتے بلکہ یوں چاہتے کہ

یہ لوگ ساری عمر اس کفر و گمراہی کے تیرہ و تاریک غار میں پڑے رہیں اور کبھی ان کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے دشمن کے لئے انسان خیر خواہی نہیں کیا کرتا بلکہ عادۃً اس کی بدخواہی کے درپے ہوتا ہے اور اگر بدخواہی کے درپے بھی نہ ہو تو خیر خواہی کی تو گنجائش نہیں ہوتی اور آپ کی یہ حالت تھی کہ یوں چاہتے تھے گو مجھے تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو تکلیف نہ ہونے پائے حتیٰ کہ جس معجزے کے وہ طالب ہوتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ وہ معجزہ ہو ہی جائے تاکہ اسی کو دیکھ کر یہ لوگ سنبھل جائیں اور اپنی حالت درست کر لیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ رؤسا مکہ کرمہ نے یہ درخواست کی کہ آپ ان غریب لوگوں کو جو کہ آپ کے پاس میں ہمارے آنے کے وقت علٰحدہ کر دیا کریں تو ہم ایمان لے آئیں جیسا آجکل کے رؤسا کہ وہ بھی اس قسم کی فرمائش علماء سے کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ اگر ان جلاہے تیلیوں کو مساجد وغیرہ میں آنے سے روک دیا جائے تو ہم مساجد میں آنے لگیں اور جماعت سے نماز پڑھنے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا کہ کسی سقے یا جلاہے کے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہوں حالانکہ ان کو غیرت کرنی چاہئے اس لئے کہ یہ کہنا کہ ہم ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے درحقیقت اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کہ یہ خود اس قابل نہ ہوسکے کہ امامت کا منصب ان کو عطا ہوتا اور یہ دوسروں کے امام بنتے غریب لوگ تو بے چارے خود ہی دب جاتے ہیں اگر ان میں لیاقت اور قابلیت ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی اگرچہ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ ہم میں لیاقت نہیں ہے کیونکہ آج کل روشن دماغی کے زمانے میں ذرا سا دنیا وی عزوجاہ بھی لیاقت اور قابلیت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا دار لوگ کچھ ایسے مغرور و مست ہوتے ہیں کہ گو وضو کے فرائض و سنن سے بھی واقفیت نہ رکھتے ہوں لیکن اپنے کو علوم دین و دنیا دونوں کا محقق سمجھتے ہیں حالانکہ واقفیت یہ ہے کہ ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے　　حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(بعض عقلمند سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کچھ رتبہ حاصل کرلیا ہے حالانکہ اس نے
جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سوائے تکبر اور بڑائی کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا)

میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس صاحب کو عید کی امامت کا شوق پیدا ہوا اور وہ امامت کو چلے اس کے قبل کبھی کیوں امامت کی تھی بلکہ شاید نماز کا بھی کبھی کبھی اتفاق ہوتا ہوا اور وہ بھی کسی مجبوری ہی کی وجہ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تکبیرات بھول گئے۔ اب کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کروں آخر میں نے تکبیرات بتلائیں تو انھوں نے پوری کی جب یہ حالت ہے تو اب بتلایئے اگر سقے امامت نہ کریں تو کون کرے اور وہ بیچارے بھی آگے نہ بڑھیں تو کون بڑھے تو جیسے ان کی حالت ہے اسی طرح اُس زمانہ میں بھی رئیسوں کی یہی حالت تھی اس لئے ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ آپ ہمارے آنے کے وقت ان لوگوں کو ہٹا دیا کیجئے تو ہم آپ کے پاس آیا کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ شفقت کہ شاید اسی سے یہ لوگ کچھ مانوس ہوں اور رفتہ رفتہ راہ راست پر آجائیں ان کی درخواست کو منظور فرمانے کا کچھ خیال ہوا لیکن خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی درخواست منظور فرمانے سے منع فرمایا اور درخواست کو مسترد کردیا۔ چنانچہ ارشاد ہے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ط مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ کہ آپ کبھی ان لوگوں کو نہ ہٹایئے ان کا کچھ لین دین آپ سے نہیں ہے اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ بے موقع کام کرنے والوں میں سے ہوں گے۔

یہ بات طالب علموں کے یاد رکھنے کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز کو جو خدا تعالیٰ نے ظلم فرمایا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز ناجائز کیونکہ لفظ ظلم کلی مشکک ہے جس کے افراد مختلف مراتب کے ہیں جیسا کہ امر ممنوع کو ظلم کہا جاتا ہے اسی طرح اُس امر جائز حسن کو بھی کہ اس کے

مقابلہ میں کوئی امر اس سے احسن ہو ظلم سے تعبیر کر دیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تجویز فرمائی تھی وہ حسن تھی جیسا ابھی آتا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز اس سے احسن تھی اس لئے اس کے اعتبار سے اس کو نامناسب کہدیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز کا حسن ہونا ظاہر ہے کہ اس تجویز سے یہ نیت تھی کہ کفار ہدایت پا جائیں اور اپنی حالت موجودہ سے نکل جائیں اور ظاہر ہے کہ اہتمام ہدایت حسن ہی ہوگا اس کے حسن ہونے میں شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ شبہ کہ تجویز اگرچہ کفار کے لئے ہدایت کا سامان تھی لیکن اس سے مسلمانوں کی تو دل شکنی ہوتی تو سمجھ لو کہ صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی محبت تھی اگر آپ ان کی دھجیاں بھی اڑا دیتے تو ان لوگوں کے دل پر ذرا میل نہیں آسکتا تھا وہ بزبان حال یوں کہتے تھے کہ۔ ہرچہ آں شیریں کند خسرو بود (جو کچھ وہ شیریں کر دیتا ہے وہی پسندیدہ ہوتا ہے) اور ان کی آپ کے ساتھ یہ حالت تھی ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندہ کرتا ہے تو یہ تیری عطا و مہربانی ہے اور تو موت دے تو میں تیرا ہوں میری جان تجھ پر قربان ہے تو جو بھی کچھ کرے تیری رضا پر راضی ہوں) جن کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ تھوکتے تو اس کو زمین پر نہ گرنے دیتے تھے ہاتھوں میں لیتے اور اپنے چہرے پر مل لیتے اور اگر ہاتھ میں نہ آتا تو دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر چہرے کو مل لیتے اور بزبان حال یوں کہتے کہ ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست ۔۔۔ ہوس را رہ مدہ بوئے بسندست

(تیرے بال میری زلفوں کے چند پسندیدہ بال ہیں ہوس کے لئے راستہ مت کھولو کہ بہت ہی پسندیدہ خوشبو ہے)

تو جن عشاق کا یہ مذہب ہو کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(اللہ تعالیٰ دشمنوں کی خواہش پوری نہ کرے کہ تیری تلوار ہی ٹوٹ جائے دوستوں کا سر سلامت رہے

اور تو اپنے خنجر کی روانی کی آزمائش کرتا رہے)
ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی وضع مبارک کیونکر ناگوار ہوسکتا تھا تو یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی دل شکنی ہوتی۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اپنی ذات میں حسن تھا۔ مگر احسن کے مقابلہ میں اس کو نامناسب کہہ دینا کچھ مضائقہ نہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود

(عرش الٰہی کے مقابلہ آسمان نیچے درجہ میں ہے لیکن تیری زمین کے مقابلہ میں ہزاروں درجہ بلندی پر ہے)

پس چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز احسن تھی اس لئے اس کے سامنے اس تجویز نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بے موقع فرما دیا۔ باقی اس تجویز خداوندی کا احسن ہونا غور کرنے سے معلوم ہوگا کیونکہ یہ بہت زیادہ نظری ہے اس لئے کہ سب سے زیادہ نظری وہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لئے وحی کی ضرورت ہوا اور عقول قدسیہ بھی اس تک بلا وحی نہ پہونچ سکیں۔ مجھے اس موقع پر ایک بڑی بات یاد آئی۔ ہمارے زمانہ کے عقلاء بڑی غلطی میں ہیں کہ وہ تمام نظریات کو عقل سے دریافت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ نظریات کی دو قسم ہیں ایک وہ نظریات کہ محض نظر اور فکر ان کے ادراک کے لئے کافی ہوجائے سماع اور نقل پر موقوف نہ ہو دوسرے وہ نظریات کہ اس میں عقل کے ساتھ نقل کی بھی ضرورت ہو سو ایسی نظریات بغیر انضمام نقل شرعی عقل و فکر سے حل نہیں ہوسکتی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہمارے بعض دنیاوی معاملات بھی ایسے ہیں کہ ان کی نسبت جب تک کہ خود صاحب واقعہ بیان نہ کرے اس وقت تک دوسرے کو کچھ بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ مثلاً فریمسن زونا کہ اس کے رازوں کو کوئی دریافت نہیں کر سکتا خواہ کتنا ہی عقلمند ہو اس لئے کہ وہ راز معقول محض نہیں کہ عقل سے دریافت ہوسکیں بلکہ ان میں نقل کو بھی دخل ہے تو جب تک کہ نقل کی بھی آمیزش نہ ہو ان کا پتہ نہیں چل سکتا اور نقل مفقود ہے اس لئے کسی کو معلوم نہیں کہ وہاں کیا کیا

معاملات ہوتے ہیں اور فریقین ہونے والے کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر چیز کو اپنی عقل نارسا سے دریافت نہیں کر سکتے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ ہر قوت کی ایک حد ہوتی ہے کہ وہ قوت اس حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے مثلاً آنکھ کہ اس کا کام دیکھنا ہے مگر وہ ایک خاص حد تک دیکھتی ہے جو لوگ آسمان کے منکر ہیں وہ بھی اس مسئلے کو مانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ نیلگوں سطح جو جانب فوق میں ہم کو نظر آتی ہے یہ حد بصر ہے یعنی آنکھ کی قوت اس حد تک جا کر ختم ہو جاتی ہے آگے کام نہیں دیتی اس لئے یہ رنگ محسوس ہوتا ہے تو قوت بصر کا محدود ہونا تسلیم کیا اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس حالت میں انکار سمٰوات محض باطل ہے کیونکہ اس حد سے آگے ہونے کا احتمال باقی ہے یا مثلاً آپ کے کان کہ اُن میں سُننے کی قوت ہے لیکن وہ ایک مقررہ حد تک کی آواز کو سن سکتے ہیں کبھی کسی نے بریلی میں بیٹھ کر کلکتہ کی توپ کی آواز نہ سنی ہوگی حالانکہ یہاں ایک ذریعہ بھی موجود ہے کیونکہ جرم ہوا کہ جس کے ذریعہ سے کان میں آواز پہنچتی ہے یہاں سے وہاں تک متصل واحد ہے کیونکہ خلا منتفی ہے اب خواہ انتفاء امتناع عقلی ہو یا عدم عادی لیکن واقع یوں ہے کہ خلا کا وجود نہیں اور لیجئے آپ کی ناک کہ جس میں قوت شامہ مودع ہے کبھی یہاں بیٹھے ہوئے لکھنؤ کے عطر خانہ کی خوشبو محسوس نہیں کرتی پس جب تمام قویٰ ایک حد تک کام کر سکتے ہیں اور اس سے آگے عاجز ہیں تو عقل کہاں سے غیر محدود ہوگئی کہ اُس کی قوت کا سلسلہ غیر متناہی چلا جائے اور کہیں ختم ہی نہ ہو بلکہ جیسے اور قویٰ ایک مقام تک جا کر معطل ہو جاتے ہیں اسی طرح عقل بھی اُس حد تک پہونچکر کہ وہ نقل ہے عاجز ہو گی خواہ نقل خدا کی ہو یا انسان کی۔ صاحبو! اگر عقل سے ہر بات دریافت کی جا سکتی ہے تو کیا وجہ کہ جب کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ پیش آتا ہے اس میں وکلاء سے رائے لیا کرتے ہو کیونکہ اس کے ہر پہلو کو اپنی عقل سے دریافت نہیں کر لیتے اور کیا وجہ کہ عقل سے ایک قانون تجویز کر کے حاکم کے سامنے پیش نہیں کر دیتے کیا وجہ کہ ہائی

کورٹ کے نظائر کی تلاش کی جاتی ہے کیا کسی صاحب کے پاس اس کا جواب ہے اور اگر کبھی کسی شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات آجائے تو کیا وہ یہ جرأت کر سکتا ہے کہ خود یا بذریعہ وکیل خلاف قانون ہائی کورٹ کے ججوں کے سامنے پیش کر دے ہرگز نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ خلاف قانون کوئی بات پیش کرنے سے حاکم کان پکڑ کر اجلاس سے باہر کر دے گا۔ افسوس مسلمانو! اگر ایک جج اس بنا پر کہ قانون کے خلاف کو قابل سماعت نہ سمجھے اور قانون کی دلیل پوچھنے کو گستاخی قرار دے کر کان پکڑ کر نکال دے تو اس کو متعصب نہ کہا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں اگر کوئی عالم یہی بات کہے کہ خلاف قانون شرعی قابل سماعت نہیں نہ حکمت پوچھنے کا ہر شخص کو منصب ہے تو اس عالم کو متعصب کہا جائے حیف صد حیف کہ ہائی کورٹ کے جج کی تجاویز تو سب بلا تعین حکمت عقل کے موافق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجاویز میں چون وچرا کی جرأت کی جائے۔ غرض جہاں تک عقل نہیں پہونچ سکتی وہ نظری وحی کا محتاج ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر وہاں تک نہ پہونچ سکی اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ وہ کونسا جزو تھا جس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر نہیں پہونچ سکی اور نہ پہونچ سکتی تھی وہ جزو یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ایمان لے آنے کا احتمال تھا خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے بتلا دیا کہ یہ ایمان تو لائیں گے نہیں پھر ان کے لئے کسی اہتمام کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے صرف تبلیغ واجب ہے مگر اہتمام فضول ہے اسی کو فرمایا ہے

اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِيۡنَ نَارًا ؕ (ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے)

غرض آپ کی اس تجویز کی وجہ یہ تھی اور اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو کبھی آپ مسلمانوں کو علیحدہ کرنا گوارا نہ فرماتے۔ اب جبکہ معلوم ہو گیا تو یہی تجویز احسن تھی کہ خواہ آئیں یا نہ آئیں ان کو علیحدہ نہ کیا جائے گا۔ یہ ہے شرح اس آیت کی کہ میرا مقصود اس آیت کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ کبھی آپ کی جدائی کو گوارا نہ کرتے تھے کفار کے ایمان لے آنے کی امید پہ

ان کی جدائی کو بھی گوارا فرمالیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت کی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ حالت تھی کہ ایک صحابی نے ایک مرتبہ آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ یہ تو امید ہے کہ ہم جنت میں جائیں گے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کا درجہ جنت میں ہم سے بہت اعلیٰ ہوگا تو جب ہم کو آپ کا دیدار نصیب نہ ہو سکے گا تو ہم جنت کو لیکر کیا کریں گے خوب کہا ہے ؎

با تو دوزخ جنت ست اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(اے محبوب دوزخ بھی تیرے ساتھ رہ کر تو گویا جنت ہے اور اے میرے دل کے بسنے والے تیرے بغیر تو جنت ہی گویا دوزخ ہی ہے)

اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ الآیۃ (جس کسی نے اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری کی وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء) کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اعلیٰ ہوگا لیکن تم لوگ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم نہ رہوگے بلکہ تم لوگ بھی اس مقام تک پہونچ جایا کروگے جیسے دنیا میں گو مکان الگ الگ ہوتا ہے لیکن ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے اس کے گھر چلے جاتے ہو تو اسی طرح وہاں بھی گو مکان الگ الگ ہونگے مگر ملاقات ہو سکے گی ارشاد ہے وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ کہ جو تمہارا جی چاہے گا وہاں تم کو ملے گا تو اگر کسی کا یہ جی چاہے کہ میں ہر وقت زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف رہوں تو ضرور اس کو زیارت ہو سکے گی۔ رہی یہ بات کہ ایسی خواہش کسی کو پیدا ہوگی یا نہیں یہ ہم کو معلوم نہیں ہے یہ وحی کے متعلق ہے ممکن ہے کہ بعض کو یہ دولت نصیب ہو بعض کو نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ جس کو یہ دولت نصیب ہوگی کیا وہ ہر وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر پر پڑا رہے گا سو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اپنے گھر ہی بیٹھے بیٹھے ہر وقت زیارت سے مشرف ہوتا رہے جس کی صورت یہ ہو کہ خدا تعالیٰ نظروں میں ایسی قوت پیدا کردیں کہ وہ درمیان کی حائل چیزوں کو پار کرکے وہاں تک پہونچ جائیں

اس زمانے میں بھی ایسے آلات ایجاد ہوئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے بہت دور دور کی چیزیں دکھلا دیتے ہیں اور درمیان کے پردے سب دور ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ اگر نظر دل میں ایسی قوت پیدا کر دے تو کیا بعید ہے اور نظیر اس لئے بیان کی گئی کہ آج کل کے روشن دماغ لوگ جب تک کہ ولایت کی کوئی نظیر نہ ہو اس وقت تک منصوصات کو نہیں مانتے ورنہ ہم کو تو شرم آتی ہے کہ خدائی خبریں منوانے کے لئے یورپ کے صنائع پیش کریں غرض صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جنت میں جانا بھی اس وقت تک ان کو پسند نہ تھا جب تک کہ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہ ہو ؎

دیدہ از دیدنش نہ گشتے سیر   ہمچناں کز فرات مستسقی

(اس کے دیکھنے سے آنکھ کا جی نہیں بھرتا ایسے ہی جیسے دریائے فرات پر بھی پیاس کی بیماری والے کی پیاس نہیں بجھتی)

تو باوجود اس کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا کر لیا کہ تھوڑی مدت کے لئے یہ لوگ نظر سے غائب رہیں اور حقیقت میں یہ غیبت ظاہری تھی ورنہ اصل غیبت نہ تھی صحابہؓ کی تو حالت یہ تھی کہ ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

گو اس حضور اور ظاہری حضور میں فرق بھی ہے اور یہی معنوی حضور ہے کہ جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو سب سے بڑے محب تھے وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل رہے یعنی صدیق اکبرؓ ورنہ کیا ممکن ہے کہ ایسے سانحۂ عظیم کی حالت میں اتنی محبت مضبوط رہنے دے یہ اسی معائنہ کی بدولت ہے ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم خود ہی اس سے بے بہرہ ہیں۔ تو صحابہؓ کو گو پوری غیبت نہ ہوتی مگر یہ ظاہری غیبت بھی کب گوارا تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان لوگوں کے ایمان لاتے کے احتمال پر اس غیبت کو گوارا فرما لیا یہاں سے بطور تفریع کے کہتا ہوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شفقت تھی تو ورثۃ الانبیاء کو بلکہ ہر فرد امت کو کیونکہ ہر فرد امت من وجہ وارث ہے کیونکہ منشاء وراثت علم دین ہے کیا کوئی فرد بشر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا علم دین سے بالکل بے بہرہ ہے ہرگز نہیں خواہ وہ علم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی کا ہو اور جب ہر فرد امت کو یہ علم ہے تو کوئی مسلمان وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج نہیں تو جب آپ وارث ہوئے تو آپ کے ذمہ بھی وہی حق ہوگا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یعنی آپ اپنے مخالفین سے وہی برتاؤ کریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یعنی شفقت آج کل یہ حالت ہے کہ ذرا سے اختلاف میں عداوت اور تنفر ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو اپنے مخالف کے اس قدر درپے ہوتے ہیں کہ اس کو دنیاوی نقصان بھی پہونچانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے اس کو کوئی دنیاوی نقصان پہونچ جائے تو اس کو اپنی کرامت اور اپنی بددعا کا نتیجہ سمجھتے ہیں یہ سچ ہے کہ اہل دل کا ستانا اچھا نہیں اس سے طرح طرح کے نقصان ہوتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد تادلے صاحبدلے نامد بدرد

(جب تک کسی صاحب دل کے دل کو درد نہیں پہونچتا رسوائی نہیں ہوتی)

خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات با دُردکشاں ہر کہ درآویخت برآویخت

(یہ دنیا ادلے بدلے کی ہم نے اس دنیا میں بہت تجربہ کیا ہے کہ شرابیوں کے ساتھ لپٹ گیا وہ لپٹ ہی گیا)

تو یہ بات بالکل سچ ہے مگر یہ کسی کو کب جائز ہے کہ وہ اپنے کو ایسا سمجھے ہاں البتہ اگر کوئی دوسروں کی نسبت یہ گمان کرے تو بیجا نہیں اور اس وقت بھی بیجا نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مصیبت زدوں کی مصیبت کو دیکھ کر خوش ہو بلکہ غمگین ہونا چاہیئے۔ اور ان کے لئے دعا کرنا چاہیئے اور یہ حالت ہونی چاہیئے کہ جیسے کسی کا لڑکا کہ وہ جوا کھیلتا تھا اور اس میں پکڑا گیا تو دیکھئے کہ اس کے باپ کی کیا حالت ہوگی اگرچہ اس خبر کو سن کر زبان سے یہ کہدیگا کہ اچھا ہوا پکڑا گیا لیکن دل کی یہ حالت ہوگی کہ بیقرار ہو جائے گا تدبیریں کرے گا دعائیں کرلے گا اور جگہ جگہ کہتا نہ پھرے گا بلکہ اگر کوئی اس کے سامنے یہ تذکرہ کرے گا تو اس کو ناگوار ہوگا لوگ اگر عیادت کو آئیں گے تو ان کی عیادت لے گا۔

تو صاحبو کیا وجہ ہے کہ اگر اپنے بیٹے پر کوئی مصیبت آجائے تو قلب کی یہ حالت ہو جائے اور کسی دوسرے مسلمان پر کوئی مصیبت آئے تو دل کو اثر بھی نہ ہو میں اس کی شکایت کرتا ہوں ہاں اگر شفقت کی وجہ سے غصہ ہو تو وہ بُرا نہیں معلوم ہوتا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے غصّے کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی شخص ان کے غصّے سے بچتا ہو لیکن باوجود اس کے کبھی کسی کو ناگوار نہ ہوتا تھا اس لئے کہ وہ خلوص سے ہوتا تھا خوب کہا ہے ؎

محبت ہو کسی سے یا عداوت مزا دیجائے گی جو دل سے ہوگی

صاحبو! تمہارے پاس دل نہیں تمہاری ہمدردی محض لفّاظی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں آجکل کے مدعیان ہمدردی کے لئے ایک مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ اگر ایک ایسے شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دی جو کہ اپنے گھر سے خوش حال ہے ایسا کہ اگر نوکری نہ بھی کرے تو اس کے ضروریات پورے طور سے چل سکتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرا ایسا شخص درخواست دے کہ وہ بالکل مفلوک الحال ہے ایسا کہ اگر اس کو یہ ملازمت نہ ملے تو کھانے پینے کی ضروریات بھی اس کی مشکل سے پوری ہوں اور یہ خوش حال صاحب درخواست دینے میں مقدم ہوگئے اور وہ غریب دوسرے نمبر پر ہوگیا تو ہم نے آج تک کسی مدعی ہمدردی کو نہیں سُنا کہ اس نے اس غریب آدمی کی غربت پر خیال کرکے اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور میں اہل اللہ میں ہزاروں نظیریں اس سے زیادہ دکھلا دوں جو کہ دنیا داروں میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں دنیا داروں میں ایک وضعداری ہے کہ دنیا کی لاج کے مارے اس کو نباہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک تو ہمدردی نہیں ہوتی اور دوسرا فرق ان میں اور اہل اللہ میں یہ ہے کہ اللہ والے کریں گے بہت کچھ اور کہیں گے کچھ نہیں اور یہ لوگ کریں گے خاک نہیں اور دنیا بھر میں غل مچاتے پھرینگے وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کے خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں دنیاوی غرض ان کی نہیں ہوتی اور یہ جو کچھ کم و بیش کرتے بھی ہیں تو محض دنیاوی اغراض کے لئے اور اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ ان دنیا داروں کی ہمدردی کو بقاء دوام نہیں

ہوتا کیونکہ دنیا جس کے لئے یہ ہمدردی کرتے ہیں خود فانی اور متغیر ہے اس کے حالات اغراض ومصالح بھی بدلتے رہتے ہیں صبح کچھ ہے تو شام کچھ ہے تو جب مصالح دنیا متغیر ہیں تو ان کی ہمدردی باقی کیونکر ہوسکتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں بھی تغیر پیش آئے ممکن ہے کہ کل سچ بولنے میں دنیوی مصلحت تھی اور آج جھوٹ بولنے میں دنیوی مصلحت ہے اور اہل اللہ کی ہمدردی قائم و دائم ہے کیونکہ جس ذات کے خوش کرنے کے لئے وہ ہمدردی کرتے ہیں وہ خود غیر فانی ہے پھر غرض ان کی ایک متعین ہے خدا تعالیٰ کو خوش کرنا اور وہ جس امر سے آج خوش ہیں قیامت تک اسی سے خوش ہیں نیز دنیا داروں کی ہمدردی تو محض قومی ہمدردی ہے یعنی وہ جو کچھ کم زیادہ ہمدردی کرتے ہیں اپنی قوم سے من حیث القوم کرتے ہیں اور اہل اللہ کی ہمدردی عام ہمدردی ہے کہ وہ ہر شخص سے وہی برتاؤ شفقت کا کرتے ہیں جو اپنوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جانوروں تک سے ہمدردی ہوتی ہے اُن کی وہ شان ہوتی ہے جس کو فرمایا ہے وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کہ تمام جہان کے لئے ان کی ذات بابرکات رحمت خداوندی ہوتی ہے۔ چنانچہ مُلّا دُپیازہ نے اپنے آل نامہ میں لکھا ہے، الرّسول خیر خواہ دشمناں۔ حضرت جنید کو ایک مرتبہ خلیفہ وقت نے کسی بات پر برہم ہو کر بلا بھیجا۔ حضرت شبلی بھی ساتھ تھے۔ جب رو برو ہوئے تو خلیفہ نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ حضرت شبلیؒ چونکہ نوجوان تھے نیز ان کے پیر کو بُرا بھلا کہا جارہا تھا آپ کو جوش آیا قالین پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی آپ نے اُس پر نظر ڈالی تو وہ شیر مجسم ہو کر خلیفہ کی طرف خشم آگیں نظر سے دیکھنے لگا حضرت جنیدؒ کی جو اس پر نظر پڑی تو آپ نے حضرت شبلیؒ کو گھور کر دیکھا اور اس شیر کو تھپک دیا وہ مثل سابق شیر قالین ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں حضرت شبلیؒ نے پھر اُسے اشارہ کیا اور وہ پھر مجسم ہو کر سامنے ہوا اس مرتبہ خلیفہ وقت کی نگاہ بھی اُس پر پڑی خوف کے مارے تھرّا گیا اور دست بستہ اپنی جرأت کی معافی چاہی حضرت جنیدؒ نے اس شیر کو تو فوراً مثل سابق کر دیا اور خلیفہ وقت سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ

سکتا آپ خلیفۂ وقت ہیں آپ کی اطاعت اور ادب ہم پر واجب ہے یہ لڑکا ہے آداب شاہی سے واقف نہیں ہے آپ کا جو دل چاہے کیجئے۔

صاحبو! آپ نے سُنا یہ ہوتی ہے ان حضرات کی شان۔ دنیادار اگر اطاعت کرتے بھی ہیں تو اسی وقت تک اطاعت کرتے ہیں کہ اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے ورنہ اطاعت اور فرماں برداری سب ختم ہو جاتی ہے ان حضرات کی یہ حالت ہے کہ گو سب کچھ کر سکتے ہوں مگر کچھ نہیں کرتے کیونکہ جانتے ہیں کہ امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اَطِیْعُوْا اِذَا اُمِّرَ عَلَیْکُمْ تو ان حضرات کی جو بات بھی ہوگی پائدار ہوگی اس لئے کہ یہ پورے شفیق اور سچے رفیق ہیں اس سے زیادہ کیا شفقت ہوگی کہ شیر کو مٹا رہے ہیں اور بادشاہ کو خبر بھی نہیں کرتے اس لئے کہ مقصود اس کے ساتھ ہمدردی کرنے سے خدا کو خوش کرتا ہے۔ حضرت مجدد صاحب کی حکایت لکھی ہے آپ کے زمانہ میں ایک شیخ تھے آپ کو مکشوف ہوا کہ ان کا نام خدا تعالےٰ کے یہاں اشقیا میں لکھا ہوا ہے تو باوجودیکہ ہمعصری میں ایک قسم کی منافست ہوتی ہے لیکن آپ نے ان کو اطلاع کئے بغیر برابر ان کے لئے دعا کی کہ اے خدا ان کا نام اشقیاء سے محو کر کے سُعداء کی فہرست میں لکھ دیجئے۔ دیکھئے ان بزرگ کے ساتھ کتنی بڑی ہمدردی کی لیکن ان کو خبر بھی نہیں ہونے دی نہ ہمعصری کی وجہ سے آپ کے قلب میں کسی قسم کی منافست کی شان پیدا ہوئی بعض لوگ شیخ نہیں ہوتے مگر وہ دعویٰ شیخیت کا کرتے ہیں اور ان کو اہل حق سے کشیدگی ہوتی ہے اور ہونا عجب بھی نہیں کیونکہ یہ حضرات خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اہل باطل کو عداوت ہوتی رہی ان کے ساتھ بھی اہل باطل کو پرخاش ہونی چاہئے۔ محققین نے اس کو علامات کمال میں سے لکھا ہے۔ حضرت سلطان جی کے زمانے میں ایک بزرگ تھے ان پر اتفاق سے ایسا افلاس آیا کہ تمام مال و متاع ختم ہو کر صرف ایک لونڈی رہ گئی جب اس لونڈی نے دیکھا کہ اب کچھ نہیں تو اُن سے عرض کیا کہ اب مجھے بیچ دیجئے آخر میں کس کام کی ہوں گو یہ ضرور ہے کہ ؎

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

مگر کسی دیندار کے ہاتھ بیچے گا آپ نے کہا کہ میں تجھے ایسے شخص کے ہاتھ بیچوں گا کہ اس سے زیادہ اس وقت کوئی دیندار نہیں یعنی حضرت نظام الدین سلطان جیؒ کے ہاتھ اس لئے عرض کیا کہ حضور ہے تو گستاخی لیکن ان بزرگ کی بزرگی میں تو مجھے شبہ ہے کیونکہ بزرگی کی علامت لے یہ بات بھی ہے کہ کوئی نہ کوئی تو اس کو برا کہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ان کو کوئی بھی برا نہیں کہتا۔ افسوس آج کل یہ علامت بزرگی سے سمجھا جاتا ہے کہ جہاں گئے اس رنگ کے ہوگئے کہ ساری دنیا خوش رہے۔ گنگا پر گئے گنگارام جمنا پر گئے جمنارام۔ نیز حضرت سلطان جی کے در پر پڑے پڑے اکابر دنیا سلاطین و وزراء تک دست بستہ آتے تھے اس لئے بھی اس کو شبہ ہوا۔ اس موقعہ پر ایک حکایت یاد آگئی کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاں ایک وزیر حاضر تھا کھانے کا وقت آیا خادم نے کھانا لانے کی اجازت چاہی وزیر کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر آج مچھلی کے کباب ہوں تو خوب ہو حضرت سلطان جی اس کے خطرے پر مطلع ہوگئے خادم سے فرمایا ذرا ٹھہر تھوڑی دیر میں اس نے پھر دریافت کیا آپ نے پھر یہی جواب دیا حتیٰ کہ کچھ دیر کے بعد ایک شخص ایک خوان میں مچھلی کے کباب لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ مچھلی کے کباب آپ کے لئے لایا ہوں آپ نے دسترخوان لگانے کا حکم دیا وزیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا آپ نے وزیر سے فرمایا لیجئے مچھلی کے کباب حاضر ہیں مگر ذرا دقت کی گنجائش رکھ کر فرمائش کیا کیجئے۔ غرض آپ کے اندر ایک محبوبیت کی شان تھی۔ ایک حضرت علاء الدینؒ تھے کہ گولر کھا کر بسر کرتے تھے اور کبھی کبھی وہ بھی نہ ہوتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان است   بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان است

(پھول کے کان میں جو بات تو کہے کہ وہ تیرا تابعدار ہے اور عندلیب سے جو کچھ بھی آوے کہتے ہیں وہ شکوہ کرتا ہے)

ہر ایک کا رنگ و بو الگ ہے کوئی کسی شان کا ہے کوئی کسی شان کا ہے تو حضرت سلطان جی کی یہ حالت تھی کہ آپ کے در پر سب سر نیاز خم کرتے تھے۔ اس لئے اس لونڈی کو

آپ کی بزرگی میں شبہ ہوا ان بزرگ نے اس سے کہا کہ میں تجھے بیع خیار کے طور پر بیچوں گا دو تین دن کے اندر تو ان کی حالت دیکھ لینا پھر اگر تیری مرضی ہوگی تو رہنا ورنہ میں تجھے واپس لے لوں گا۔ غرض آپ نے حضرت سلطان جی کے ہاتھ اس کو فروخت کردیا وہ چونکہ آپ کی پورے طور پر معتقد نہ تھی اس تکرمیں لگی رہی حضرت سلطان جی کو کشف کے ذریعے سے اس کے وسوسہ پر اطلاع ہوگئی۔ آپ نے اس سے فرمایا جاکر پڑوس سے آگ لے آوہ پڑوسن کے ہاں گئی اور کہا حضرت جی کے ہاں تھوڑی آگ کی ضرورت ہے پڑوسن نے حضرت کا لفظ سن کر آپ کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا اور کہا ڈاکو کو حضرت کہتے ہیں لونڈی یہ سن کر بہت خفا ہوئی اور بگڑ کر واپس چلی آئی حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اب تو معلوم ہوگیا کہ مجھے سب اچھا نہیں سمجھتے دیکھ میری پڑوسن ہی مجھ کو کیسا بُرا سمجھتی ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت یہ میری جہالت تھی واقعی آپ صاحب کمال ہیں پھر مدت خیار گذرنے کے بعد اس کے پہلے مالک آئے اور آکر اس سے پوچھا اُس نے عرض کیا کہ حضور واقعی یہ بزرگ ہیں اب آپ کو واپس لینے کی ضرورت نہیں۔ غرض مقبول عام ہونا کوئی بزرگی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عدم کمال کی علامت ہے۔ کاملین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُن کو اگر سب بھی بُرا کہیں تب بھی یہ کسی کو کچھ نہ کہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان حضرات کو غصہ نہیں آتا' غصہ ضرور آتا ہے مگر وہ غصہ خدا کے لئے ہوتا ہے اپنے نفس کے لئے نہیں ہوتا' اپنے نفس کے لئے اُن کی وہی حالت ہوتی ہے جس کو حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں جو کہ دس برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے کہ مَا قَالَ لِیْ قَطُّ لِمَا فَعَلْتَ کہ کبھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں کام تو نے اس طرح کیوں کرلیا اُس طرح کیوں نہیں کیا حتیٰ کہ بوجہ بچپن کے یہ اس قدر بے تکلف تھے کہ ایک مرتبہ آپ نے کسی جگہ ان کو جانے کو فرمایا تو انھوں نے صاف کہدیا کہ میں تو نہیں جاتا مگر دل میں یہ تھا کہ ضرور جاؤں گا چنانچہ گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انکار پر خفا نہیں ہوئے۔ اگر کوئی کام اُن سے بگڑ جاتا تو آپ فرماتے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا مگر اُن پر خفا نہ ہوتے تھے آج کل کے

روشن خیال لوگوں نے مسئلہ تقدیر کو بالکل ہی چھوڑ دیا کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر ہی سے مسلمانوں کو تنزل ہو رہا ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقدیر ہی کے مسئلے کی بدولت ترقی ہوئی ہے اس سے تنزل ہرگز نہیں ہوا کیونکہ مدار ترقی کا ہمت پر ہے اور ہمت قائل تقدیر کی برابر کسی کو نہیں ہو سکتی منکر تقدیر تو فقدان اسباب کے وقت جی چھوڑ دیتا ہے اور معتقد تقدیر اس وقت بھی خدا تعالیٰ پر نظر کر کے ہمت نہیں ہارتا اس کا مسلک یہ ہے کہ ؎

عقل دراسباب میدارد نظر — عشق میگوید مسبب را نگر

(عقل اسباب اور وسائل پر نظر رکھتی ہے مگر عشق و محبت یہ کہتی ہے کہ اسباب کے پیدا کرنے والے کو دیکھ)

اسی طرح اس شخص کو کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ اپنے دل کو یہ سمجھ کر تسلی دے لیگا کہ لَنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہونچ سکتی بجز اس کے کہ جس کو خدا تعالیٰ نے ہمارے واسطے لکھدیا ہے) غرض پوری راحت تقدیر ہی کے ماننے سے ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر دو شخص ایسے ہوں کہ تموّل میں بھی برابر ہوں دنیاوی عیش بھی دونوں کو برابر حاصل ہو عقل اور مزاج اور قوت وغیرہ سب میں یکساں ہوں دونوں کے ایک ایک بیٹا بھی ہو۔ غرض ہر طرح کے سامان دونوں میں برابر ہوں کسی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ ہو مگر اتنا فرق ہو کہ ایک مسئلہ تقدیر کا قائل اور دوسرا منکر ہو اور اتفاق سے ایک ہی تاریخ میں ان دونوں کی اولاد مرجائے اور فرض کیجئے کہ ان کے مرنے کا ظاہری سبب یہ ہوا ہو کہ دونوں کی بیماری تشخیص ہونے میں اور علاج میں غلطی ہوگئی تھی تو اب بتلایئے کہ ان میں سے کس کا صدمہ جلدی ختم ہوگا اور کس کا صدمہ دیرپا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو تقدیر کا قائل ہے اس کو بہت جلد راحت نصیب ہو جائے گی۔ کیونکہ صدمہ پڑتے ہی اس کو یہ خیال ہوگا کہ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (جو کچھ بھی پہنچی تم کو مصیبت میں سے بس وہ خدا کی اجازت سے پہنچی ہے) کہ خدا کو یہی منظور تھا نیز اس کو فوراً خیال ہوگا کہ ممکن ہے اس کی موت ہی

ہیں کوئی مصلحت ہو ان خیالات کے آتے ہی اس کا صدمہ ختم ہو جائے گا برخلاف منکرین تقدیر کے کہ اس کو ساری عمر یہ غم لگا رہے گا۔ کبھی سوچے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر نہ کی ورنہ ضرور میں کامیاب ہوتا اور لڑکا بچ جاتا۔ کبھی کہے گا کہ فلاں بد پرہیزی نہ کی جاتی تو ہرگز نہ مرتا۔ غرض اسی طرح کے پریشان کن خیالات میں تمام عمر غلطاں پیچاں رہے گا۔ اب میں پوچھتا ہوں عقلاء زمان بتلایئے کہ اس موقعہ پر پریشانی کا دفعہ کرنا اور راحت حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری ہے تو ذرا مہربانی کر کے بتلا دیجئے کہ سوائے مسئلہ تقدیر کے ماننے کے اور کونسی ایسی صورت ہے کہ اس شخص کی پریشانیاں دور کر دی جائیں اور اُسے راحت نصیب ہو جائے۔ افسوس شریعت نے کتنا پاکیزہ مسئلہ ہم کو دیا اور ہم نے اس کی یہ قدر کی۔ ہماری وہ حالت ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۲۳ برس تک وحی کا بوجھ اُٹھا اُٹھا کر اس کی سختیاں برداشت کر کے ہم کو زر و جواہر دیئے اور ہم نے سنگریزوں کی طرح اُنکی ناقدری کی وحی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپؐ حضرت زید بن ثابت کی ران پر زانوں رکھے بیٹھے تھے اس وقت وحی نازل ہوئی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کَادَانْ تَرُضَّ فَخِذِیْ یعنی کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ران پاش پاش ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ آپ اونٹنی کے اوپر سوار تھے اسی حالت میں وحی نازل ہوئی اس قدر شدت تھی کہ اونٹنی سہار نہ سکی اور بیٹھ گئی۔ غرض کتنی تکالیف برداشت کر کے عالم غیب سے فیوض لئے اور آپ کو مفت دیئے گویا تخم ریزی کی کھیت کاٹا، آٹا بنایا، پکایا اور لقمہ تیار کر کے آپ کے منہ میں رکھ دیا مگر آپ ہیں کہ اس کو منہ سے باہر پھینکے دیتے ہیں۔ صاحبو! اگر قیامت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا ہی دریافت فرما لیا کہ میرے احکام کی تم نے کیا قدر کی تو بتلاؤ تم کیا جواب دو گے۔ یہ سب بیچ کے مضامین استطرادی تھے بمناسبت مضمون شفقت کے ان کا ذکر آگیا۔ اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ کفار بہت ستاتے تھے (اور جب آج کل مدعیانِ موافقت ہی طرح طرح سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو صدمہ دیتے ہیں تو وہ لوگ تو کافر تھے آپ کو ماننے بھی نہ تھے جتنا ستاتے کم تھا) اور آپ غایت شفقت رکھتے تھے تو آپ کو ان کی مخالفتوں سے بہت غم ہوتا تھا اور اُن کے مآل کو سوچ کر بہت کُڑھتے تھے اور چونکہ واقعات بہت زیادہ تھے جن کی وجہ سے غم بھی بہت زیادہ ہو گیا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے جا بجا آپ کی تسلی فرمائی ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے جس کو تلاوت کیا گیا چنانچہ اسی کی تمہید و تائید میں اس آیت کے پہلے فرماتے ہیں اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ الخ (آپ اُن لوگوں کو ڈراتے ہیں جو اپنے پروردگار سے غائبانہ طور پر ڈرتے ہیں اور نماز کو اس کے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں) یعنی آپ کے انذار سے منتفع ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ قلب میں خشیت ہو اور خدا کی اطاعت ہو اور یہ اس سے معرّا ہیں اور آگے فرماتے ہیں وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ الخ (اور نہیں برابر ہو سکتے اندھے اور دیکھنے والے کہ اندھے اور بینا تاریکی اور نور سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہو سکتی تو یہ لوگ تو اندھے ہیں اور ان کے قلب تاریک محض ہیں پھر یہ کیونکر منتفع ہو سکتے پھر آپ اُن کے حالات سے غمگین کیوں ہوتے ہیں آگے ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ (بے شک خدا تعالیٰ سناتے ہیں جس کو چاہتے ہیں اور نہیں سنا سکتے ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں نہیں آپ مگر ڈرانے والے) کہ خدا جس کو چاہیں سنا دیں آپ ان لوگوں کو جو کہ بے حِسّی میں مثل مُردوں کے ہیں نہیں سنا سکتے (آپ اس غم میں نہ پڑیں) آپ تو ایک نذیر ہیں آگے فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی پس نکالا ہم نے اس کے ذریعہ سے رنگ برنگ کے پھل اور پہاڑوں سے چکنے سفید اور سرخ پتھر جن کے رنگ ہیں اور انوکھے نہایت سیاہ پتھر) حاصل یہ کہ جس طرح ثمرات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اعیان بھی مختلف ہیں۔

آگے ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (لوگوں میں سے (انسان) چوپاؤں اور جانوروں میں سے ان کا رنگ بھی اسی طرح مختلف ہوتا ہے) کہ انسانوں میں چوپاؤں میں سب میں مختلف طرح کے ہوتے ہیں پھر اگر یہ لوگ بھی اس خاص طور کے ہوگئے تو تعجب کیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (بے شک اُس کے بندوں میں سب سے زیادہ ڈرنے والے علماء ہیں) یعنی اوپر معلوم ہوا ہے اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ الخ کہ انذار سے انتفاع موقوف ہے خشیت پر اور یہاں فرماتے ہیں کہ خشیت ان لوگوں میں ہوگی کہ جن لوگوں میں علم ہو کہ خلاصہ یہ ہوا کہ آپ کے انذار سے وہ منتفع ہوسکتا ہے جس میں خشیت ہو اور خشیت ان میں ہوگی کہ جن میں علم ہو تو آپ کے انذار سے منتفع وہ لوگ ہوں گے جن میں علم ہو کیسی کامل تسلی فرمائی اور منتہا کیسی اچھی چیز پر رکھا کہ وہ محسوس ہے تاکہ آپ کی پوری پوری تسلی ہو جائے کہ جہاں آپ علم دیکھیں وہاں اہتمام بھی کریں اور جہاں یہ نہ ہو وہاں غم نہ اٹھائیں اور اس آیت سے کئی فائدے معلوم ہوئے ایک تو یہ کہ علماء کو چاہئے کہ وہ ایسوں پر بھی شفقت کیا کریں دوسرے یہ کہ غم کی بھی ایک حد ہونا چاہئے کہ اس حد سے آگے نہ بڑھا جائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو قوی تھے ہم ضعیف ہیں اگر غم کا زیادہ بار ہم پر پڑے گا تو اندیشہ ہے کہ ہم کو مالیخولیا نہ ہو جائے تو ایسے لوگوں کے لئے زیادہ اہتمام کے بھی درپے نہ ہوں۔ یہ شریعت کی خوبی ہے کہ اُس نے افعال حسنہ اور اخلاق حسنہ کی بھی حدود مقرر کر دیں کہ ان سے آگے نہ بڑھا جائے میں اس کی کچھ تفصیل کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (میں آپ سے درخواست کرتا ہوں آپ کے ایسے خوف کی جو ہمارے اور آپ کی نافرمانی کے درمیان حائل ہو جائے) اور یہ اس لئے بیان کرتا ہوں کہ آجکل کے عقلاء معلوم کرلیں کہ تعلیم محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر غامض ہے کہ کوئی پہلو اس میں چھوڑا نہیں گیا۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہم تو اس کے قائل ہیں اگر منکر ہوتے تو ہمارے سامنے اس کا بیان کرنا ضروری تھا تو میں کہوں گا کہ حضور اگر قائل ہو

اور واقعی دل سے یہ کہتے ہو تو پھر احکام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دخل کیوں دیتے ہو۔ اور اگر تم کو کسی حکم کی حکمت نہیں معلوم ہوتی تو اس کو خاموشی کے ساتھ مان کیوں نہیں لیتے آج کل ایسے تو کم ہیں کہ وہ یوں کہدیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں مانتے مگر ایک اور غلطی میں مبتلا ہیں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم پر حکمت ہے اور فلاں حکم میں کوئی حکمت معلوم نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں بلکہ مولویوں کا بنایا ہوا ہے اور یہ مرض اس زمانہ بھی تھا کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ آپ کا تراشا ہوا ہے۔ چونکہ یہ تکذیب آیات کی تھی آپ کو اس سے حزن ہوتا تھا جس پر یہ آیت تسلی کے لئے نازل ہوئی قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (تحقیق کہ ہم جانتے ہیں کہ بیشک وہ آپ کو رنجیدہ کرے گا وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں پس بیشک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن بیشک (یہ) ظالم ہیں خدائے تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں) اس کی مشہور تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ ان کے اقوال سے مغموم ہوتے ہیں سو آپ کیوں غم کرتے ہیں یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے یہ تو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں مگر میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو ان کے اقوال سے رنج ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے کہ آپ اس پر صبر کرلیں بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں جس پر آپ کو صبر ہو ہی نہیں سکتا اور اس کو کوئی تفسیر بالرائے نہ سمجھے کیونکہ تفسیر بالرائے وہ ہے جو قاعدہ شرعیہ و قواعد عربیہ کے خلاف ہو اور یہ تفسیر نہ قواعد عربیہ کے خلاف نہ شرعیہ کے، یہ مضمون کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی برائی سننا اتنا ناگوار نہ ہوتا تھا جتنا خدا کی برائی سننا خود حدیث سے ثابت ہے۔ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذمم رکھا تھا اور یہی نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ناگوار نہیں ہوا بلکہ ایک مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اُنْظُرُوْا كَيْفَ صَرَفَ اللّٰهُ عَنِّيْ شَتْمَ

قریش یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد (دیکھو کس طرح پھیر دیا
خدا تعالیٰ نے قریش کی گالیوں کو جو گالیاں دیتے برائی کیے ہوئے کو اور لعنت بھیجتے
برائی کیے ہوئے (مذمم صلی اللہ علیہ وسلم) کو حالانکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں کفار
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بجائے محمد (تعریف کیے ہوئے) مذمم (برائی کیے ہوئے) کہا
کرتے تھے) اور خدا کو برا کہنے میں کبھی آپ نے اس قسم کی توجیہ نہیں کی بلکہ آپ کو
سخت ناگوار گذرتا تھا چاہے جس انداز سے بھی وہ برا کہتے۔ تفسیر بالرائے کی مثال
میں آپ کو بتلاتا ہوں آج کل کے روشن دماغوں میں سے ایک صاحب نے ربوا کو
حلال لکھا اور فرمایا کہ احل اللہ البیع وحرم الربوا (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال
فرمایا اور سود کو حرام کر دیا ہے) میں یہ لفظ ربوا نہیں بلکہ ربا بضم الراء ہے جس کے
معنے ہیں اچکنے کے گویا یہ فارسی کے مصدر ربودن سے ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اعراب تو قرآن پر تھے نہیں بعد میں مولویوں نے جو چاہا اعراب
لگا دیا۔ غرض قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج اس
واسطے ہوا تھا کہ وہ لوگ خدا کو برا بھلا کہتے تھے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتے
تو آپ کو اس قدر ناگوار نہ ہوتا اسی طرح ہم لوگ بھی خوش ہیں کہ آج کل کے
روشن دماغ جو کچھ الزام لگاتے ہیں ہمیں پر لگاتے ہیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کو کچھ نہیں کہتے مگر ان پر اتنا افسوس ہے کہ انھوں نے محض اس وجہ سے کہ کسی
قول میں ان کو کوئی حکمت معلوم نہیں ہوئی اس قول کو قول نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم ہونے کا انکار کر دیا۔ میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ صاحبو کیا تمہاری عقل
تمام حکم کو حاوی ہو گئی ہے ہرگز نہیں۔ جب یہ ہے تو بس تمہاری یہ حالت ہونی
چاہئے کہ ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علت از کار تو

(زبان تیرے اقرار سے تر و تازہ کرتا)

اور اگر عقل سے کام لو تو صاف طور سے معلوم ہو جائے کہ علماء سے جو یہ پوچھا جاتا ہے

کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے یہ سراسر غلطی ہے اور علماء کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ شفقت کر کے جواب کی مصیبت میں نہ پڑیں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کسی جج کے یہاں آپ کا کوئی مقدمہ ہو اور وہ کسی قانون کی رو سے اس مقدمہ کو خارج کر دے تو کیا آپ اس کے بنگلے پر پہونچ کر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ اس قانون کے تقرر میں کیا حکمت ہے اور اگر آپ دریافت کریں تو کیا جج کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کو اس قانون کی حکمت بتلائے اور سمجھا دے کہ یہ وجہ ہے اگر کہیے کہ ضروری ہے تو میں آپ کو قوانین کے متعلق چند سوالات دیتا ہوں ذرا مہربانی فرما کر ان کی حکمت جج صاحب سے لکھوا دیجئے اور اگر کہیے کہ اُن کے ذمہ ضروری نہیں کیونکہ وہ عالم قانون ہے واضع قانون نہیں اور حکمت بتلانا واضع قانون کا منصب ہے تو میں کہتا ہوں کہ علماء بھی تو عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں پھر ان سے کیوں قوانین شرعیہ کی حکمتیں دریافت کی جاتی ہیں اور ان کا انکار زبردستی کا جواب کیوں سمجھا جاتا ہے اور اگر ان کا انکار زبردستی کا جواب ہے تو کیا وجہ ہے جج صاحب کا انکار زبردستی کا جواب نہیں سمجھا جاتا۔ ایک جج کے جواب کی وقعت کے برابر علمائے امت کے جوابوں کی قدر نہیں اور علماء تو کیا واضع قانون ہوتے خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی واضع و بانی قانون نہیں ہیں صرف عالم و حاکم بالقانون ہیں اور یہیں سے مسلمانوں کی ایک اور غلطی بتلاتا ہوں کہ اکثر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بانی اسلام کے لقب سے ملقب کرتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ یہ لقب عیسائیوں نے تجویز کیا تھا کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے بلکہ آپ کے احکام کو آپ کا تجویز کردہ کہتے ہیں مگر مسلمانوں نے محض تقلیداً یہ لفظ اختیار کر لیا۔ صاحبو! یاد رکھو بانی اسلام صرف خدا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حالت ہے کہ ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ان کا کہا ہوا خدا کا کہا ہوا ہے اگرچہ عبداللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے

زبان مبارک سے نکلے)
تو آپ کا ارشاد خدا کا ارشاد ہے وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے وہ تو وحی من جانب اللہ ہے جو ان کی طرف بھیجی گئی) اور اس سے اجتہاد کی نفی نہیں ہوتی آپ اجتہاد فرماتے تھے مگر وہ بھی جبکہ وحی اس کی تائید کرتی یا وحی اس پر سکوت کرتی حکم میں وحی کے ہو جاتا تھا کہ اس کا منکر بھی لیسا ہی کافر تھا جیسے وحی صریح کا منکر آپ کی شان بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں بانسلی ہو اور وہ اس کو بجا رہا ہو تو ظاہر میں جو کچھ آواز نکلتی ہے بانسلی سے نکلتی ہے ناواقف یہی سمجھتا ہے کہ یہ بانسلی بول رہی ہے لیکن جو جاننے والا ہے وہ جانتا ہے کہ بانسلی کے ایک دوسرا منہ بھی ہے جو بجانے والے کے منہ سے ملا ہے یہ بجانے والے کی آواز ہے جو کہ اُس منہ سے ہو کر بانسلی میں آرہی ہے اور بانسلی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اسی شان کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؂

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　یک دہاں پنہانست در لبہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　ہائے و ہوئے در فگندہ در سما

اور لیجئے شجرۂ وادی ایمن نے انی انا اللہ کہا تھا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ آواز شجرہ کی تھی ہرگز نہیں بولنے والا کوئی دوسرا ہی تھا شجرہ محض مظہر تھا تو جب شجرہ سے کلام خداوندی نے ظہور کیا تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے کلامِ خداوندی کا ظہور ہو تو کیا تعجب ہے اور جب یہ بات ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بانی اسلام کہاں سے ہوئے۔ مگر ہمارا مذاق کچھ ایسا بگڑا ہے کہ ہم نے اپنے گھر کی سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور غیر قوموں کی ہر چیز کو اختیار کر لیا اگرچہ وہ ہم کو اور ہمارے مذہب کو مضر ہی ہو۔ چنانچہ بانی اسلام کا لقب عیسائیوں نے اپنے انکار کی وجہ سے دیا تو ہم نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ علیٰ ہذا معاشرت کہ اس کا ہر ہر پہلو ہم نے غیروں سے لے رکھا ہے وہی بات جو کل علماء کہتے تھے اور اس کو خاطر میں نہ لایا جاتا تھا اگر دوسری

توہیں کرنے لگیں اُس کی ضرورت اُن کو بھی محسوس ہونے لگی چنانچہ علماء نے مدت تک نہایت شدومد کے ساتھ کہا کہ علماء کی ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے کہ وہ صرف خدمت دین کا کام کریں دوسرا کوئی کام ان کے سپرد نہ ہو تو علماء پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ اور سوال کیا جاتا تھا آخر یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے حالانکہ یہ اعتراض واقع میں اپنے اوپر تھا نہ کہ علماء پر ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اے بھولے مرد اس شیر کی طرح جو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے)

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص نے نکاح کیا اور نکاح کرنے کے بعد بیوی کے پاس جاکر کہنے لگا کہ تم نے نکاح تو کیا لیکن یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ بیوی اس کو کیا جواب دے گی یہی تاکہ میاں جب میں تمہارے نکاح میں آگئی تو میری تمام ضروریات کا تکفل خود بخود تمہارے ذمہ ہوگیا۔ اب میں تم سے لے کر کھاؤں گی۔ خلاصہ اس جواب کا یہ ہوا کہ میں چونکہ تمہارے کام میں محبوس ہوں اور محبوس کا نفقہ مَنْ لَهُ الْحَبْسُ پر ہوتا ہے اس لئے میرا نفقہ تم پر ہے۔ تو حضرات مدت تک مولوی خاموش رہے مگر اب آپ صاف صاف کہلاتے ہیں تو سنئے کہ مولوی آپ کی خدمات میں محبوس ہیں تو بقاعدہ مذکورہ اُن کا نفقہ آپ کے ذمہ ہے اور یہ قاعدہ تمدنی بھی ہے شرعی بھی۔ اول شرعی پہلو کو بیان کرتا ہوں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (اس میں حق ہے ان فقراء کا جو کہ اللہ کے راستے میں گھرے ہوئے ہیں زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے جاہل ان کو غنی گمان کرتے ہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے)

دیکھو! لام لِلْفُقَرَآءِ میں استحقاق کا ہے یعنی یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اگر نہ دو تو نالش کر کے لے سکتے ہیں گو دنیا میں نالش نہ ہو سکے لیکن خدا تعالےٰ کے ہاں قیامت میں دیکھئے گا کتنی ڈگریاں آپ پر ہوتی ہیں۔ خدا تعالےٰ نے

آیت میں ان لوگوں کو بلفظ فُقَرَاءُ ذکر فرمایا ہے۔ فقیر آجکل کے عرف میں ایک ذلیل لفظ ہے مگر یہ ذلت اگر ذلت ہے جیسا کہ تمہارے نامعقول عرف نے سمجھ لیا ہے تو صرف انہیں لوگوں کو نہیں ساری دنیا کے لئے فرماتے ہیں یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ (اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو) تو ہم کو تو فخر ہے کہ ہم خدا کے فقیر ہیں ؎

یا اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں لیکن پھر اس ساقی اور اس پیمانہ میں مست ہیں)

غرض جو لوگ دین کے کاموں میں وقف ہیں ان کا حق آپ کے ذمہ ہے اور علامت وقف ہونے کی یہ ہے کہ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ یہ وہی بات ہے جس کو آپ بروے طعن مولویوں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپاہج ہو جاتے ہیں صاحبو! بیشک اپاہج ہیں اور کیوں نہ ہوں جب خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں۔ اگر طاقت سے مراد شرعی طاقت ہے کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں اس مسئلے کو میں ایک مثال دیکر زیادہ واضح کرتا ہوں۔ ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جو کہ سرکاری ملازم تھے ایک مطبع کر لیا شدہ شدہ حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانہ آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دیدو ورنہ مطبع بند کردو۔ آخر اس حکم کی کیا وجہ۔ وجہ یہی ہے کہ مطبع کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اب تو غالباً تسکین ہوگئی ہوگی کیونکہ سفید رنگ والوں کا بھی اس پر اتفاق ہے یہ تو شرعی طور پر تھا۔ اب میں تمدنی طور پر اس مسئلے کو بیان کرتا ہوں کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام قوم کا ایک ایک پیسہ دو دو پیسہ جمع کر کے جس کو خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ خزانہ دراصل میں اسی مجموعے کا نام ہے جو کہ تمام قوم سے چن چن کر جمع کیا جاتا ہے کسی نے پوچھا تھا کہ بیوی فوج کسے کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ میرا میاں تیرا میاں

یعنی بھی موجود ہے۔ تو آپ کا پیسہ اُن کا پیسہ اسی کے مجموعے کا نام خزانہ ہے تو واقع میں خزانہ قوم کی چیز ہے اب سمجھئے کہ اس خزانہ سے جو تنخواہ دی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ اور پارلیمنٹ ایسے قومی کاموں میں مصروف ہے کہ وہ دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتی اس لئے قوم کے مجموعہ مال میں سے اس کو نفقہ دیا جاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو قومی کام میں مشغول ہو اس کا حصہ قوم کے اموال میں ہے۔ اگر کہا جائے کہ خزانہ تو سلطنت کی ملک ہو گیا تو سمجھو کہ وہ سلطنت مجموعہ افراد قوم کی نائب ہے۔ تو سلطان کے ہاتھ سے جو کچھ پہونچ رہا ہے وہ واقع میں قوم ہی کے ہاتھ سے پہونچ رہا ہے اگرچہ قوم کا ہاتھ ایک حجاب میں درست سلطان کی آڑ میں آ گیا ہے۔ اب تو غالباً آپ پورے طور پر اس کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اسی کو علماء مدت تک کہتے رہے۔ مگر چونکہ دوسری قوموں نے اس کو شروع نہ کیا تھا جیسے عیسائیوں کی مشن کہ ان کا خلاصہ یہی ہے تو ہمارے مسلمانوں کو خبر نہ تھی اور سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ اب جبکہ ایک دوسری ہمسایہ قوم اٹھی اور اس نے جا بجا گرو کل قائم کئے اور ایک جماعت کی جماعت کو اپنے مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تو اب بعض بعض مسلمانوں کو جنبش ہوئی کہ جب ہندوؤں نے اس کام کو کیا تو یہ کام بیشک ضروری ہے۔ افسوس ہے تعلیم قرآن محرک نہ ہوئی تعلیم حدیث سے جنبش نہ ہوئی۔ اقوال علماء سے ہوش نہ آیا۔ حرکت ہوئی تو برادران وطن کی مثال دیکھ کر۔ بات بھی دور پہونچ گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب صاحب جج کے اس جواب سے کہ ہم عالم قانون ہیں ہم سے حکمت کا سوال نہیں ہو سکتا تسلی ہو جاتی ہے تو کیا وجہ کہ اقوالِ علماء سے تسلی نہیں ہوتی اور ان کو زبردستی کا جواب کہا جاتا ہے اور ان کو عاجز سمجھا جاتا ہے کیا ایسے منہ سے نکلی ہوئی بات کہ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ سے بھی آشنا نہ ہو با وقعت سمجھی جائے اور وارثانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو عجز پر محمول کرنا فساد مذاق نہیں ہے۔ اب علماء کو بھی چاہیئے کہ وہ ضابطہ پر رہیں اور کہہ دیں

کہ خدا سے پوچھو وہی واضح قانون ہیں۔ بس سُنار کی کھٹ کھٹ سے یہ لوہار کی ایک بہت اچھی ہے۔ غرض یہ معلوم ہوگیا کہ گو قانون کی حکمت نہ بتلائی جائے مگر کوئی قانون ایسا نہیں کہ وہ پُر حکمت نہ ہو اسی لئے میں یہ نظیریں بتلاتا ہوں کہ جہاں حکمت معلوم نہ ہو وہاں یہ نہ سمجھو کہ حکمت نہیں ہے سو وہ نظیر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَسْئَلُکَ مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ (میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ سے ڈرتے رہنے کا اس چیز سے جو حائل بنے ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان) صاحبو! غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے خوف مانگتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قید لگا دی ہے کہ خوف اس قدر ہو کہ گناہ نہ ہونے دے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ خوف جب حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو موجب تعطل ہوجاتا ہے اور انسان کسی قابل نہیں رہتا۔ دیکھئے ہم لوگ پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں مگر سمجھتے وہی لوگ جن کی شان یہ ہے کہ ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　بے کتاب و بے معید و اُوستا

(اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم دیکھتا ہے)

کہ ان کے اندر وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم انبیاء بھرے ہیں۔ چنانچہ الحمد للہ میں بھی انہی کی تقلید کر کے کہتا ہوں کہ شدت خوف سے امور معاش اور امور دین سب معطل ہوجاتے ہیں۔ اس میں راز یہ ہے کہ جب کوئی چیز حدِ اعتدال سے بڑھتی ہے تو اول اس کا اثر مباحات پر ہوتا ہے کہ ان کو ترک کراتی ہے پھر جب اور غلبہ ہوتا ہے تو واجبات تک نوبت آتی ہے۔ پھر جب بالکل ہی انتہا ہوجاتی ہے تو مایوسی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے خیال ہوتا ہے کہ میں اس قدر گنہگار ایسا شریر ہوں تو میری مغفرت کس طرح ہوسکتی ہے اور جب مغفرت نہیں ہوسکتی تو کیوں بلاوجہ مصیبت بھروں۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کہتے تھے کہ دوزخ تو میرے لئے ضرور ہی لکھی ہے پھر نفس کے حظوظ میں کیوں کسر رکھوں چنانچہ انھوں نے اس قدر ظلم کئے کہ کچھ انتہا ہی نہیں چھوڑی

پس جب اس مقام کا خاصہ تعطل ہے اور وہ غیر محمود ہے تو اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے خدا مجھے اتنا خوف دے کہ وہ گناہوں سے بچائے۔

صاحبو! کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ کسی نے اخلاق حسنہ کی حد بتلائی ہو۔ اور فرماتے ہیں کہ مجھے شوق دے لیکن مِنْ غَيْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَّلَا فِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ (بغیر کسی نقصان پہونچانے والے کے نقصان کے اور نہ کسی گمراہ کرنے والے فتنے سے) کہ وہ شوق اتنا نہ ہو کہ میرے جسم کو ضرر دے یا میرے لئے موجب فتنہ ہو جائے کیونکہ شوق کا خاصہ یہ ہے کہ اول جب اس کی شدت ہوتی ہے تو اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے کہ سوزش قلب پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور قویٰ مختل ہونے لگتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات ضروری عبادات ترک ہونے لگتی ہیں۔ دوسرا ضرر اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب شوق بہت بڑھتا ہے تو اس سے ناز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہیبت خداوندی کم ہو جاتی ہے اور گستاخانہ کلمات زبان سے نکلنے لگتے ہیں حالانکہ ناز کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے ؎

ناز را رُوئے بباید ہمچو وَرد　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا علاج کیا کہ نہ مجھے اس سے ضرر ظاہری ہو اور ضرر باطنی۔ جب معلوم ہوا کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے تو شفقت کی بھی ایک حد ہونی چاہیئے۔ آجکل حد شکن دو قسم کے لوگ ہیں ایک اہل دنیا کہ وہ بھی حد شکنی کرتے ہیں اور دوسرے اہل دین کہ وہ بھی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اہل دنیا کی حد شکنی تو یہ ہے کہ وہ قوم پر ایسی شفقت کرتے ہیں کہ اس میں دین کا بھی ضرر ہو جاتا ہے بلکہ اکثروں کو تو نصب محض قوم ہو گئی ہے وہ اگر ہمدردی بھی کرتے ہیں تو اس لئے کہ یہ ہماری قوم ہے اس سے ہمدردی کرنا ضروری ہے اور مذہب پر بھی قائم ہیں تو محض اس لئے کہ دنیا کی اقوام ترقی کر رہی ہیں تو ہم کو بھی ترقی کرنی چاہیئے۔ اور ترقی بدون اتفاق کے ممکن نہیں اور اتفاق بدون اتحاد مذہب کے ہو نہیں سکتا تو ہم کو مجبوراً ایک مذہب پر رہنا چاہیئے بلکہ دوسروں کو اگر تبلیغ اسلام کرتے

ہیں تو وہ بھی اس لئے کہ اگر یہ ہمارے مذہب میں آجائیں گے تو ہماری تعداد قومی بڑھ جائے گی اور ہم دوسری قوموں سے آگے نکل جائیں گے تو گویا ان کے نزدیک اسلام مطلوب لغیرہ ہے فی نفسہ وہ کوئی قابل طلب چیز نہیں اگر اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ترقی کا ممکن الحصول ہو تو ان کے نزدیک اس کو چھوڑ دینا بھی گویا کچھ مضر نہیں ہے ورنہ اگر ان کے نزدیک مذہب کوئی قابل وقعت چیز ہے تو کیا وجہ کہ اس کے ایک جزء کو تو لیا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دیا گیا مطلوب کا ہر جزء مطلوب نہیں ہوتا؟ جب ہوتا ہے تو کیا وجہ کہ حرمت سود کو چھوڑا نماز کو چھوڑا صرف ایک اتفاق اور ہمدردی کو لے لیا اکثر دیکھا گیا ہے کہ قومی چندوں میں ایک ایک روپیہ کو نیلام کیا جاتا ہے اور وہ چار سو پانسو کو فروخت ہوتا ہے حالانکہ یہ کھلا ہوا سود ہے صرف ایک قوم کا لفظ یاد کر لیا ہے۔ بس صاحبو! غور تو کرو قوم کی خدمت جو محمود ہے آخر کس لئے اس لئے کہ خدا کا حکم ہے کہ قوم کی خدمت کرو تو جب خدا کو ناراض کر کے تم نے قوم کی خدمت کی تو وہ خدمت محمود کہاں رہی، جب خدا ہی سے سلسلہ توڑ دیا تو قوم سے جوڑ کر کیا فلاح ہوگی ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　　فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

جب خدا سے بیگانگی ہو گئی تو کس کی قوم۔ صاحبو! حضرت نوح علیہ السلام سے زیادہ تو خیر اہ قوم نہیں بن سکتے پھر دیکھ لیجئے انھوں نے اپنی قوم کے ساتھ جو خدا کی نافرمان تھی کیا کیا پھر مرض پر مرض یہ ہے کہ ان کی فلاح کی صورتیں جو سوچی جاتی ہیں اُن کے مدار کے متعلق آجکل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کالانعام کی اگر ان ہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا اسی لئے کہ وہ

قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔ آجکل علماء پر بھی یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے صاحبو! علماء کب اتفاق سے روکتے ہیں۔ لیکن اتفاق کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ علماء اپنے مرکز سے ہٹیں اور آپ کے مرکز پر آجائیں سو یہ اتفاق تو یقیناً محمود نہیں ہاں دوسری صورت اتفاق کی کہ علماء اپنے مرکز پر رہیں اور قوم اپنی وہمی ترقیوں اور مضر خیالوں کو چھوڑ کر ان کے مرکز پر آجائیں بیشک محمود ہے۔ اور اس طرح اتفاق ہونا چاہئے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قوم کو جو متفق بنایا جائے گا تو اس اتفاق کے لئے آخر کوئی معیار بھی ہوگا یا نہیں کہ قوم کو اس معیار کی طرف بلایا جائے گا' ظاہر ہے کہ ضرور ہوگا۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ وہ معیار کیا ہے سو سب جانتے ہیں کہ وہ معیار حق ہے یعنی حق کی طرف قوم کو بلایا جائے گا کہ یہی ایک مامون اور صاف وہموار شاہراہ ہے جس میں نشیب وفراز کا نام نہیں۔ اس معیار سے الگ جتنا اتفاق پکارتے ہو اسی قدر نااتفاق بڑھتا ہے اور جب معیار متعین ہوگیا تو دیکھو کہ کون اس معیار پر چل رہا ہے اور کون اس سے علیحدہ ہے جو شخص صحیح معیار پر ہو اس کو مت کہو کہ تو اتفاق کر بلکہ جو اس معیار سے ہٹ گیا ہے اس کو معیار پر لانے کی کوشش کرو اور اس کو اتفاق کی رائے دو۔ دیکھو اگر ایک قوم ٹھکانے پر بیٹھی ہے اور ایک دوسری قوم بھٹکتی پھرتی ہو تو کیا تم پہلی جماعت کو مجبور کروگے کہ ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو کر اس بھٹکی ہوئی جماعت کے ساتھ ہولے یا اس بھٹکی ہوئی جماعت کو ٹھکانے پر لانے کی کوشش کروگے۔ پس مولویوں کو اتفاق کی ترغیب دینا اور ان پر نااتفاقی کا الزام لگانا عجیب بات ہے۔ صاحبو! اتفاق تم پیدا کرو کہ جس صحیح مرکز پر وہ ہیں تم بھی اس پر آجاؤ بس اتفاق کی حقیقت یہ ہے اور جس کو آپ حضرات اتفاق کہہ رہے ہیں وہ محض لفظ ہی ہے معنی نہیں جیسا مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

میم واؤ میم و نون تشریف نیست لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

یہ الفاظ تو صرف پہچان ظاہری کے لئے ہیں ورنہ ان میں کیا رکھا ہے تیرے الفاظ کا تو وہی

حال ہے کہ جیسے ایک بنئے کا کارکن بہی کھاتے میں حساب جوڑ رہا تھا کہ پندرہ کا پانچ ہاتھ لگا ایک اور ۲۵ کا پانچ ہاتھ ہاتھ لگے دو وغیرہ وغیرہ۔ ایک فقیر بھی وہاں بیٹھا تھا اور ان سب حاصلوں کو ساتھ ساتھ جوڑتا جاتا تھا شام تک سیکڑوں تک نوبت پہنچ گئی۔ اٹھتے وقت سوال کیا اس نے ناداری کا عذر کیا سائل نے کہا کہ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ابھی تو میرے سامنے تونے سیکڑوں کے حاصل ہونے کا اقرار کیا اُس نے کہا بھائی وہ صرف کاغذ میں حاصل ہوئے ہیں واقع میں حاصل نہیں ہوئے جب الفاظ خلاف معنے ہوں تو وہی مثل ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　　واندروں قہر خدائے عزّ و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　　وز درونت ننگ میدارد یزید

(او پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کافر کی قبر زیورات سے لدی ہوئی ہے اور اندر خدائے تعالیٰ کا غضب بھرا ہوا ہے۔ باہر سے تو یزید کو برا بھلا کہتا ہے اور تیرا باطن یزید کو رسوا کرنے والا ہے)

تو جہاں نرے الفاظ ہوں وہاں محض ہاتھ لگنے سے کیا جمع ہوتی ہے تو یہی آجکل کے اتفاق کے معنے رہ گئے ہیں تو ایک شفقت تو یہ ہے کہ غل شور مچا کر دنیا کا بھلا کر لو چاہے دین رہے یا برباد ہو بلکہ اگر مولوی کچھ کہتے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ یہ مذہبی لوگ ہیں یوں ہی کہا کرتے ہیں ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مذہب کی کچھ وقعت نہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں مذہب کی وقعت کس قدر ہے۔ میرے ایک دوست لکھتے ہیں کہ آج یہاں چند عقلاء جمع ہوئے اور اس میں گفتگو ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب کیا ہے۔ بہت سی گفتگو کے بعد اخیر فیصلہ یہ ہوا کہ اصلی سبب تنزّل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہ چھوڑا جائے گا اس وقت تک ترقی ناممکن ہے لیکن مجبوری ہے کہ مذہبی ضرورت روکتی ہے۔ صاحبو! کیا اس تجویز کے بعد یہ لوگ مسلمان رہے افسوس اسلام کو خار راہ بتایا جائے اور طرہ یہ کہ پھر بھی اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ صاحبو! کیا یہ لوگ اسلامی

خیر خواہ ہیں ہاں اسلام بمعنے قوم اگر ہو تو ضرور اسلامی خیر خواہ ہیں اور اسی کو آجکل شفقت سمجھا جاتا ہے مگر یہ شفقت کا ہیضہ ہے کہ ایک بچّے کو اس کی ضد پر برابر کھلاتے ہی چلے جاؤ آخر نتیجہ کیا ہوگا یہی کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے گا اور مر جائے گا بس یہ خیر خواہی اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی مگر خود اسلام ہی کی اُن کے قلب میں کچھ وقعت نہیں. ایک قصہ اور یاد آیا کہ دیوبند میں ایک مسلمان جن پر اس نئی تہذیب کا اثر پڑا تھا کہنے لگے کہ قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک ناصح نے ان سے کہا کہ میاں قیامت کے قائل ہونے میں کیا حرج ہے اگر بالفرض تمہارے خیال کے مطابق قیامت نہ ہوئی اور تم اس کے وجود کے معتقد رہے تو تمہارے اس غلط عقیدے کا تم پر کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ باز پرس ہی کرنے والا نہیں اور اگر ہمارے خیال کے مطابق قیامت ہوئی اور تم اس کے منکر ہوئے تو یاد رکھنا بہت جوتیاں لگیں گی۔ یہ جواب اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جو انھوں نے کسی دہری کو دیا تھا اس کو کسی نے نظم بھی کیا ہے ؎

قال المنجم والطبیب کلاھما لا تحشر الاجساد قلت الیکما

ان صح قولکما فلست بخاسر او صح قولی فالخسار علیکما

(نجومی اور طبیب دونوں نے کہا کہ اجسام کو جمع نہ کیا جائیگا (مراد قیامت) میں نے کہا یہ بات تمہاری ہی طرف۔ اگر تمہارا قول صحیح ہے تو میرا کون نقصان اگر میرا قول صحیح ہو گیا تو تمہارا ہی گھاٹا (نقصان) ہے۔)

تو ان روشن خیال صاحب نے یہ کہا کہ یہ تو اس کے سامنے کہیئے کہ جس کو کچھ احتمال ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ قیامت کوئی چیز نہیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ حضرات ایسے بہت سے لوگ اس وقت ہم مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کی بدولت پیدا ہو گئے ہیں گو وہ زبان سے صاف نہیں انکار کرتے مگر دل میں محض انکار رہے۔ میرٹھ میں ایک عہدہ دار مسلمان کے پاس عید کے دن بہت سے مسلمان ملنے گئے تو وہ عہدہ دار صاحب اُن لوگوں سے کہتے ہیں آج آپ لوگوں کا عید ہے۔ افسوس ان کو اسلامی عید کا اپنی طرف منسوب ہونا بھی ناگوار ہوا اور لیجئے ایک مسلمان کلکٹر ہو گئے تھے ان کو اسلام سے اس قدر وحشت

ہوئی کہ اپنے اصلی نام کو بھی باقی نہ رکھا اس کو کاٹ چھانٹ کر کے انگریزی ناموں کے طرز پر بنایا اور لطف یہ ہے کہ پھر اپنے مسلمان بھی کہتے تھے۔

صاحبو! یہ ترقی اسلام کی ترقی تو ہرگز نہیں۔ اسلام ایسی ترقیوں سے غنی اور بیزار ہے بلکہ سچ پوچھو تو اسلام کی ترقی تو تمہارے صوفی وضع بننے سے بھی نہیں ہوتی۔ جب تک ایمان دل میں پیوست نہ ہو جائے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (گواہی دینا اس بات کی کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) اور شہادت میں بشہادت آیۃ اِذَا جَآءَ الْمُنٰفِقُوْنَ الخ (جبکہ آتے ہیں آپ کے پاس منافقین) توافق قلب و لسان ضروری ہے تو ترقی شہادتین کی یہ ہوئی کہ وہ دل میں رچ جائے اور یہ حال ہو جائے

قال را بگذار مرد حال شود پیش مردے کاملے پامال شو

(قیل وقال (اعتراض وجواب) کو چھوڑ صاحب حال (بزرگ) بنجا اور بزرگ کامل کے سامنے پامال (اپنے کو عاجز کر دے) ہو جا)

دوسرے حکیم کہتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل است و قال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

(رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اُس سے نہ تو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا حال پیدا ہوتا ہے)

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدل بزدایدت

(علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے اور تیرے دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کر دے)

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف وعاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کر دے)

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز خود نہ دانی تو کہ حُوری یا عجوز

(تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی عورت)

ایھا القوم الذی فی المدرسہ کل ماحصلتموہ وسوسہ

(اے وہ لوگو جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے وہ محض وسوسہ ہے)

علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

(سوائے علم عاشقی کے اور کوئی علم کارآمد نہیں باقی تمام علوم ابلیس کی تلبیس ہے)

یہ ہے وہ علم جو قلب کے اندر پہونچے پس ترقی اسلام کی یہ ہے نہ کہ مال و دولت کی ترقی بلکہ اگر ساری دنیا کے مسلمان نادار ہو جائیں اور لنگے زیر لنگے بالا کی حالت ہو جائے تب بھی اسلام کی ترقی باقی ہے کیونکہ اسلام فنٹ اور چوکڑی کا نام نہیں تو یہ جتنی ترقی ہو رہی ہے اسلام کی ترقی نہیں ہے البتہ اہل اللہ کا اسلام اب بھی ترقی پر ہے گو ان کے پاس ظاہری سامان نہ ہو اس بے سر و سامانی کی حالت میں بھی انکی یہ حالت ہے

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(شراب خانہ کا مجاور ہوں لیکن مستی کے وقت دیکھ کہ فلک پر ناز کرتا ہوں اور سیاروں پر حکومت کرتا ہوں)

اور کہتے ہیں کہ ؎

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(عشق حقیقی کے پر چلے کو حقیر مت جانو کیونکہ یہ قوم بادشاہ ہیں بغیر کسی سہارا کے ہوں اور بغیر تاج کے بادشاہ ہیں)

آخر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی حالانکہ وہ حضرات ٹوٹی ہوئی چٹائیوں پر بلکہ کنکریوں پر بیٹھے ہوئے سلطنت فارس و روم کا فیصلہ فرماتے تھے مگر کوئی مال و دولت ان کے پاس نہ تھی اور نہ اس کی ہوس تھی اسی لئے ان حضرات کو ثروت کے ملنے سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ حضرت حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آپ روتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا افسوس ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں پلّہ داری کرتے تھے اور آج اس قدر مال و دولت جمع ہے کہ بجز مٹی میں دفن کرنے

کے اور کہیں رکھنے کی جگہ نہیں ۔ حضرات اگر وہ اصلی ترقی آپ کو نصیب ہو جائے تو واللہ اس ظاہری نمود کو آپ ہیچ در ہیچ سمجھنے لگیں آپ کو معلوم ہوا کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی کیا قدر تھی آپ کی ساری عمر دنیا پرستی میں گذری ہے اس لئے آپ کو کچھ خبر نہیں ؎

تو نہ دیدی گہے سلیمانؑ را چہ شناسی زبان مرغاں را

(تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا۔ تو پرندوں کی بولی کیسے پہچانیگا)

ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر اتفاقاً تم شکار میں نکل جاؤ اور تن تنہا رہ جاؤ اور اس وقت تم کو شدت سے پیاس لگے کہ تمہارا دم نکلنے لگے اس وقت اگر کوئی شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لائے اور نصف سلطنت اس کی قیمت بتلائے تو تم اس کو خرید لوگے کہ نہیں اس نے کہا میں ضرور خرید لونگا پھر ان بزرگ نے کہا کہ اور اتفاق سے تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور کسی طرح ادرار نہ ہو، اور ایک شخص اس شرط پر کہ بقیہ نصف سلطنت اس کو دیدو پیشاب اُتار دینے کا وعدہ کرے تو تم کیا کروگے۔ اس نے کہا کہ میں بقیہ نصف بھی اس کو دیدوں تو اُن بزرگ نے کہا کہ آپ کی سلطنت کی یہ قیمت ہے ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب جس کے لئے آپ اس قدر منہمک ہیں تو اُن حضرات کو دنیا کا یہ نرخ معلوم ہے اِسی لئے صحابہؓ نے توسیع سلطنت پر بھی، دنیا کا کام نہیں کیا وہ کام کیا جس کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر حکومت دیدیں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیک کام کرنے کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ وقت تھے مگر کھانا کپڑا جو تھا معمولی سے بھی کم تھا کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ اصل چیز دوسری ہے ہمارے بعضے بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما نے خلافت لے لی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ شیخین رضی اللہ عنہما کے

لئے دعا کیجئے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت وتعب دین کے لئے اور قلت دنیا کے لئے معلوم ہو چکی تو ان کو کس قدر مدید کلفت ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی اُن حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکر رنجی ہوئی اول تو بہت واقعے غلط مشہور ہیں دوسرے جب اتحاد دوستی ہوتی ہے تو شکر رنجی بھی ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا کہ تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے کہ نہیں انھوں نے عرض کیا کہ حضور کبھی کبھی ہو جاتی ہے مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے، فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائدار رہے۔ ذوق کہتا ہے نا سہ

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے　　بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

ایک عربی حکیم لکھتا ہے وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ (اور باقی رہے گی محبت جب تک عتاب باقی رہے گا) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے اور اگر عتاب نہ کیا جائے اور بات کو دل میں رکھا جائے تو تمام عمر بھی دل سے کدورت نہ نکلے گی اور اگر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محب اور محبوب تھیں وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہاری خوشی اور ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی ہو تو قسم میں لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ (نہیں ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم) کہتی ہو اور جب خوش ہوتی ہو تو لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) (نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم) کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتی ہیں وَهَلْ أَهْجُرُ إِلَّا اسْمَكَ (نہیں چھوڑتی میں لیکن آپ کے نام کو) کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی بھی ہو تو باہم ایک کا دوسرے پر ناز ہے ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔ کانپور میں ایک

صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میرا ان سے ملا انھوں نے وہی تذکرہ چھیڑا اور حدیث پڑھی من سب اصحابی فقد سبّنی ومن سبّنی فقد سبّ اللہ (جس نے صحابہ کو گالی دی پس تحقیق کہ اس نے مجھ کو گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی پس تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی) اور کہا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہدیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہوگئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپنے غور نہیں کیا اس حدیث کے یہ معنی نہیں جو آپنے سمجھے بلکہ اس کے معنے دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو آپ بتلائیے کہ یہ وعید کس شخص کے لئے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لئے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو اُن کے ساتھ بھی یہی کیا جائیگا یا غیروں اور اجانب کے لئے ہے۔ ظاہر ہے کہ اجانب کے لئے یہ وعید ہے پس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو بُرا کہے اس کے لئے یہ حکم ہے اس کو سُن کر وہ کہنے لگے کہ یہ ذہانت کی باتیں ہیں میں نے کہا کہ صاحب پھر کیا غباوت کی باتیں کہوں اس پر وہ شرمندہ سے ہوگئے۔ تو مجھے بہت حجاب ہوا اسی لئے میں نے اپنا یہ معمول کر لیا ہے کہ اگر کوئی بڑا آدمی مجھے بلاتا ہے تو اول یہ شرط کر لیتا ہوں کہ خلوت میں گفتگو کروں گا کیونکہ جلوت میں گفتگو کرنے سے اکثر مخاطب لاجواب ہو کر شرمندہ ہو جاتا ہے اور میں اس کو با وجاہت لوگوں کے لئے پسند نہیں کرتا۔ آخر میں نے ان کی شرم یوں اتاری کہ میں نے ان سے کہا کہ میں نے سُنا ہے آپ عامل ہیں مجھ کو نیند کم آتی ہے اگر آپ پانی پڑھ کر بھیجدیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ وہ اس سے خوش ہوئے اور تشتری لکھدینے کا وعدہ کیا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرفداری کر کے دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بُرا نہ کہنا چاہیئے۔ اور صاحبو! اس وقت کی سلطنت ہی کیا تھی جس پر کوئی لالچ کرتا۔ اس وقت کی سلطنت یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوپہر کے وقت گرمی میں چلے جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دیکھا پوچھا کہ امیر المومنین کہاں چلے آپ نے فرمایا کہ

بیت المال کا ایک اونٹ غائب ہو گیا ہے اس کی تلاش کو جا رہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت آپ نے اس گرمی میں کیوں تکلیف کی کسی کو حکم دیا ہوتا کہ وہ تلاش کر لیتا آپ نے فرمایا کہ اے عثمان میدان قیامت کی گرمی اس گرمی سے اشد ہے غرض کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ ترقی پر نہ تھے یہ حضرات اس ترقی پر تھے کہ ساری دنیا جانتی ہے بلکہ مانتی ہے حالانکہ نہ ان کے پاس فنڈ تھی نہ سامان آرائش اور فنڈ تو کیا ہوتی واقعہ یرموک میں جو کہ ایک عظیم الشان جنگ تھی۔ جب ایک شخص اونٹنی پر سوار فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو کہ روزانہ انتظار خبر میں باہر جا کر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے جنگل میں ملاقات ہوئی آپ نے اس سے پوچھا کہ تو کہاں سے آتا ہے معلوم ہوا یرموک سے آپ نے جنگ کا حال پوچھا وہ چونکہ پہچانتا نہ تھا اس لئے کہ کوئی نشان خلافت نہ تھا کوئی تاج نہ تھا اس نے ان کی طرف التفات نہیں کیا اور اونٹنی دوڑاتے ہوئے چلا جاتا تھا اور یہ اونٹنی کے ساتھ دوڑے جاتے تھے۔ جب آبادی کی طرف قریب آئے تو لوگوں نے پہچانا اور امیرالمومنین کو سلام کیا اس وقت اس کو معلوم ہوا تو اس نے بہت معذرت کی آپ نے فرمایا کہ میں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے ثواب کے لئے اٹھایا ہے تجھے عذر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت تھی ایک ہماری حالت ہے کہ جو قدم اٹھتا ہے خود بینی اور خود داری کے لئے۔ ایک صاحب معزز مجھ سے فرمانے لگے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا لڑکا ایسا ہو جائے کہ پندرہ روپے میں گذر کر لیا کرے اور حالت لڑکے کی یہ تھی کہ پندرہ سے زیادہ کا اس کا ایک کوٹ ہی تھا' افسوس ہے کہ ہم کو دوسری قوموں کی تقلید نے برباد کیا ہم تقلید کرتے ہیں اور وہ بھی بری باتوں کی انھوں نے ہماری تقلید کر کے اپنا گھر آباد کر لیا اور ہم ان کی تقلید کر کے اپنی رہی سہی حالت بھی برباد کئے دیتے ہیں دعوے ہے قومی ہمدردی کا اور اجنبیت یہ ہے کہ شہر میں رہنا بھی گوارا نہیں الگ جنگل میں جا کر رہتے ہیں۔ صاحبو! کیا ترقی اس پر موقوف ہے کہ قوم کا قرب بھی چھوڑ دیا جائے۔ دیکھئے رئیسہ بھوپال والی سلطنت ہیں آجکل کے ترقی یافتہ لوگوں سے تو بہر صورت بہت زیادہ ترقی پر ہیں مگر معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی

غریب رعایا میں سے شادی وغیرہ میں ان کی دعوت کرتا ہے تو قبول کرتی ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ہمارے روشن خیال سب سے زیادہ دعوت کو ذلیل سمجھتے ہیں مجھے ایک لکھنؤ کی حکایت یاد آئی، ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک سقّے نے کی مولوی صاحب اس کے گھر جارہے تھے کہ ایک رئیس صاحب ملے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں جارہے ہو، مولوی صاحب نے بیان کیا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے اس کے ہاں جارہا ہوں تو رئیس صاحب فرمانے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو لٹیا ہی ڈبودی کیا سقوں کی دعوت بھی کھانے لگے۔ مولوی صاحب نے یہ سن کر سقے سے فرمایا کہ بھائی ایسی تو دعوت میں نہیں جاتا یہ رئیس صاحب اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ البتہ اس شرط سے چلتا ہوں کہ ان رئیس صاحب کو بھی لے چل۔ چنانچہ اس سقّے نے ان کی منّت کرنی شروع کی اب تو رئیس صاحب بہت گھبرائے اول تو عذر کیا مگر جب اس نے بہت ہی لجاجت کی اور دو چار ہم مرتبہ آدمیوں نے بھی جو کہ اتفاقاً جمع ہوگئے تھے ملامت کی کہ ایک غریب آدمی اس قدر لجاجت کرتا ہے اور تم مانتے نہیں عجب سنگدل ہو تو مجبوراً اُن رئیس صاحب کو ماننا پڑا آخر اس کے گھر گئے، وہاں جاکر دیکھا کہ تمام گھر میں فرش لگا ہوا ہے اور سقے دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں کوئی ہاتھ چومتا ہے کوئی پاؤں پکڑتا ہے آخر کھانا کھلایا گیا اور خود غلاموں کی طرح کھڑے رہے، جب وہاں سے فارغ ہوکر آئے تو کہا کہ حضرت واقعی میں غلطی پر تھا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ عزت وحرمت غرباء کے ساتھ رہنے میں ہے، میں نے آج تک یہ تعظیم نہیں دیکھی تھی جو ان لوگوں نے کی، سچ یہ ہے کہ محبت کے لوگ یہی ہیں، رؤسا کو جو کچھ عزت نصیب ہوتی ہے اپنے نوکروں یا ماتحتوں میں حق یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعظیم صرف ظاہری تعظیم خوف کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسے بھیڑیئے کی تعظیم کی جاتی ہے۔

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ معاشرت تھی اور وہی حقیقی ترقی تھی اگر دنیا میں اس کی ترقی ہو تو اسلام کو بیشک ترقی ہے لیکن اگر ساری دنیا کے پاس مال وجاہ ہوجائے تو اسلام کی کچھ بھی ترقی نہیں یہ تو اہل دنیا کی شفقت کے متعلق بیان تھا۔

اب ایک شفقت اہلِ دین کی ہے کہ ان لوگوں کو جوش اٹھتا ہے کہ جس طرح ہوسکے

قوم کی اصلاح ہو جائے اس کوشش میں مختلف طرح کی مشکلات اُن کو پیش آتی ہیں اور ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جو کچھ مدارس یا انجمنیں قائم کرتے ہیں ان سے مقصود صرف اپنا نفع ہوتا ہے کہ ہم کو خوب روپیہ ملے یا ہمارا خوب نام ہو یہ لوگ تو مصلحین کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں دوسرے وہ لوگ ہیں کہ واقعی وہ اصلاح چاہتے ہیں اور ان کی سچی تمنا یہ ہے کہ قوم کی حالت درست ہو جائے مگر اُن کو شفقت میں غلو ہو گیا ہے۔ اس میں اول تو جسمانی تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے بعض اوقات دین کی بھی خرابی ہو جاتی ہے کہ اس کے اہتمام میں بعض ناجائز طریقوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے بہت پیچھے پڑنے سے عداوت ہو جاتی ہے یاد رکھو لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا خدا تعالیٰ کے دربار میں وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی۔ مجھے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آتا ہے اگر ان کے پاس کوئی فہرست مسجد کے چندہ وغیرہ کی لیکر آتا اور دستخط کرنے کی درخواست کرتا تو فرماتے کہ میاں کیوں لوگوں کے پیچھے پڑے ہو، مسجد یا مدرسہ بنانا ہی ہے تو کچی دیواریں اٹھا کر بنالو، اگر وہ کہتا کہ حضرت کچی دیواریں گر جائیں گی تو فرماتے کہ میاں پکی بھی آخر گریں گی تو جب گر جائیں گی کوئی دوسرا بنا دے گا تم قیامت تک کا بندوبست کرنے کی فکر میں کیوں پڑے بات یہ ہے کہ ؎

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ!　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ
چارپا را قدر طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(تمنا کر لیکن اپنے مرتبہ کے موافق کر اس لئے کہ پہاڑ کو ایک گھاس کا پتہ نہیں اٹھا سکتا۔ چوپایوں پر ان کی طاقت کے بقدر بوجھ رکھ۔ کمزوروں پر ان کی ہمت کے بقدر کام رکھ یعنی کام سپرد کر)

تو بوجھ اسی قدر اٹھاؤ کہ تم سے اُٹھ سکے۔ ترمذی شریف میں حدیث ہے لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ (کسی مومن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے) کہ مومن کو چاہئے کہ اپنے کو ذلیل نہ کرے۔ اگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کی

تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ فرمالیتے تو آجکل کے مدعیان اجتہاد اس کے یہ معنی سمجھتے کہ مومن کو پھٹا کپڑا نہ پہننا چاہیئے بلکہ خوب بن سنور کر عمدہ پوشاک میں رہنا چاہیئے وَمِثْلُ ذٰلِکَ لیکن صحابہؓ نے پوچھ کر حل کردیا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا یُذِلُّ نَفْسَہٗ (انھوں (صحابہؓ) نے کہا اور اپنے نفس کی ذلت کیا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفسیر میں فرمایا اَنْ یَّتَحَمَّلَ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا یُطِیْقُہٗ (ایسی مصیبت کہ جس کے برداشت کرنے کی وہ اپنے اندر طاقت نہیں رکھتا) اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ تعلیم اسلامی ذلت اختیار کرنے سے مانع ہے مگر آج کل روشن خیالوں نے ذلت کو مولویت کا اثر سمجھ لیا ہے، حالانکہ مولویوں سے زیادہ یہی لوگ اس ذلت کو اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے وہاں مثل دیگر قصبات کے یہ رسم ہے کہ شادی میں دلہن کے میانہ پر بکھیر ہوتی ہے اس بکھیر کو بھنگی اٹھاتے ہیں، چند روز ہوئے کہ وہاں شادی ہوئی اور اس موقعہ پر ایک دلدادہ تہذیب جدید نے ان بھنگیوں کے ساتھ مل کر بکھیر کے پیسے جمع کئے۔ مشکل سے شاید تین چار آنے پیسے ان کے ہاتھ لگے۔ کیوں صاحب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے چندے کے واسطے یہاں تک گوارا کرلیا جاتا ہے تو اگر کوئی مولوی اسلامی مدارس کے لئے چندہ جمع کرے تو اس کو بھک منگا کیوں کہا جاتا ہے اور اس پر ذلت کا اطلاق کیوں کیا جاتا ہے۔ آخر جب نماز کا وقت آیا اور وہ نماز پڑھنے کے لئے آیا تو ایک ظریف نے اُن کی خبر لی کہا کہ تم ہماری جماعت سے الگ ہوجاؤ کیونکہ تم نجس ہو اور انھوں نے کہا کہ میرے نجس ہونے کی وجہ۔ اُن ظریف نے جواب دیا کہ چونکہ تم بھنگیوں کے ساتھ ملکر پیسے لوٹ رہے تھے اور اس وقت تم کو بھی پسینہ آرہا تھا اور اُن کو بھی اور ان کے ناپاک بدن سے تمہارا بدن مس کرتا تھا مگر وہ ایسا باہمت تھا کہ اس کو اس سے کچھ بھی اثر نہ ہوا پھر جب نیگ لینے کا وقت آیا تو آپ وہاں بھی جاموجود ہوئے ایک روپیہ آپ کو بھی ملا۔ الحمد للہ کسی مولوی نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی مگر چونکہ ان بیچاروں کی صورت غریبانہ صورت ہے وہ ایسی حرکت نہ کرتے پر بھی بھک منگے ہیں اور ان کی صورت چونکہ معززانہ ہے یہ بھیک مانگ کر بھی معزز رہے۔ مولویوں کے صدہا وعظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں

چندہ کا نام بھی نہیں ہوتا اور ان صاحبوں کا کوئی لکچر بھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں چندہ کی ترغیب نہ ہو۔ سید اکبر حسین صاحب جج نے خوب تضمین فرمائی ؂

درپس ہر لکچر آخر چندہ ایست   مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لکچر کے پیچھے چندہ ہے انجام کا دیکھنے والا آدمی خدا مبارک بندہ ہے)

دوسرے یہ کہ بعضے مولوی اگرچہ چندہ لیتے بھی ہیں تو دباؤ ڈال کر نہیں لیتے کیونکہ دباؤ ڈال کر وہ لے سکتا ہے کہ جس کا کچھ اثر ہو ان بیچاروں کا اثر ہی کیا ہے کہ ان کے دباؤ کا اثر پڑے بر خلاف ان حضرات کے کہ دباؤ ڈال کر ظلم کر کے وصول کرتے ہیں غرض میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ تم کو اس حالت تک صرف تمہاری ضرورت سے زیادہ شفقت علی القوم لائی ہے۔ پس تم اسی قدر شفقت کرو کہ جو تم کو تمہارے دین میں مضر نہ ہو بعضے اس لئے ناجائز کوشش کرتے ہیں کہ بدون اس کے کام نہیں چلتا اسی طرح کام بند ہو جائے گا مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کو کیا فکر قیامت میں اگر باز پرس ہوگی کہہ دیتا کہ میں نے لوگوں کو ترغیب دی تھی مگر لوگوں نے نہ مانا' میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس جواب کے بعد تم پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ ہم نے اپنے وطن میں ایک مدرسہ کر رکھا ہے مگر اس انداز سے کہ نہ کسی سے چندہ مانگا جاتا ہے نہ کسی کو ترغیب دی جاتی ہے، طلبہ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر توکل کر کے رہیں تو رہیں ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے دیا تو ہم دیدیں گے مگر باوجود اس استغناء کے اچھی خاصی طرح مدرسہ چل رہا ہے بلکہ یہاں تک انتظام کیا کہ طلبہ کی دعوت بھی جس میں کسی کے گھر جانا پڑے قبول نہیں کی جاتی۔ اگرچہ دعوت کا کھانا لینا بھیک نہیں ہے مگر چونکہ آجکل طلبہ کی دعوت اکثر لوگ اُن کو ذلیل سمجھ کر کرتے ہیں اس لئے ہم نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور میں دینے والوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ طلبہ کو کچھ دیں تو عزت سے دینا چاہیئے وہ آپ کے مہمان ہیں دیکھئے اگر آپ کا کوئی مہمان آکر مسجد میں ٹھہرے اور کھانے کے وقت گھر جانے سے انکار کرے تو آپ کیا کریں گے آیا اس مہمان سے کہیں گے کہ دروازے پر جا کر کھانا لے آؤ یا مسجد میں جا کر خود اس کو کھانا دیں گے پھر طلبہ کے ساتھ یہ کیوں نہیں کیا جاتا اور جب تم نے خود

ان کو دروازے پر بلایا تو گویا اپنے مہمانوں کو تم نے خود ذلیل کیا پھر کس منہ سے خود ہی ان کو ذلیل کہتے ہو۔ غرض بحمداللہ مولویوں کی حالت تو ایسی گئی گذری نہیں ہے۔ بہرحال میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ اپنی یہ حالت چھوڑ دو اور کام کو چھوٹے پیمانہ پر شروع کرو تم لوگ یہ کرتے ہو کہ اول ہی سے کام کو بڑے پیمانہ پر اٹھاتے ہو اس کے لئے لابدی زیادہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجبوراً تم کو ناگوار کوششیں کرنی پڑتی ہیں ایک سہل ترکیب آپ کو بتلاتا ہوں کہ جو کام شروع کرنا ہو اتنا شروع کیجئے جو آپ اپنی ذات سے کر سکیں جب کام شروع ہو جائے گا اور دوسرے دیکھیں گے خود بخود تمہاری مدد کریں گے۔ دیکھئے اسلام کا کام بھی یوں ہی ترقی پذیر ہوا اگر اسلام کا کام متعارف ضابطے سے ہوتا تو کم سے کم ایک جماعت تو ہوتی حالانکہ وہاں صرف ایک تن تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک دم تھا خدا تعالیٰ اسلام کی ترقی کو بیان فرماتے ہیں کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَہٗ فَاٰزَرَہٗ الخ (مانند اس کھیتی کے جس کو اس نے اگایا ہو پھر اس کو ہلاک کر دیا ہو) تو صاحبو ترقی اسلام کی ہمیشہ یوں ہی ہوئی ہے۔ خلاصہ اس تقریر کا یہ ہوا کہ شفقت کی بھی ایک حد متعین ہے تم بھی اس پر رہو چنانچہ اس آیت میں اس مضمون کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی کہ شفقت ان لوگوں پر کیجئے کہ جن میں خدا کا خوف ہو اور وہ علماء ہیں۔ فرماتے ہیں اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (بے شک ڈرتے (خوف) کرتے ہیں اس کے بندوں میں سے علماء) ایک بات تو اس سے یہ ثابت ہوئی دوسری بات اس آیت سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رتبہ نہایت عظیم الشان ہے کہ خدا تعالیٰ کو آپ کا غمگین ہونا کسی طرح منظور نہیں۔ جب کوئی بات ہوتی ہے فوراً تسلی فرمائی جاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اور ہی ہے آپ کے اولیاء امت کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے فرماتے ہیں لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (بشارت ہے ان لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی اور آخرت میں) ان کی ہر وقت یہ حالت ہے کہ

ع کوئے نومیدی مرو کامیدہا ست   سوئے تاریکی مرو خورشیدہا ست

(ناامیدی کے راستہ کی طرف مت جا کہ امید بہت ہیں تاریکی اور اندھیرے کی طرف مت جا کہ بہت سے سورج موجود ہیں)

کبھی ان حضرات کا دل منقبض نہیں ہوتا ہمیشہ شاداں رہتے ہیں اور کیونکر نہ رہیں ان حضرات کے پاس وہ چیز ہے کہ جس کے پاس ہوگی شاداں ہی رہے گا بلکہ ان حضرات کے سرور کی یہ حالت ہے کہ ان کو سلاطین پر رحم آتا ہے اور لوگ تو اُن کی ظاہری حالت پر رحم کرتے ہیں کہ ان بیچاروں کو کھانے کو نہیں ملتا بھوکوں مرے جاتے ہیں اور حضرات اہل دنیا پر رحم کھاتے ہیں کہ ان کو ہیضہ ہو رہا ہے سمیت تمام جسم میں سرایت کر گئی ہے اور ان کو حس تک نہیں اس مرض کو مبارک مرض سمجھ رکھا ہے۔ صاحبو! تم ان فاقہ مستوں اور روزہ داروں پر رحم مت کرو اپنی حالت پر رحم کرو، ان کے لئے خوان نعمت تیار ہو رہا ہے ان کو کہا جائے گا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (خوشی خوشی کھاؤ اور پیو اس چیز کی وجہ سے کہ تم عمل کرتے تھے) اسی لئے ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کو ایک قطعہ لکھا ہے جس میں اپنا کھانا اس کا کھانا اپنا پہننا اس کا پہننا سب بیان کر کے آگے فرماتے ہیں ؎

نیک ہمیں ست کہ مے بگذرد راحت تو محنت دوشین ما

(یہی ہے کہ گذرتی ہے تیری راحت ہماری گذشتہ راحت کی محنت ہے)

یعنی یوں ہی کام چلنے دو ؎

باش کہ تا طبل قیامت زنند آں تو نیک آید و یا این ما

(تو ٹھیر یہاں تک کہ قیامت کا نقارہ بجا دیں تیری ملکیت اچھی ثابت ہوتی ہے یا ہماری)

یعنی اس روز معلوم ہو جائے گا کہ کونسی حالت عمدہ تھی۔ غرض اہل دنیا کو ان پر رحم آتا ہے مگر رحم کے قابل درحقیقت وہ ہیں حاصل یہ کہ اللہ والوں کے غم کے وقت اب بھی تسلی ہوتی ہے تو اس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی گئی ہے چونکہ تمہید میں بہت سا وقت ختم ہو گیا ہے اس لئے مقصود کو اب مختصراً بیان کر کے ختم کر دیا جاتا ہے اور مقصود کے اختصار کا اسی لئے مضائقہ نہیں کہ نتائج اکثر مختصر ہی ہوا کرتے ہیں اور یہی راز ہے اَلدِّيْنُ يُسْرٌ کا کہ یہ یسر مختص ہے مقصود کے ساتھ آجکل ہمارے بھائیوں نے غلطی کی ہے کہ ہر جگہ اَلدِّيْنُ يُسْرٌ لے لیا حالانکہ مصداق اس کا صرف نتیجہ ہے

ذرائع مراد نہیں مثلاً اگر یوں کہتے کہ اَلْاَکْلُ یُسْرٌ تو اس کے معنے یہ نہیں کہ اکل کے ذرائع مثلاً کھیتی کرنا وغیرہ وغیرہ یہ بھی آسان ہیں بلکہ معنے یہ ہیں کہ کھیتی وغیرہ کا جو نتیجہ ہے یعنی اکل وہ آسان ہے ہمارے بھائیوں نے یہ معنی سمجھ لئے کہ نہ علم کی ضرورت نہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت نہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ اعمال و طاعات کی ضرورت کیونکہ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ غرض مقصود مختصر بھی ہے اور وقت بھی کم رہ گیا ہے اس لئے اس کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کیوں غم فرماتے ہیں آپ تو ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جن کو خشیت ہو اور خشیت صرف علم سے ہوتی ہے اسی لئے بصیغہ حصر فرمایا اور علم ان کو ہے نہیں مگر اس کا ہونا ان کے قبضے کی بات تھی پس جب یہ خود ہی توجہ نہیں کرتے آپ بھی غم نہ فرمایئے. اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم میں کیا فضیلت ہے اور یہی مقصود ہے دیکھئے اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہوگی کہ علم موقوف علیہ ہے، خشیت کا اور شرط ہے اس کی گو علت تامہ خشیت کی نہیں اس جملہ کو طلبہ یاد رکھیں آگے چل کر اس سے کام لیا جائے گا. اب یہ دیکھئے کہ خشیت جو موقوف ہے علم پر کیسی چیز ہے تو علم بھی اسی درجے کی چیز ہوگی کیونکہ موقوف علیہ واجب کا واجب اور مندوب کا مندوب ہوتا ہے تو نصوص میں دیکھنے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت کی برابر کوئی چیز مہتم بالشان اور اس سے زیادہ واجب نہیں کسی کسی مقام پر اس کو بلفظ تقویٰ بھی فرمایا گیا ہے جیسے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (ہدایت ہے متقین کے لئے) میں. اس جملہ کی اگرچہ دوسری تفسیر بھی ہے لیکن سیدھی تفسیر یہ ہے کہ تقویٰ کے معنی خوف کے لئے جائیں اور معنی یہ ہوں کہ ڈرنے والوں کے لئے ہدایت ہے کیونکہ جب خوف پیدا ہوگا تب ہی حق کی تلاش بھی ہوگی خوف وہ چیز ہے کہ اسلام بھی اسی کی بدولت پھیلا ہے یہ تو نقلی طور پر خشیت کا مہتم بالشان ہونا ثابت ہوا اب عقلی طور پر لیجئے ظاہر ہے کہ انتظام عالم کا بقاء خشیت ہی سے ہوتا ہے دیکھئے انسان جو قبائح سے بچتا ہے تو کیوں یا تو محض تعلیم اخلاقی سے بلا کسی خشیت کے یعنی اس لئے کہ یہ کام بُرا ہے اور بُرے کام سے بچنا چاہیئے مگر دنیا میں اس انداز کی طبیعتیں بہت کم ہیں کہ صرف یہ تعلیم ان کے لئے مانع ہو جائے. فرض کیجئے کہ دو شخص ایک ساتھ سفر کریں اور ان میں سے ایک

شخص کے پاس ایک لاکھ روپئے کا نوٹ ہے اور دوسرا تہیدست ہے اور اتفاق سے یہ دونوں ایک پہاڑ پر پہونچ گئے جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں اور تہیدست اس دوسرے کا مخالف بھی ہے، مذہباً بھی اور خاندانی طور سے بھی اور پہاڑ پر پہنچکر اس تہیدست کے دل میں روپئے کا لالچ پیدا ہوا اور نفس نے رائے دی کہ اس کو قتل کر کے روپیہ اپنے قبضہ میں کرلو اور یہ قادر بھی ہوا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس موقعہ پر کون چیز ہے کہ اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے دنیاوی خوف تو اس لئے مانع نہیں ہوسکتا کہ یہ فرض کیا جاچکا ہے کہ اس مقام پر کوئی دیکھنے والا نہیں غرض دنیا بھر کے سارے اجزا تلاش کرلیجئے کوئی چیز سوائے خشیت خداوندی کے ایسی نہ ملے گی کہ اس کو اپنے اپنے ارادے سے روک سکے تو دیکھئے اس غریب کی جان بچانے کے لئے اس موقعہ پر اگر کوئی چیز مدد کو پہنچی تو وہ صرف خشیت اور مذہب ہے، اس کے سوا ہزاروں صورتیں ایسی ہیں کہ اگر مذہب کی روک نہ ہو تو انسان کسی طرح نہیں رک سکتا۔ اودھ میں ایک سب جج مسلمان کے ہاں دو تعلقداروں کا مقدمہ تھا ایک فریق ایک لاکھ روپیہ اور دوسرا سوا لاکھ روپیہ رشوت لیکر پہنچے۔ اب بتلائیے کہ کس چیز نے اُن رشوت لینے سے روکا کیا تہذیب یا تعلیم نے ہرگز نہیں سینکڑوں تہذیب اور تعلیم یافتہ عام لوگوں کا گلا دبا کر دو دو چار چار روپیہ تک وصول کرلیتے ہیں اور اگر کسی مہذب نے اس سے احتراز ہی کیا تو اسی وقت تک کہ جب تک قلیل مقدار ہو ورنہ اتنی بڑی مقدار کے سامنے تہذیب میں ہرگز قوت نہیں رہ سکتی یہ صرف خدا کا خوف تھا جس کی بدولت وہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہوئے اور دونوں کی رشوت لینے سے انکار کردیا۔ اور ہم نے تو آجکل ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ تھوڑی مقدار بھی لینے میں ان کو عار نہیں۔ ایک عہدہ دار کو کسی دیہاتی ایک روپیہ رشوت دینا چاہا' اتفاق سے جیب میں ایک روپیہ اور ایک ادھنا پڑا تھا چونکہ ہاتھ بند کرکے دیا اس لئے پتہ نہ چلا اور بجائے روپے کے ادھنا دینے لگا اس عہدہ دار نے اول لینے سے انکار کیا مگر جب اس نے اصرار کیا تو لے لیا گھر پر جاکر جو اس دیہاتی نے جیب کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بجائے روپیہ کے ادھنا دے دیا ہے بہت شرمایا اور شرم اُتارنے کو ان کے پاس آیا اور معذرت کرکے ان کو روپیہ دیا اور ادھنا واپس

مانگا اُن حضرت نے روپیہ بھی لے لیا اور ادھنا واپس نہ دیا اور فرمایا کہ میاں واپس کیوں دیں آخر کچھ آیا ہی ہے گیا تو نہیں۔ تو بعض کی تہذیب تو اس قدر سستی ہوتی ہے کہ دو پیسہ میں بھی بک جاتی ہے اور جن کی کچھ قیمتی ہے وہ محض تھوڑی مقدار ملنے کے وقت مانع ہوتی ہے ورنہ اگر ان کو لاکھ دولاکھ روپیہ ملے تو ہرگز نہ چھوڑیں غرض قبائح سے روکنے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف مذہب اور خشیت خداوندی ہے تہذیب ہرگز نہیں روک سکتی۔

آجکل کی تہذیب کی حقیقت اور اس کا انجام اگر دیکھنا چاہیں تو کتاب مآل التہذیب مصنفہ مولوی قمر الدین صاحب مرحوم کی دیکھیں اس کے نو مقالے تیار ہونے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا انھوں نے جابجا دکھلایا ہے کہ اس تہذیب کا مآل کیا ہونے والا ہے اور ہر مضمون کے آخر میں یہ ظرافت آمیز جملہ بھی موجود ہے کہ فَوَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُهَذِّبِیْنَ اگر اعتقاد سے بھی اس کتاب کو نہ دیکھا جائے تو اس کو ایک ناول ہی فرض کرکے دیکھ لو خلاصہ یہ ہے کہ خشیت ہی سے دین و دنیا کے انتظام کا بقاء ہوسکتا ہے اگر خشیت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اور ایک نئے انداز سے سمجھئے کہ اگر خشیت قلب میں ہو تو اس سے نرمی پیدا ہوگی اور نرمی سے اخلاق حمیدہ جن کی آج بھی تعلیم ہوتی ہے جیسے ایثار وغیرہ یہ سب بآسانی پیدا ہوسکیں گے اور اس سے نظامِ عالم احسن صورت پر باقی رہے گا، پس اس اخلاق کو بھی روح تمدن کہا جائے وہ بھی خشیت ہی سے درست ہوتے ہیں لیکن خشیت کا موقوف علیہ علمِ دین ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کا علم نہ ہوگا اس وقت تک اس کا خوف پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص کی گائے کھوئی گئی تھی اس کی تلاش میں نکلا رات کے اندھیرے میں پتہ تو چل نہیں سکا ایک شیر کو پڑا دیکھا سمجھا کہ گائے ہے۔ کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا جب معلوم ہوا تو روح ہی نکل گئی۔ تو واقعی بدون معرفت کے خشیت نہیں ہوسکتی۔

صاحبو! میں نے علم کے فضائل نہیں بیان کئے کیونکہ اول تو وقت نہیں دوسرے آجکل کے عقلاء کو نرے فضائل سے تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ عقل سے اس کی ضرورت ثابت نہ کی جائے حالانکہ عقل اس درجے کی چیز نہیں کہ ہر امر میں اس کو

مدار قرار دیا جائے حکم عقل موجب پریشانی اور شرع موجب راحت ہوتا ہے خوب کہا گیا ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزما لیا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنا لیا)

اور واقعی اگر عقل کو ہر بات میں حکم بنایا جائے تو ہم کو بڑی مشکل پڑے گی، مثلاً یہ قاعدہ عقلی ہے کہ منعم علیہ پر منعم کا شکر بقدر نعمت کے واجب ہے پس اگر اس قاعدہ میں ہم عقل کو حکم بنائیں تو ذرا غور کیجئے کہ ہم کو کتنی مشکل درپیش ہوگی کیونکہ ہر سانس کی آمد و رفت میں ہم پر دو نعمتیں ہیں پس اس طرح دن رات میں کتنی نعمتیں ہم پر ہوئیں اور ان کی کثرت کے لحاظ سے کتنا شکر ہم پر واجب ہوا تو بتلایئے کہ اس شکر کو کون ادا کر سکتا ہے اور نہ ادا کرو تو عقل مجرم ٹھہراتی ہے اب شرع کا احسان دیکھئے کہ اس میں سے تھوڑی سی مقدار کو واجب قرار دیا تو ہر جگہ عقل کی ٹانگ اڑانا سخت مشکل کا اٹھانا ہے۔ مجبوراً یہی کہنا پڑے گا کہ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزمایا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنا لیا)

ہاں عقل بیکار بھی نہیں وہ اتنا کام دے سکتی ہے کہ اس سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ حاکم کون ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا تو آگے عقل کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً بادشاہ کا بادشاہ ہونا عقل سے معلوم ہو سکتا ہے مگر اس کے ہر قانون کی لم ہرگز ہر شخص کو معلوم نہیں ہو سکتی عقل کی حالت بالکل گھوڑے کی سی ہے تو دیکھئے اگر آپ کا ایک محبوب پہاڑ کی چوٹی پر ہو اور آپ سے وہاں تک چار میل کا فاصلہ ہو جن میں دو میل سڑک اور دو میل پہاڑ کی چڑھائی ہو تو آپ گھوڑے کی سواری کہاں تک کریں گے ظاہر ہے کہ دامن کوہ تک سواری ہو سکے گی۔ آگے جہاں سے کوہی زینہ شروع ہوا ہے وہاں سے گھوڑا بیکار ہے۔ پس اسی طرح فرعیات کے زینہ میں عقل کو مرکب بنانا

اوندھے منہ گرنے کی کوشش کرتا ہے وہاں سے یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

وزاں جا ببالِ محبت پری

غرض آپ کو معلوم ہوا کہ علمِ دین کیا چیز ہے کہ نظامِ عالم اس پر موقوف ہے صاحبو! میں یہ نہیں کہتا کہ ساری دنیا عالمِ اصطلاحی بنے مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ علمِ دین خواہ وہ اردو میں ہو خواہ فارسی میں خواہ عربی میں اور خواہ کتاب سے یا صحبت سے ہر شخص کو سیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد تھوڑا سا چسکا خشیت کا بھی ضرور لینا چاہیئے اگر یہ شبہ ہو کہ علم کے بعد تو خشیت ہو ہی جائے گی۔ تو سمجھو کہ علم موقوف علیہ ہے اور شرط ہے خشیت کی نہ کہ خشیت کی علت تامہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خشیت بدون علم کے نہیں ہوتی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں علم ہوگا خشیت بھی ضرور ہوگی۔ اور یہی وہ بات ہے جس کے لئے میں نے پہلے کہا تھا کہ طلبہ اس جملہ کو یاد رکھیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس مقام پر دو شبہے ہو رہے ہیں ایک تو علماء کو ایک عوام کو، علماء کو تو یہ شبہ ہوا کہ جب اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (بیشک خدائے تعالیٰ سے اُس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں) فرمایا گیا ہے اور ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے تو ہم اس فضیلت میں داخل ہوئے اور مخدوم الخلائق و وارث نبی ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ محض علم سے خشیت ہونا ضروری نہیں اس کے لئے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ وہ دنیا کے بندے ہیں اور ان کو خدا کا خوف کچھ بھی نہیں ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ بھی زائل ہو گیا عوام کے اعتراض کا اکثر لوگ یوں جواب دیا کرتے ہیں کہ جس عالم کو خوفِ خداوندی نہ ہو اس کا علم معتد بہ نہیں ہے

پس جہاں علم معتد بہ ہوگا وہاں خشیت ضروری ہے۔ یہ جواب فی نفسہٖ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا اس لئے کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہوگی اور علم سے مراد علم مع الخشیۃ ہوگا پس خشیت مرتب ہوگی خشیت پر پس تقدم الشئ

علیٰ نفسہ لازم آئے گا اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ خوف کا پیدا کرنا ضروری اور اس کا موقوف علیہ ہے علم۔ اس کو حاصل کرو لیکن علم حصولِ خشیت کی علۃ تامہ نہیں بلکہ اس علت کا ایک جزء ہے دوسرا جزء دقرآن شریف کے دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور چاہئے کہ ہر نفس غور کرے کہ کل کے لئے کیا بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تقویٰ بمعنی خشیت کا حکم ہے پھر وَلْتَنْظُرْ میں اس کا طریقہ ہے کہ اپنے اعمال کو سوچا کرو اس کے بعد بطور نتیجہ کے ارشاد ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ یعنی جب یہ غور و فکر کرو گے تو تم کو تقویٰ و خوف حاصل ہو جائے گا علاوہ آیت کے تجربہ سے بھی معلوم ہے کہ نرے علم سے خشیت نہیں ہوتی بلکہ علم کے ساتھ خوض اور غور کی ضرورت ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ (جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط بھی فوت ہوگیا) اور دوسری چیز یہ ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر خوب سوچا کرو کہ قیامت کے لئے ہم نے کیا سامان تیار کر رکھا ہے جب وہاں پوچھ ہوگی تو ہم کیا جواب دیں گے جس کو دوسری جگہ فرماتے ہیں اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (قریب آگیا لوگوں کے لئے ان کا حساب اور وہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کرنے والے ہیں) اس سے ایک خاص اثر پیدا ہوگا اور جس کو اصطلاح میں حال کہتے ہیں تو اصلاح میں تین امر ضروری ہوئے۔ ایک علم، دوسرا عمل، تیسرا حال چونکہ جب تک حال نہ ہو نرے علم و عمل سے کام نہیں چلتا مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ زنا حرام ہے اور اس پر عمل بھی کرے کہ زنا سے بچا رہے لیکن اس عمل کو بقا راس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اس عمل میں صاحب حال نہ ہو جائے بغیر حال کے عمل ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی کہ اس کو ہاتھ سے ڈھکیل کر کچھ دور تک لیجائیے لیکن جہاں چھوڑ دیجئے رہ جائے گی کیونکہ اس میں آگ نہیں پس یا تو خود انجن بن جاؤ کہ تمہارے اندر آتش محبت الٰہی بھری ہو نہیں تو کسی انجن کے ساتھ ہو لو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہی حالت ہو گی

جس کو پہلی مثال میں عرض کیا۔ حضرت عراقی کہتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزا وار بمن نمائی　　کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(اے صنم قلندر کا راستہ لائق ہے اگر تو مجھ کو دکھائے اس واسطے کہ میں پارسائی کے راہ ورسم سے دور دیکھتا ہوں)

پارسائی سے مراد عمل محض ہے کہ یہ دور و دراز راستہ ہے بلکہ اس راستہ میں اکثر نیت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اخلاص کے ساتھ ریا شامل ہو جاتی ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد　　کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

(جب میں نے زمین پر سجدہ کیا زمین سے ندا آئی کہ تو نے ریا کے سجدہ سے مجھکو خراب کیا)

اور فرماتے ہیں کہ ؎

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند　　کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

(میں کعبہ مکرمہ کے طواف کے لئے گیا مجھ کو حرم کا راستہ نہ دیا اس واسطے کہ دروازہ کے باہر تو نے کیا کیا ہے کہ جس کے سبب حرم میں داخل ہو)

غرض حال نہ ہو تو عمل اکثر بیکار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ نرا حال بھی کافی نہیں جیسا کہ آجکل جہلا نے برنگ تصوف اس کا دعویٰ کیا ہے کیونکہ اول تو قرآن شریف سے عمل کی ضرورت ثابت ہے۔ دوسرے عقلاً بھی حال کے لئے عمل لازم ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص محض صاحب حال ہو اور اس کا حال کبھی ظہور پذیر نہ ہو اور یہی عمل ہے دیکھو اگر مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو تو کیا حالت ہوتی ہے کہ اول تو اس کو دیکھتے ہی اس کی تعظیم کے لئے زمین پر گر پڑے گا پھر جا کر اس کو لپٹ جائے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ محبوب کو دیکھے اور اس کو حرکت بھی نہ ہو یوں ہی دیوار کی طرح کھڑا رہے تو اگر ان درویش کو محبت خداوندی ہے تو اس کا ظہور کیوں نہ ہوتا اطاعت کیوں نہ ہوتی۔

غرض علم بھی ضروری عمل بھی ضروری حال بھی ضروری پس اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ میں خشیت حال ہے اس سے بقا اور سہولت ہوتی ہے گویا خشیت ہی سے عمل کی بقا رہوتی ہے اسی سے عمل میں سہولت ہوتی ہے اسی سے عمل کی توفیق ہوتی

ہے کیونکہ جب تک چسکا نہ ہو کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ حال ہی سے دنیا کے کام بھی چلتے ہیں دیکھئے اگر رات کے دو بجے کسی جگہ ریل میں جانا ہو تو عین وقت پر بلا کسی کے بیدار کئے خود بخود آنکھ کھل جانا یہ حال ہی کی بدولت ہے اور صاحبو یہی حال اور جاذب وہ چیز ہے کہ آپ کو تو کیا سولے دیتا اس نے تو محبوب حقیقی تک کو تمہاری طرف متوجہ کر دیا ہے خوب کہا ہے۔

ع عشق را نازم کہ یوسف رابازار آورد

(عشق پر ناز کرتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لایا)

تو زلیخا کو تو کیا چین ہوتی یوسف علیہ السلام کو بھی چین سے کنعان میں نہ بیٹھنے دیا ع۔ ہچو صنعا زاہدے راندیر زُنار آورد (زاہد صفا کی طرح زنار کے نیچے لایا) اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ جو ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ مراد زُنار سے بدنامی اور ملامت ہے اور واقعی جو شخص بھی عشق کے رنگ میں آتا ہے بدنام ہوتا ہے ہمارے ایک دوست ہیں ڈپٹی کلکٹر جس روز سے ان پر یہ حالت غالب ہوئی ہے دنیا سے دل سرد ہو گیا اب صرف ان کو یہی ایک سبق یاد ہے۔ بس گویا یہ حال ہے کہ

ے ماہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الاّ حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(جو کچھ پڑھا ہم نے بھلا دیا مگر یار کی باتیں نہیں بھلائیں کہ ان کا بار بار تکرار کرتے ہیں)

ان کے خاندان کے لوگ ان سے خفا اور میرے شاکی ہیں کہتے ہیں کہ قیامت میں ان سے باز پرس ہوگی یہ قوم کے افراد کو تباہ کر رہے ہیں مگر میں اس کے جواب میں وہی کہونگا جو کہ ہمارے بزرگ حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا۔ کہ میاں ہم کو بھی تو کسی نے بگاڑا ہے ہم کو بھی یہی بگاڑنا آتا ہے۔ لوگ کیوں ہمارے پاس بگڑنے آتے ہیں ہم کسی کو بلانے تو نہیں جاتے۔ صاحبو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے قوم کے افراد کو کیا بگاڑ دیا نوکری سے میں منع نہیں کرتا قطع تعلقات کو میں نہیں کہتا ہاں یہ کہتا ہوں کہ فرعون نہ بنو تم کسی نے بندے ہو بندگی کو اپنا شعار رکھو۔ غرض عاشق کے لئے بدنامی لازم ہے یہ معنی ہیں۔ ہچو صنعا زاہدے را۔ کے

لیکن صاحب محبت کو بدنامی کی ذرا پروا نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کو نہیں چاہتے)

بلکہ بدنامی سے قلب میں اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ہمت بڑھتی ہے اور یوں کہتا ہے کہ ؎

ساقیا برخیز د در دہ جام را خاک برسر کن غم ایام را

(اے ساقی اٹھ تو اور جام دے تو اور زمانہ کے غم پر خاک ڈال)

اور

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کو نہیں چاہتے)

الحاصل اس کو کچھ بھی پروا نہیں ہوتی اس کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

غرض جب یہ محبت اور جمال محبوب تک کو متوجہ کر دیتا ہے تو آپ کو تو کیا چین سے رہنے دے گا بس یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

(مجھ کو جاناں کی منزل میں کیا امن و عیش جبکہ ہر سانس گھنٹہ فریاد رکھتا ہے کہ محمل باندھو)

کہ ہر وقت گھنٹی بج رہی ہے کہ چلو اور بیدار رہو۔ دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

ایں قدر ہست کہ بانگے جرسے می آید

اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ واقعی گھنٹی بجتی ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھنٹی کا کام جگا دینے کا ہے۔ ان کے دل میں ہر وقت ایک محرک تقاضا کرتا ہے اور وہی حال ہے اسی لئے بزرگوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ رات رات بھر روتے تھے اور فرمایا کرتے تھے

؎ اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن گو بدم من سر من پیدا مکن

(اے خدا اس بندہ کو ذلیل مت کر گرچہ میں برا ہوں میرے بھید کو ظاہر مت کر)

ایک اور بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ رات بھر پریشان رہتے جب بیوی زیادہ

تقاضا کرتی تو آرام کرتے لیکن تھوڑی دیر میں پھر چونک کر اُٹھ بیٹھتے اور فرماتے کہ کیا کروں یہ آیت نہیں سونے دیتی یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (اے ایمان والو! اپنے آپ اور اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ) حاصل یہ کہ تقوے کیلئے تکر غد ضروری ہے کہ یوں سوچے کہ اس کے لئے ایک خاص زاد کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہم بالکل مفلس پراگندہ ہیں یہ ایسا افلاس ہے کہ دنیا کا افلاس اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں دنیا کا افلاس آخر ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس افلاس کا کہیں خاتمہ نہیں وہاں یہ حالت ہوگی ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

(بازار کتنا ہی سامان سے زیادہ بھرا ہو لیے خالی ہاتھ والے کا دل زیادہ پریشان ہوتا ہے)

کہ وہاں کا بازار گرم ہوگا اقسام اقسام کی عمدہ چیزیں سجی ہوں گی مگر ہماری جیب خالی ہوگی۔ ذرا غور کرو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی صاحبو! ہنوز وقت باقی ہے اپنا علاج کرلو اور زاد راہ جمع کرلو وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ ایک کلیہ ہے اللہ کے بندوں نے اس کے جزئی طریقے نکال کر بتلا دیئے ہیں ان میں ایک طریقہ یہ ہے کہ دن رات میں ایک وقت تجویز کرلو اور اس وقت بیٹھ کر سوچا کرو۔ سب سے اول یہ سوچو کہ خدا تعالےٰ کی کیا کیا نعمتیں ہم پر ہیں اس کے بعد یہ سوچو کہ ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا برتاؤ ہے ہم اس کی نعمتوں کا کس قدر شکر ادا کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں تو صبح سے شام تک کے گناہ ہی گن ڈالے اس کے بعد غور کرے کہ اگر ہمارا یہ برتاؤ کسی دوسرے سے خصوص حاکم یا آقا سے ہوتا تو وہ کیا کرتا اور جو کچھ ذہن میں آئے اُس کی بابت سوچے کہ خدا تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ یہ کرسکتا ہے اس کے بعد سوچے کہ میدان قیامت برپا ہے آفتاب قریب آگیا ہے احکم الحاکمین کا اجلاس ہو رہا ہے نہ کوئی بیرسٹر ہے نہ کوئی وکیل ہے اور اس اثنا میں مجھے پکارا گیا ہے فرشتے آئے اور مجھ کو پکڑ کر لے گئے اور وہاں لے جاکر چھوڑ دیا۔ اب مجھ سے میرے اعمال کی بازپرس ہو رہی ہے اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں نہ کوئی ٹھکانا ہے کہ وہاں بھاگ کر پناہ لوں وہاں سامنے جہنم ہے ملائکہ گرفتار کرکے مجھ کو: پا بدستے دگرے دست بدست دگرے + جہنم کی

طرف لے جا رہے ہیں بس یہ سوچ کر فوراً سر بسجود ہو جاؤ اور نہایت گڑگڑا کر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور روؤ اور اگر رونا نہ آئے رونے کی صورت بناؤ اور یہ دعا کرو کہ اے خدا میرے گناہوں کو معاف کر اور مجھے ہمّت دے کہ مجھ سے گناہ نہ ہوں یہ تو رات کو کرے اور دن میں علماء کے رسائل لے کر ان کو پڑھے اور اپنے بچوں اور بیوی کو بھی پڑھاوے اگرچہ بچے انگریزی ہی پڑھتے ہوں افسوس تم لوگ اولاد کو کندۂ جہنم بنانے کے لئے پرورش کرتے ہو صاحبو! جب ان کا مآل یہ ہوا تو ان کے پیدا ہونے سے اور پرورش ہونے سے کیا نفع ہوا اس سے تو پیدا نہ ہوتے اور بچپن میں مرجاتے تو اچھا تھا ؎

مرا اے کاشکے مادر نمی زاد   وگر میزاد کس شیرم نمی داد

(مجھ کو کاش کہ میری ماں نہ جنتی اور اگر پیدا کرتی کوئی مجھ کو دودھ نہ دیتا)

اور اُن رسائل میں جہاں شبہ ہو اس کو علماء سے حل کرلو جب یہ دو کام شروع کردو گے ان شاء اللہ خود بخود اعمال کی توفیق ہوگی یہ حالت ہو جائے گی جس کو فرماتے ہیں یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور کہو سیدھی بات درست کردے گا وہ تمہارے لئے تمہارے اعمال کو) کہ تقویٰ سے مراد خشیت اور قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ سے مراد اعمال جب یہ دو کام جمع کرلوگے تو اس سے خشیت پیدا ہوگی پھر اعمال خود بخود درست ہو جائیں گے اور یہ زندگی عمدہ زندگی ہو جائے گی پھر یوں کہہ سکو گے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

(ہرگز نہیں مرتا وہ شخص کہ اس کا دل عشق سے زندہ ہو گیا دنیا کے تمام اخبارات پر ہمارا دوام ثابت ہو گیا)

تم اپنی اس زندگی موجودہ پر کیا ناز کرتے ہو حیات یہ ہے جس کو حیات ابدی کہتے ہیں اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ موت تو آئے گی پھر جریدۂ عالم پر دوام کہاں ہوا ؎

تو سمجھو کہ وہ موت ظاہری موت ہے وہ ایسی موت ہے کہ جس کی تم خود تمنا کرو گے

کہ وہ آئے تو یہ ہیولانی حجابات کی دیوار اُٹھے اور موت کے وقت یوں کہو گے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وہ وقت آگیا کہ میں برہنہ ہوجاؤں جسم کو چھوڑدوں اور بالکل روح ہوجاؤں)

گویا جسم کے چھوٹنے پر خوش ہوگے اسی لئے کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا درمیکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(میں خوش ہونگا اس دن کہ اس ویران منزل (دنیا) سے چلا جاؤں۔ روح کی آرام طلب کرتا ہوں اور جاناں کے دربار میں چلا جاؤں۔ میں نے نذر کی کہ اگر یہ دن غم کے ساتھ بسر ہوجائیں تاکہ شراب خانہ کی طرف خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

اللہ اکبر کیا خوشی ہے صاحبو! وہ اس موت کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ اس کی تمنا کرتے ہیں اور اس زندگی کا ان کو ایسا یقین ہے کہ اس یقین کے بعضے آثار تک ظاہر ہونے لگتے ہیں چنانچہ ہمارے حضرت مرشدؒ نے مرض الموت میں ایک بزرگ سے یہ وصیت فرمائی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جنازے کے ساتھ ذکر ہو دیکھئے ان کو پورا یقین تھا کہ میں اس حیات کی وجہ سے استماع ذکر سے متلذذ ہوں گا مگر اتفاق سے اُن بزرگ نے کہا کہ مناسب نہیں حضرت اسی پر راضی ہوگئے اور کسی کو اس وصیت کی اطلاع نہیں ہوئی۔ اتفاق سے جس وقت جنازہ چلا اس کے ساتھ ایک عرب تھے انھوں نے للکار کر کہا اَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوا اللہَ (اے لوگو خدا تعالیٰ کو یاد کرو) چنانچہ ذکر ہونے لگا یہ کرامت ہے کہ ان حضرات کی تمنا پوری ہو کر رہتی ہے۔ خوب کہا ہے ع تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں۔ اور ایک دوسرے بزرگ نے یہ وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے چلیں ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بر دست و بر بازوئے تو

(مفلس ہیں ہم اور تیرے کوچہ میں آئے ہیں تیرے رخ انور کے جمال سے اللہ کے لئے کچھ مجھکو بھی ہاتھ کھول ہماری بھیک کی جھولی کی طرف شاباش تیرے ہاتھ اور بازو پر)

حضرات! اگر روح میں حیات نہ تھی تو یہ وصیتیں کیوں کیں اور فقط یہ نہیں کہ یہ محض ان کا خیال ہی ہو بلکہ بعض اوقات آثار کا بھی ظہور ہوا ہے حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت ہے کہ جب ان کا انتقال ہوگیا اور جنازہ لے چلے تو جنازے پر ان کے ایک خادم نے یہ اشعار پڑھنا شروع کئے ؎

سرو سیمینا بصحرا میروی سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

(ہمارا سرو سمیں ہمارا وہ محبوب جس کا قد سرو جیسا چاندی چاندی جیسا جنگل کی طرف جاتا ہے بڑی بے وفائی ہے کہ ہمارے بغیر جاتا ہے اے پیارے تیرا چہرہ تماشا گاہ عالم ہی تو تماشا کے لئے کہاں جاتا ہے)

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا۔ آخر یہ کس چیز نے ہاتھ بلند کرا دیا تھا پھر کیا یہ کہنا غلط ہے ع ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما۔ مگر مجھے خوف ہے کہ جہلا ان کو زندہ سمجھ کر ان سے مرادیں نہ مانگنے لگیں، مرادیں مانگنا زندوں سے کب جائز ہے کہ بر تقدیر ان کی زندگی کے ان سے جائز ہو دوسرے ان سے مانگو تو وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو مال و دولت یا اولاد ان کے پاس کہاں ہیں کہ وہ تم کو دیدیں گے ان کے پاس صرف ایک چیز ہے جس کو ساری عمر انھوں نے ڈھونڈا اور اسی میں عمریں تمام کر دیں یعنی خدا تعالیٰ سو اس کو اس کی مرضی کے موافق ان سے مانگو۔ تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ زندگی کیسی زندگی ہے اور اس کے حاصل ہونے کا طریق کیا ہے علم دین سیکھو اس پر عمل کرو اور اس عمل کو حال بنا لو اس سے دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی، دنیا اس معنی کر کہ تم کو راحت کلی نصیب ہوگی یہ نہیں کہ بہت سا مال مل جائیگا آگے ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کہ اول عزیز فرمایا اس کے بعد غفور پر خاتمہ آیت کیا کیونکہ اگر اس کا عکس کرتے کہ اول غفور فرماتے اور پھر عزیز فرماتے تو چونکہ خاتمہ مضمون جلال پر ہوتا اس لئے غلبۂ خوف سے مایوسی ہو جاتی کہ ہم تو اس قدر گنہگار اور خدا تعالیٰ ایسے قہار تو ہماری مغفرت کس طرح ہوگی برخلاف اس ترتیب کے کہ اس میں خاتمہ مضمون رحمت پر فرمایا ہے جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اول کچھ باز پرس ہوئی بھی تو انتہا رحمت ہی پر ہوگی لہذا تم مایوس نہ ہو جاؤ۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ آمین یا رب العالمین ۰

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم
کا
چھٹا وعظ ملقب بہ

ترغیب الاضحیہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔اے جناح روڈ) کراچی

دعوات عبدیت جلد سوم
کا
چھٹا وعظ ملقب بہ
ترغیب الاضحیہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا؟ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۰ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ روز جمعہ	تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ	بیٹھ کر	فضیلت اضحیہ	مولوی سعید احمد صاحب	تقریباً ۱۰۰ آدمی	[illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ وَرَدَ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ قَالُوْا مَا ھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) قَالَ سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ

(یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ قربانیاں کیا چیز ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے باپ

ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے فضیلت اضاحی میں اس وقت ایک مختصر سا مضمون اضاحی کے متعلق عرض کرتا ہوں ہر چند کہ خشکی سفر کی وجہ سے تکان تھا مگر بعض عزیز مہمان اس وقت آئے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے خیال آیا کہ کچھ بیان ہو جائے اور اس قدر مقدم بیان کرنے کی اگرچہ ابھی ایام اضحیہ میں مدت زیادہ باقی ہے یہ وجہ ہے کہ پھر سفر کا ارادہ ہے خدا جانے پھر وقت ملے یا نہ ملے اس وقت فقط ترغیب کے لئے فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ باقی مفصل احکام اگر وقت ملا تو انشاء اللہ تعالے قریب زمانہ میں بیان کر دیئے جائیں گے مضمون مقصود سے پہلے ایک مضمون بطور تمہید کے بیان کیا جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے کریم ہیں کہ ہمارے نفع کی کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر تبلیغ کے نہیں چھوڑی۔ قربانی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ سب احکام اس وقت ہم کو ایک معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ہم کو ان کی کچھ قدر نہیں یعنی جیسی قدر کرنا چاہئے اس درجہ قدر نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمیشہ سے آباؤ اجداد سے سنتے چلے آئے ہیں جن لوگوں کو جستجو کے بعد یہ دولت ملی ہوگی اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ جیسے بھوکا آدمی اگر آدھی روٹی بھی مل جاتی ہے تو غنیمت سمجھتا ہے اور اگر معدہ فاسد ہوگا تو اُس کو پلاؤ زردے کی بھی قدر نہ ہوگی چنانچہ صحابہؓ کے سوالات کے بعد جو جواب عنایت ہوئے ان کو تو بعد طلب ملے اور ہم کو مفت۔ جیسا اس حدیث میں بھی ایسا ہی مضمون ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ہم کو بھی ان کی قدر کرنا چاہیئے اور یہ مضامین ثواب وعذاب کے وہ ہیں کہ کوئی شئے ان سے زیادہ افضل وانفع ہمارے لئے نہیں ہے ورنہ لازم آئیگا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے دریغ فرمایا اور کام کی بات چھپائی۔ حالانکہ یہ بات ممکن نہیں۔ اور باوجود نافع ہونے کے سہل اس قدر ہیں کہ کسی قسم کی تنگی ان میں نہیں ہے بلکہ ان احکام کا سہل ہونا یہ خود دلیل انفع ہونے کی ہے اس لئے کہ قاعدہ تکوینیہ ہے کہ جو شئے زیادہ نافع ہوتی ہے وہ نہایت سہل الحصول ہوا کرتی ہے دیکھو آدمی اور سب حیوانات کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے کہ اگر ایک منٹ بھی ہوا نہ ہو تو حیات ہی معرض ہلاک میں آجائے وہ ہی اس قدر ارزاں ہے کہ اس کی کچھ قیمت ہی نہیں اس کے بعد پانی کی ضرورت ہے وہ اس قدر سستا نہیں ہے لیکن اور چیزوں

کے اعتبار سے ارزاں ہے اس کے بعد غذا کی ضرورت ہے وہ اس سے زیادہ گراں ہے اور جس شے کی بالکل ہی ضرورت نہیں ہے وہ نہایت گراں ہے جیسے جواہرات کہ عمر بھر بھی اگر کسی کو نہ ملیں تو کچھ حرج نہ ہو چنانچہ صدہا آدمی ایسے ہیں کہ وہ جانتے بھی نہیں کہ لعل کیا ہے اور زبرجد کس چیز کا نام ہے۔ اسی طرح جس قدر علوم زیادہ نافع اور کارآمد ہیں وہ نہایت سہل ہوتے ہیں چنانچہ علوم شریعت بھی ایسے ہی ہیں کہ نہایت ضروری اور نافع ہونے کی وجہ سے نہایت سہل ہیں اور ہر جگہ ان کے بتلانے والے موجود ہیں اور وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے ہیں اور یہی راز ہے اس میں قرآن شریف کی تعلیم کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور نہایت قلیل معاوضہ پر مل جاتے ہیں بخلاف دیگر علوم کے کہ وہ کم ہیں اور گراں ہیں۔ غرض دیکھنے کی چیز نفع ہے نہ کہ مضمون کی۔ دوسرے صفات مثل نایابی یا رنگینی یا لذت یا غموض وغیرہ ذالک اکثر لوگ رنگین مضامین ڈھونڈھا کرتے ہیں چنانچہ وعظ میں بھی اس کا تجسس رہتا ہے کہ جس کے وعظ میں مزہ دار اشعار ہوں اور نکتے اور لطائف وحکایات ہوں اس کو پسند کرتے ہیں اور اگر کوئی وعظ مسئلے مسائل سنا دے اس سے بھاگتے ہیں حالانکہ یہ زیادہ نافع ہے لیکن ان کو کیا معلوم ہے کہ ہمارے نفع کی کیا چیز ہے قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ (بہت سی مرتبہ تم ایک چیز ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہوتی ہے اور بہت سی مرتبہ تم ایک چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے نامناسب ہوتی ہے) حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ایسے ایسے مضامین ہم کو بتائے جو ہمارے کام آنیوالے ہیں اور بیکار اور غیر ضروری مضامین ہم کو نہیں سکھائے گو وہ رنگین ہوں یہ تمام تقریر اس لئے عرض کی گئی کہ جو مضمون اس وقت بیان کیا جائیگا اس کو بیقدر اور معمولی نہ سمجھا جائے حاصل یہ کہ ان مضامین نافعہ میں سے یہ مضمون بھی ہے کہ جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے ہمکو بتایا ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قربانی کے متعلق ارشاد فرمارہے تھے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانیاں کیا چیز ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اس مضمون کو سن کر لوگ کہیں گے کہ قربانی کی اس میں کیا فضیلت ہوئی لیکن سمجھدار کیلئے یہ بڑی بھاری فضیلت ہے، بلکہ جسقدر فضائل قربانی کے آئے ہیں ان میں سب سے زیادہ بڑی فضیلت یہی ہے چنانچہ عنقریب واضح ہوجائے گا۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ سُنَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ کیوں فرمایا سنۃ ابراہیم فرمادیتے اَبِیْکُمْ کا لفظ کیوں بڑھایا اس کے متعلق دو اعتبار سے کلام ہے اول تصحیح کے اعتبار سے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تمام امت کا باپ کیسے فرمادیا دوسرے غرض کے اعتبار سے کہ اس نسبت کی تصریح سے کیا فائدہ نکلا سو تصحیح کے اعتبار سے تو یہ ہے کہ اَبِیْکُمْ فرمانا ایک تو اس طرح اس لئے صحیح ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اکثر عرب کے باپ ہیں اس لئے

کہ اکثر عرب بنو اسمٰعیل ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام بیٹے ہیں ابراہیم علیہ السلام کے اسلئے ابیکم فرمایا لیکن چونکہ آیت میں خطاب تمام امت کو ہے اس لئے کہ احکام مخصوص اہل عرب کے ساتھ تو ہیں نہیں اس لئے بہتر وجہ دوسری ہے کہ اَبِیْکُمْ سے مراد روحانی باپ لئے جائیں اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے روحانی باپ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب ہے نسباً بھی اور شریعۃً بھی نسباً تو ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور شریعۃً اس لئے کہ شریعت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام شریعت ابراہیمیؑ سے بہت ملتی جلتی ہے اصولاً بھی اور فروعاً بھی اسی واسطے فرمایا ہے فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا یعنی اتباع کرو ملت ابراہیم علیہ السلام کا یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تو تمام ملل و ادیان کی ناسخ ہے پھر ملت ابراہیمی کے اتباع کا آپ کو امر کیوں فرمایا جواب یہ ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا امر اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ملت ابراہیم ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ملت ابراہیمی بھی اس کا ایک لقب ہے اور یہ لقب اس لئے ہے کہ یہ دونوں ملتیں آپس میں اصولاً و فروعاً باعتبار فروع کثیرہ کے متناسب و متوافق ہیں اور اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ اِتَّبِعُوْا اِبْرَاهِيْمَ کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرو بلکہ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ فرمایا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جائے کہ مذہب حنفی اختیار کرو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ شریعت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتباع شریعت میں جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے وہ اختیار کرو اب یہاں سے ان معترضین کا اعتراض بھی جاتا رہیگا جو مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں ۔ الحاصل جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام سے دینی بھی بہت قرب ہے اور نسبی بھی کہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے باپ ہیں تو اب یہ سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے روحانی باپ ہیں اور اس کی تین دلیل ہیں اول وجہ عقلی ہے وہ یہ کہ دیکھنا چاہیئے کہ باپ بیٹے کے ساتھ کیا کیا کرتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ باپ کا کام یہ ہے کہ محنت مشقت جھیلتا ہے اپنے اوپر طرح طرح کے مصائب اٹھاتا ہے جس طرح اس سے ہو سکتا ہے اولاد کو پرورش کیا کرتا ہے اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ روحانی پرورش فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے اپنی امت کے واسطے باپ کی طرح بلکہ زیادہ قسم قسم کی تکالیف برداشت فرمائیں اور امت کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ پس آپ روحانی باپ ہوئے۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ

اَنۡفُسِهِمۡ وَ اَزۡوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمۡ یعنی نبی مومنین کے ساتھ ان کے نفوس سے بھی زیادہ قریب ہیں اور نبی کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں جب آپ کی بیبیاں ہماری مائیں ہیں حالانکہ وہ مربی اُمت نہیں ہیں صرف مربی کی بیبیاں ہیں تو خود آپ جو کہ مربی ہیں ضرور باپ ہیں اور اس ابوۃ اور امومیت کو اس درجہ قوت ہے کہ نبی کی بیبیوں سے بعد وفات کے نکاح بھی حرام ٹھہرا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔ لوگوں کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس آیت سے باپ ہونے پر کیسے استدلال ہوسکتا ہے بلکہ اس سے تو ابوۃ کی نفی مستنبط ہوتی ہے لیکن بعد تقریر مقصود کے انشاء اللہ تعالیٰ واضح ہوجائیگا کہ اس سے نہایت صاف طور سے اُبوۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی جاتی ہے جس میں کلام ہو رہا ہے۔ اول ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد ہوتا ہے اور لکن کا مابعد ایک شبہ کا جواب ہوتا ہے جو لکن کے قبل سے پیدا ہوا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید آگیا لیکن اس کا بھائی نہیں آیا۔ اب اس آیت میں غور فرمائیے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا اس لئے باپ نہ ہونے اور رسول ہونے میں کیا تضاد ہے حالانکہ تضاد ہونا چاہیئے تو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جب فرمایا مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ تو اس سے شبہ ہوا کہ جب حق تعالیٰ نے ابوۃ کی نفی فرمادی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے کسی قسم کے باپ نہیں ہوئے اس لئے آگے لکن سے اُس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہاں ایک قسم کے باپ ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں یعنی روحانی باپ ہیں کہ تمہاری روحانی تربیت فرماتے ہیں پس اگر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دلالت معنی ابوۃ پر معتبر نہ کی جائے تو کلام میں ربط نہ ہوگا۔ غرض عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی باپ ہیں تو ثابت ہوگیا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے باپ کے باپ ہیں اس لئے کہ جب صرف زوجیت کے تعلق سے آپ کی بیبیوں کو ہماری مائیں فرمادیا تو نسبی تعلق تو اس سے زیادہ ہے۔ اور قرآن شریف میں بھی آیا ہے مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ یہاں تو ظاہر ہے کہ روحانی باپ مراد ہیں کیونکہ خطاب یقیناً عام ہے یہ کلام تو تصحیح میں تھا اب سمجھئے کہ غرض اور نکتہ اس لفظ کے بڑھانے میں کیا ہے کیا سُنَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ کافی نہ تھا بات یہ ہے کہ باپ شفیق بیٹے کو قسم قسم سے سمجھایا کرتا ہے اور

ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ ایسے عنوان سے اُس کو سمجھانا چاہیئے کہ مؤثر ہو جائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ باپ ہیں بلکہ باپ سے زیادہ شفیق ہیں اس لئے ترغیب کے مؤثر ہونے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان کو اختیار فرمایا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کی طبعی بات یہ ہے کہ اس کو اپنے باپ دادے سے اوران کے رسم ورواج سے نہایت تعلق ہوتا ہے اور اس رسم کا دل سے نکلنا بہت بھاری ہے چنانچہ جب کفار کو بت پرستی سے رد کیا جاتا تھا یا آجکل کی رسم مروجہ کو روکا جاتا ہے تو بڑا جواب یہ ہوتا ہے کہ ادبہ سے اسی طرح ہوتی آئی ہے۔ غرض خاندانی بات کی بڑی پچ ہوتی ہے اور یہی حکمت ہے حدیث اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ میں لہ ذہبی تخصیص کی وجہ ہے وہ یہ کہ دینِ اسلام کا ظہور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوا اور آپ قریش میں سے ہیں تو گویا دین قریش کے گھر کی چیز ہے سو جس قدر ان کو حمایت دین کی ہوگی اس قدر دوسکر کو نہ ہوگی باقی یہ کہ بنی ہاشم کو خاص کیوں نہیں کیا تو وجہ یہ ہے کہ بنی ہاشم بہ نسبت قریش کے بہت کم ہیں اور قریش زیادہ ممکن ہے کہ ان میں سے کسی وقت صاحب صلاحیت کی تلاش میں وقت ہوتی بہر اس حکمت سے تائید ہوگئی کہ خاندانی شئے سے بہت تعلق ہوتا ہے اور خصوصاً عرب میں کہ وہاں حمیتِ قومی کا بڑا جوش تھا جب یہ ثابت ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یہ قربانی کرنا تو کوئی باہر کی بات نہیں ہے یہ تو تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے یہ تو خاندانی مذہب ہے اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت پر کس قدر شفقت ہے کہ طرح طرح کے عنوانوں سے آپ ہم کو ترغیب دیتے ہیں کہ شاید عنوان مؤثر ہو جائے شاید وہ عنوان کافی ہو جائے اللہ اکبر بہرحال مقصود فضیلت بیان کرنا ہے اضحیہ کی رہا یہ امر کہ اس سے فضیلت کیسے ثابت ہوئی تو اسکا سمجھنا چند مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ اول یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت جو فرمایا تو اس کی کیا وجہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا تھا کہ جس کی وجہ سے اضحیہ سنتِ ابراہیمی ہوئی سو کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ انھوں نے کیا کیا تھا انھوں نے یہ کیا تھا کہ بامرالٰہی اپنے پیارے بیٹے کے ذبح کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔ دوسرے مقدمہ یہ ہے کہ عزم شئے اس شئے کے کر دینے کے حکم میں ہے جو ثواب یا عقاب کسی فعل کے ارتکاب کرنے پر مرتب ہوتا ہے وہ ہی اُس فعل کے عزم پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر دولہا کے پاس جو بیوی کو پہچانتا نہ ہو کسی عورت کو اجنبی عورت کہکر بھیجدیا جائے حالانکہ وہ اس کی منکوحہ ہو

اور وہ اُس سے مجامعت کرے تو زنا کا گناہ ہوگا اور اگر منکوحہ بتلا کر اجنبیہ کو بھیجدے تو کچھ گناہ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر حلال کھانے کو کسی نے مغصوب کہا تو اس کا کھانا حرام ہے اور اگر حرام کو حلال کہدیا اور اس کو کوئی شبہ تو یہ نہیں ہوا تو اس کا کھانا حلال ہے ان مسائل سے معلوم ہوا کہ ثواب و عذاب کا مدار عزم پر ہے تو گوا براہیم علیہ السلام نے ذبح نہیں کیا لیکن عزم تو فرمایا بلکہ فعل کا وجود بھی ہوا گو امر تب نہیں ہوا یعنی چھری پھیر دی اور یہی سمجھ کر چھری پھیری کہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں لیکن حق تعالیٰ نے بجائے اُن کے مینڈھے کو بھیجدیا۔ پس حسب قاعدہ مذکورہ ان کو تو فضیلت ذبح ولد کی حاصل ہوگئی۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیئے بیٹے کے ذبح کرنے اور اللہ کی راہ میں نثار کرنے کا کتنا ثواب ہے تو قواعد شرعیہ سے یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ جس شئے کو خرچ کیا ہے وہ جس قدر زیادہ محبوب ہوگی اسی قدر زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (تم ہرگز بھلائی حاصل نہ کرسکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ محبوب کا انفاق ہوگا اسی قدر بِر حاصل ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے تو نفس بِر کا حاصل ہونا معلوم ہوا۔ فضیلت اس سے کیسے معلوم ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ بِر سے مراد بِر کامل ہے اور دلیل اس کی اگلی آیت ہے فرماتے ہیں وما تنفقوا من شیءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ یعنی یوں جو بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں یعنی اس کا ثواب دے ہی دیں گے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ محبوب شئے خرچ کی جائے یا غیر محبوب ثواب تو ہر صورت میں ہوتا ہے اس لئے کہ شئے بیان ہے ما کا اور وہ عام ہے شامل ہے ہر قلیل و کثیر کو پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ نفس ثواب تو تم کو ہر شئے کے انفاق میں مل جائے گا لیکن بِر خاص محبوب ہی کے انفاق میں ہے تو یہ اسلوب دال ہے اس پر کہ بِر سے مراد ثواب کامل ہے پس وہ مدعا ثابت رہا کہ شئے منفق جس درجہ محبوب ہوگی اسی درجہ کا ثواب زیادہ ہوگا پس جب یہ امر ثابت ہو چکا تو دیکھنا چاہیئے کہ بیٹے سے آدمی کو کس قدر محبت ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹے کے ساتھ اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اپنے لئے جو کمال انسان کو محبوب ہوتا ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے کو ہو لیکن بیٹے کے لئے چاہتا ہے کہ ہر کمال میں مجھ سے بڑھ جائے ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وہ کام کیا کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نہایت ہی عظیم الشان ہوگا۔ اس کے

بعد معلوم کرنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضحیہ کو سنت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبح ولد ہے اور تضحیہ ذبح حیوان ہے پھر اضحیہ سنت ابراہیمی کیسے ہوئی تو یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا گو عمل متغائر ہوں گویا یہ فرمایا اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملیگا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھئے کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے ان کو ان کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر ان سے جو کم درجے کے ہیں ان کو اسی درجے کا انعام ملے گا مثلاً وزرار وارکان دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپراسیوں اور خدام کو کم۔ پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہیئے یعنی اگر یہی فعل ذبح ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر انعام ملنے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہ ابراہیم علیہم السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے ادون ہو وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر باوجود اس کے کہ یہ عمل ہمارا ذبح ولد سے بدرجہا ادون ہے پھر وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا ہے اللہ اکبر کتنا بڑا انعام ہے اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسا کچھ لطف وکرم ہے یہ فضیلت تو اضحیہ کی ایسی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ واجب بھی نہ ہو تو اس ثواب کی تحصیل کے واسطے وہ بھی نہ چوکے اور جس طرح بن پڑے بغیر کئے نہ رہے آخر دنیا کے بہت سے کام بلا ضرورت محض تفریح کے واسطے کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے اگر تھوڑا سا خرچ کردو گے تو کیا حرج ہوگا اور اگر ضرورت ہی پر مدار رکھتے ہو اور یوں کہتے ہو صاحب جو فرائض وواجبات ہیں ہم تو وہی ادا کریں گے تو دنیا کے کاموں میں اس پر عمل کیوں نہیں ضرورت تو اس قدر ہے کہ سدرمق جو کی روٹی اور گرمی سردی مہلک سے بچاؤ کے واسطے گاڑھے گزی کا

کپڑا مل جاوے پھر یہ پلاؤ اور زردے اور کوفتے کیوں کھاتے ہو اور ململ وتن زیب و مخمل کیوں پہنتے ہو اللہ اکبر نفس کے خوش کرنے کو تو غیر ضروری کام بھی کریں اور دین کے کام میں یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب کیا بہت ضروری ہے اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس کا ترک بہت بڑا حرج ہے تو اس کا اہتمام کریں ورنہ ترک کر دیں صحت اعتقاد کے لئے تو بیشک ضرور پوچھو کہ ضروری ہے یا نہیں کیونکہ ضروری کو ضروری اور غیر ضروری کو غیر ضروری اعتقاد رکھنا ضروری ہے لیکن کرنے کے لئے تو یہ پوچھنا کافی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش ہوتے ہیں بلا تامل نہایت مستعدی اور رغبت سے اس کو کرو بہت لوگ محبت دین کا دم بھرتے ہیں اور بدنی اعمال میں مستعد ہیں لیکن روپیہ خرچ کرنیکا جہاں وقت آیا تو وہ حیلہ حوالہ کرتے ہیں۔ اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بدو کو کسی نے دیکھا کہ نہایت پریشان بدحواس ہے اور رو رہا ہے اور پاس روٹیوں کا تھیلا بھرا رکھا ہے کسی نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو کہا کہ میرا کتا مر رہا ہے اس شخص نے کہا کہ تھیلے میں کیا ہے کہنے لگا روٹیاں ہیں اس نے کہا کہ پھر اس کو کیوں نہیں دیتا کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں یکھتا کہ روٹی دوں کہ اس کو دام لگے ہیں صرف آنسو بہانے کی محبت ہے کہ مفت کے ہیں تو بعض لوگوں کی محبت کا دعوے بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جہاں ٹکا خرچ ہو وہاں صفر ہے اور یہاں تو درحقیقت خرچ بھی نہیں ہوتا کیونکہ صدقات وخیرات میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ کہیں جاتا نہیں جو کچھ ہے اپنے ہی لئے ہے بلکہ قربانی تو ایسی شئے ہے کہ کچھ ہاتھ سے بھی نہیں نکلتا اس لئے کہ ثواب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اجزاء قربانی کے تقسیم ہی کر دو بلکہ اختیار ہے خواہ تقسیم کر دو یا خود منتفع ہو ہاں بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ غرض سب اپنے پاس سے رکھو جب بھی ثواب ملتا ہے اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ خرچ کرا کر لیتے بھی نہیں پھر کیا چیز مطلوب ہے کیوں خرچ کرواتے ہیں اس سے مقصود کیا ہے اگر کہو گوشت کھلانا ہم کو منظور ہے تو منیٰ اور مکہ معظمہ میں ہزاروں جانور ذبح ہوتے ہیں ان کا کوئی گوشت بھی نہیں کھاتا بالکل ضائع ہوتے ہیں اور یہ عقل کے خلاف ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو فحش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شئے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقے سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک

بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہ خانہ میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اسکا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئیگا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقے سے انسان پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کو خلاف عقل معلوم نہیں ہوتا تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا کہ چار روٹیاں ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو پی لو اور باتیں بنالو جب اتنی عقل ہے تو اسرار شریعت کہاں سے سمجھ میں آئیں۔ ایسے ہی نفس اضحیہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے اور اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگئی اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت و راز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتلائے دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنت ابراہیمی کا اتباع ہے اور شئے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کر دیا اور یہاں سے ایک امر اور بھی ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ جب قائم مقام ولد کے ہے تو اس جانور کے اندر ضرور ایسے صفات ہونا ضروری ہیں کہ جن سے قائم مقام ولد کے ہو وہ یہ کہ خوب موٹا تازہ جانور ہو کہ ذبح کرتے ہوئے کچھ تو دل دکھے جیسے ذبح ولد میں دل دکھتا۔ بالکل مریل نہ ہو کہ جس کے ذبح ہو جانے کو غنیمت سمجھے کہ مرتا تو یہ ضرور خیر اچھا ہوا اس سے یہی کام نکل آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفیاں تھیں یہ جو لوگوں کی عادت ہے کہ ردّل خدّل کم قیمت جانور ذبح کر دیتے ہیں یاد رکھو کہ وہاں بھی ایسا ہی ملے گا اور جبکہ وہ پھر تم کو ہی ملنے والا ہے تو جس قدر اس میں خرچ کرو گے اپنے ہی واسطے ہے اور یاد رکھو صدقہ سے مال گھٹتا نہیں حدیث شریف میں ہے لَا يَنْقُصُ مَالٌ مِّنْ صَدَقَةٍ قَطُّ اور اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اگر دس روپئے پاس تھے تو دس ہی رہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ برکت ہوتی اور کام آتا ہے اگر صدقہ نہ دیتا تو وہ ادہر ادہر ضائع ہو جاتا اور صدقہ

دینے سے جس قدر باقی رہتا ہے وہ سب اسی کے کام آتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آجکل کے نو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سرتا سر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال ضائع کہاں ہوا۔ اور اگر کہا جائے کہ جی دکھتا ہے کہ ہماری شئے جاتی رہی جواب یہ ہے کہ وہ تمہاری شئے ہے کہاں تم خود تو اپنے ہو ہی نہیں تمہاری شئے کہاں سے آئی تم خود مملوک ہو غلام کسی شئے کا مالک نہیں ہوا کرتا اگر کوئی کہے کہ ہم مملوک نہیں ہیں اول تو کون ایسا ہوگا جس کا یہ اعتقاد ہو کہ ہم اللہ کے مملوک نہیں ہیں دوسرے یہ کہ اس کی ایک دلیل بھی ہے وہ یہ کہ دیکھو خودکشی حرام ہے اگر تم اپنے مالک ہوتے تو اپنے اندر جو چاہتے تصرف کر سکتے تھے پس آپ بھی خدا کے ہیں اور جانور بھی خدا کے اگر کوئی کہے کہ جناب مال خرچ کرنے سے تو دل تنگ نہیں ہوتا بلکہ اس سے دل دکھتا ہے کہ جانور کی جان ضائع ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ آپ بے فکر رہئیے جب خود مالک ہی ضائع کرائے تو آپ کون ہیں بڑے دردمند نکل کر آئے ہیں۔

ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر ست (جس عیب کو بھی بادشاہ پسند کرے وہ ہنر ہے)

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(اگر دین کا بادشاہ مجھ سے یہ خواہش کرے کہ میں لالچ اور حرص کروں تو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈال دینا چاہیئے)

اور اگر کسی طرح اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو اس طرح سمجھو کہ بعض دوائیں تو مؤثر بالکیفیت ہوتی ہیں اور بعض مؤثر بالخاصہ ہم یہ کہتے ہیں کہ نصوص سے ثابت ہو گیا کہ یہ اعمال صالحہ مؤثر بالخاصہ ہیں ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ اضحیہ ہمارے لئے نافع ہے اس میں یہ خاصہ ہے ہم کو لم اور علت معلوم نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے عزیز محمد بن ذکریا طبیب اگر کہہ دیں کہ فلاں دوا میں یہ خاصہ ہے تو اُس کے کہنے پر تو ایسا یقین رکھتا ہے کہ اس میں شبہ ہی نہیں ہوتا اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کسی فعل کا خاصہ بیان فرمادیں تو اس میں تجھ کو شبہ ہوتا ہے بفضلہ تعالیٰ بقدر ضرورت فضیلت اضحیہ کی ثابت ہوگئی اس وقت میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں فقط۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

ضَرُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

دعواتِ عبدیت جلد سوم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

ضرورۃ التوبہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد ریاست خیرپور سندھ	۲۷ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹے	کھڑے ہوکر	ضرورۃ توبہ	مولوی سعید احمد صاحب	تقریباً ۲۰۰ آدمی	عہدہ داران ریاست زیادہ تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ

تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ (اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور تم کو جنت کے ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی)

یہ ایک آیت ہے سورۂ تحریم کی اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو اپنی رحمت کاملہ سے ایک عجیب وغریب نسخۂ اکسیر کا دیا ہے جس سے لوہا بھی سونا ہو جائے۔ دیکھئے لوگ کیمیا کی تلاش میں اپنا عزیز مال اور وقت ضائع کرتے ہیں حالانکہ کیفیت اس کی یہ ہے کہ حکماء اس کے وجود ہی میں مختلف الرائے ہیں بعض کہتے ہیں کہ کیمیا کا وجود ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں پس اس کا وجود مشکوک ہوا تو یقینی نفع کو یعنی مال اور وقت کو ایک موہوم توقع میں برباد کردیتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ کیمیا کا وجود ہے تو آپ نے بہت کم سنا ہوگا کہ کسی نے کیمیا بنائی ہو اگرچہ اس قسم کے واقعات بہت مشہور ہیں لیکن اس کا وقوع ثابت ہونا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اس کا وجود مشکوک ہی رہا اور اس کے وقوع میں احتمال ہی رہا اور احتمال وہ چیز ہے کہ اس کی بنا پر بہت ضروری ہے منفعت موہوم واجب السعی نہیں اور مضرت موہوم واجب الاحتمال ہے بالخصوص جبکہ اس میں کوئی فوری مضرت ہو کیمیا بھی ایسی ہی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے یقینی نفع کو نقصان پہنچتا ہے اسی لئے فقہا نے اس کو ناجائز کہا ہے حتیٰ کہ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی متولی وقف کی نسبت یہ معلوم ہو کہ وہ کیمیا کی لت میں ہے تو اس کو موقوف کردیا جائے۔ اسی طرح جتنے جرائم قانونی ہیں سب میں مضرت ہے اگرچہ مضرت فوری نہ ہو بلکہ اس کے مآل میں ضرر ہو دیکھئے جوا کھیلنے میں فوری نفع ہے اور اس وجہ سے وہ طبعاً مطلوب ہے مگر مآل اس کا ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتا ہے اور یہاں سے ایک عجیب راز معلوم ہو گیا ہوگا ایک وجدانی شبہ کے رفع کا کہ اکثر لوگوں کو گناہوں کے چھوڑنے میں گرانی ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس قدر نفع اور لذت کی چیز ہے لیکن شریعت اس کو منع کرتی ہے حتیٰ کہ ہمارے روشن خیال حضرات تو علماء کو رائے تک دینے لگے ہیں کہتے ہیں کہ ترقی وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ سود حلال نہ ہوجائے اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی ترقی کے مانع نماز ہے کہ ایک شخص اسلام کی طرف راغب ہوتا ہے

مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ نماز بھی گلے پڑے گی تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اسلام لانے سے رُک جاتا ہے تو نماز کو اسلام کی برادری سے علیحدہ کرنا چاہیئے۔ افسوس یہ مسلمانوں کی رائے ہے۔ صاحبو! مجھے اس موجودہ رفتار سے سخت اندیشہ ہے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ایک جانب تو احکام اسلامیہ کے استحسان کو ماننے جاتے ہیں اور اُن پر مضامین لکھتے ہیں کوئی نماز کی حکمت بیان کرتا ہے کوئی روزے کی حکمت بیان کرتا ہے ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں جو یہ تعلیم ہے کہ اگر کسی برتن کو کتا چاٹ جائے تو اس کو سات مرتبہ دھو ڈالو جس میں ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرو۔ ایک مدت تک میں سوچتا رہا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ مٹی سے صاف کرنے کو کہا گیا آخر غور کرنے اور مٹی کے اجزاء کو دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جزء نوشادر کا بھی ہوتا ہے اور وہ کتے کے لعاب دہن کی سمیت کو دفع کر دیتا ہے۔ ایک عیسائی نے لکھا ہے کہ شریعت اسلامی کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں یعنی کوئی حکم خلاف عقل نہیں اگرچہ بعض احکام احاطۂ عقل سے باہر ہوں اور عقل ان کی لِم دریافت نہ کر سکے اُدھر تو ان اجانب کی مدح سرائی کا یہ حال اِدھر ہمارے مسلمان بھائیوں کی یہ حالت نہ دین سے واقفیت نہ متابعت اور اعتراض کرنے کو آمادہ ہیں اسلامی تعلیم کے خلاف مضامین شائع کرتے ہیں کہ روزہ میں یہ خرابی ہے اور نماز سے ترقی رکتی ہے اگر یہی رفتار ہے تو عجیب نہیں کہ ایک صدی کے اندر اندر بہت سے مسلمان بالکل دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں اور غیر مسلم مسلمان ہو جائیں۔ صاحبو! حیرت کی بات ہے مجھے خدا تعالیٰ کا وہ قول یاد آیا ہے فرماتے ہیں اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُمْ ۝ کہ یہ نہ سمجھو کہ مدار دین کا اور اس کی ترقی اور اشاعت کا تم پر ہے۔ یاد رکھو اگر تم اسلام سے رُوگردانی کرو گے خدا تعالیٰ تمہارے بجائے ایک دوسری قوم بھیجے گا جو تمہاری طرح نہ ہو گی تم کو تو احسان مند ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو ایسی نعمت دی قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ط (کہدیجئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان جتاتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت کی)

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

(یہ احسان مت رکھ کہ تو بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ اس کا احسان مان کہ اس نے تجھ کو اپنی خدمت کے لئے رکھ لیا ہے)

تو خدا تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ ہم کو نورِ اسلام دیا ہمارا کیا احسان ہے۔ صاحبو! اس آیت میں اور اپنی حالت میں ذرا غور کرو استبدال کی یہ بھی صورت ہے کہ جو آجکل ہو رہی ہے کہ مسلمان اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور غیر قومیں اسلام کی طرف جھکتی چلی جا رہی ہیں تو گویا موجودہ حالت تمہید ہے استبدال کی۔

اگر اس اندیشہ سے بچنے کی فکر ہے تو اس کی تدبیر یہی ہے کہ اپنے اس رویہ کو چھوڑو اور وہ حالت پیدا کرو کہ جیسے ایک غلام کی حالت ہوتی ہے خدا تعالیٰ سے جو ہمارا تعلق ہے وہ آقا اور نوکر کا سا نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق خدا سے سید اور غلام اور محب اور محبوب کا ہے پس ہم کو ان ہی دو تعلقوں کو غلبہ دینا چاہیئے کہ اپنے کو مملوک اور اس کو مالک اور اپنے کو محب اور اس کو محبوب سمجھیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو محب نہیں بنتے کہ ہم پر حقوق واجب ہوں تو میں کہوں گا کہ حضرات اب آپ کیا محب نہیں بنیں گے محب تو آپ اس دن ہو چکے جس دن مسلمان کہلائے کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ الشیئ اذا ثبت ثبت بلوازمہٖ کہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اور اسلام کے لوازم سے ہے محب ہونا فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (اور وہ لوگ جو ایمان دار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ زیادہ محبت رکھنے والے ہیں) اور شدتِ محبت ہی کا نام عشق ہے پس آپ تو عاشقِ خدا ہو چکے اور اگر کہیئے کہ ہم کو تو اپنا عاشق ہونا معلوم بھی نہیں پھر ہم کیونکر عاشق ہوئے تو سمجھئے کہ کسی وصف کے حاصل ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں ہے کہ اس کا علم یا اس کی طرف التفات بھی ہو۔ دیکھئے اگر ایک شخص مرے اور دس ہزار کی جائیداد چھوڑ جائے یا بنک میں دس ہزار روپیہ چھوڑے اور ایک نابالغ لڑکا وارث چھوڑے تو باپ کے مرنے کے بعد اس لڑکے کے لئے وصفِ مالکیت ثابت ہوا لیکن اس لڑکے کو خبر بھی نہیں تو ہماری بھی یہی حالت ہے کہ ہم کو عشق ہے اگرچہ خبر نہیں اور اس کی طرف

التفات نہیں گویا وہ حالت یہ ہے کہ ؎

یک سبد تانے ترا بر فرق سر تو ہے جوئی لب نان دربدر

(کہ ایک ٹوکرا بھرا ہوا روٹیوں کا سر پر رکھا ہوا ہے اور بھیک مانگتا پھرتا ہے)

اور طریقہ خبر ہونے کا یہ ہے کہ ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں رایک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بردید رنگ رنگ

(برسوں تک تو پتھر کی طرح دل کو تکلیف دینے والا رہا آزمائش کے طور پر ہی تھوڑی دیر کے لئے مٹی بن جا۔ بہار کے موسم میں بھی پتھر کب سرسبز ہوتا ہے تو مٹی بن جا تاکہ تجھ میں رنگ برنگ کے پھول اگیں۔)

کہ آزمانے ہی کے لئے ایک تھوڑی مدت خاک ہو جاؤ تو آپ اگر اپنی دولت کی خبر چاہتے ہیں تو اپنے ادراک سے خبر لیجئے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ آنکھ ہو کیونکہ مثلاً اگر ایک نابینا مادرزاد سے رنگ کی حقیقت پوچھے تو اس سے یہی کہا جائیگا کہ رنگ تو تمہارے کپڑے ہی میں موجود ہے مگر اس کے لئے صرف ہاتھ کافی نہیں نہ محض سُن لینے سے اس کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے اگر اس کو دریافت کرنا چاہو تو اول آنکھ پیدا کرو۔ اسی طرح جو لوگ قرآن شریف میں تاویلیں کرتے ہیں اور اپنی رائے سے قرآن شریف کے معنے بیان کرتے ہیں تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ہاتھ سے رنگ کا دریافت کرنا جس طرح محض ہاتھ سے رنگ دریافت نہیں ہوتا اسی طرح محض رائے سے قرآن کے مقصود تک نہیں پہونچا جا سکتا ؎

بر ہوا تاویل قرآں میکنی پست و کژ شد از تو معنی سنی

چوں ندارد جانِ تو قندیلہا بہر بینش میکنی تاویلہا

کردہ تاویل لفظِ بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را

(تو اپنی خواہش کے موافق قرآن کے معنے بیان کرتا ہے تیری وجہ سے اچھے معنی خراب ہو گئے ہیں جبکہ تیرے پاس روشنی کی قندیلیں نہیں ہیں تو تو اس کے دیکھنے کے لئے تاویلیں کر رہا ہے تو نے لفظ بکر کی تاویل کر دی ہے یعنی نئی نئی تاویلیں کر رہا ہے حالانکہ تجھے اپنی

خواہشات کو بدل کر قرآن کے موافق کرنا چاہیئے قرآن کو نہیں بدلنا چاہیئے)

صاحبو! اپنے اندر تصرف کرو کلام اللہ میں تصرف نہ کرو اپنی آنکھیں کھولو اور اس سے حجاب اٹھاؤ پھر دیکھو تم کو کیا کنز مکنون نظر آتا ہے اور وہ حجاب حُبِّ دنیا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ مال وجاہ کی محبت بہت بڑا حجاب ہے اسی کی محبت تھی کہ بنی اسرائیل کے علماء باوجودیکہ ان کو آپ کا نبی ہونا معلوم تھا لیکن ایمان نہ لاتے تھے جانتے تھے پر مانتے نہ تھے یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (وہ اس کو اتنا جانتے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں) لیکن باوجود اتنی معرفت کے ان کو حقیقت نظر نہ آتی تھی کیونکہ حُبِّ مال و جاہ کا حجاب آنکھوں پر پڑا ہوا تھا اور جب حقیقت معلوم نہیں ہوتی تو دل میں وقعت اور عظمت نہیں ہوتی۔ دیکھئے اگر کوئی آگ میں کود ے تو اگرچہ کہا جائے گا کہ یہ آگ کو جانتا تھا لیکن یہ نہ کہا جائے گا کہ آگ کی حقیقت اس کی نظر میں تھی اور جتنے جرائم اس قسم کے لوگ کرتے ہیں اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کو اصلی حقیقت اس چیز کی معلوم نہیں ہوتی اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی کنوئیں میں گر جاتے ہیں لیکن گرنے کے بعد جب ان کو کنوئیں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اس وقت کوئی ان سے پوچھے کہ کنوئیں میں گرنے کی بابت اب آپ کا کیا فتویٰ ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب نے کسی بات پر طیش میں آکر سنکھیا کھالیا کھا تو گئے لیکن جب کھانے کے بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو آنکھیں کھلیں پھر یہ حالت تھی کہ لوگوں سے التجائیں کرتے تھے کہ کسی طرح مجھے اس سے نجات دلواؤ۔ تو بنی اسرائیل کو اگرچہ معرفت تھی لیکن آپ کی حقیقت اُن سے مخفی تھی اس لئے کہ حجابات مرتفع نہ ہوئے تھے اور ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب کسی کام میں ذاتی غرض پیش نظر ہوتی ہے تو بھلائی اور ہنر چھپ جاتا ہے اور دل کی طرف سے سیکڑوں پردے اٹھ کر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں)

پس آپ ان حجابوں کو دور کر دیجئے حقیقت بالکل قریب ہے بلکہ حقیقۃ الحقائق جل و علا کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم تو اس کی گردن کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے خداوند تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا کہ یَا رَبِّ دُلَّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ طُرُقٍ اِلَیْکَ کہ اے خدا مجھے آپ تک پہنچنے کا وہ رستہ بتلا دیجئے جو سب سے زیادہ قریب کا ہو۔ سبحان اللہ کیسے سچے رہبر تھے کہ ہمارے لئے کتنا سہل رستہ تحقیق کر گئے۔ یہ آج جو لوگ آسانی سے منزلیں طے کرتے چلے جا رہے ہیں انھیں حضرات کا طفیل ہے۔ غرض خواب میں عرض کیا کہ لے خدا مجھے قریب کا رستہ بتلا دیجئے ارشاد ہوا کہ یَا بَایَزِیْدُ دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالَ کہ پندار اور خود بینی کو چھوڑ دو پھر رستہ سیدھا ہے بے خطر چلے آؤ اس مضمون کا عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان میں کسی چیز کا بھی پردہ نہیں ہے اے حافظ تو خود ہی پردہ بنا ہوا ہے تو ہی درمیان سے ہٹ جا)

حقیقت میں سچ کہا ہے صاحبو! اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس دولت حُبِ خداوندی ضرور ہے بلکہ اہل تدقیق تو کہتے ہیں کہ کفار کو بھی خدا تعالےٰ سے محبت ہے کیونکہ قرآن شریف میں کفار کو محرومی دیدار کی دھمکی دی گئی ہے۔ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ؕ (قیامت کے روز وہ کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے) کہ ان کو خدا کا دیدار نصیب نہ ہوگا اور محرومی دیدار سے اُسی وقت دھمکی ہو سکتی ہے کہ جب ان کو خدا سے محبت ہو اور محرومی کی خبر سے ان کو تکلیف پہونچے اس کے علاوہ اس کا ایک بدیہی ثبوت بھی ہے کہ ہم لوگ اپنے خیال میں جس کو دین سمجھتے ہیں اگر کسی کو اس کے خلاف دیکھتے ہیں تو ہم کو اس پر کس قدر طیش آتا ہے کہ ہم اس کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں اور دل کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے آخر یہ نفرت اور وحشت کیوں ہے اس لئے کہ وہ طریق جس کو ہم دین سمجھتے ہیں ہمارا محبوب ہے کیونکہ وہ ہمارے خیال میں خدائی رستہ ہے جو کہ خدا نے ہم کو بتلایا ہے پس ہماری محبت کی ایسی مثال ہے جیسے کہ راکھ کے نیچے چنگاری دبی ہوتی ہے کہ اگر اس کو چھیڑا اور کریدا نہ جائے تو وہ نظر بھی نہیں آتی لیکن جب وہی چنگاری راکھ سے باہر نکلتی ہے تو شہر کے شہر جلا دینے

کے لئے کافی ہوتی ہے اور اگر کسی کو اب بھی شک رہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر براہ راست خدا سے محبت معلوم نہیں ہوتی تو اس شخص کو کسی سے تو محبت ہوگی۔ کم از کم اپنی جان سے تو ضرور اُس کو محبت ہوگی۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محبت کسی نہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے علم و فضل حسن صورت حسن سیرت اور تیسرا مقدمہ یہ ہے اور مسلّم ہے کہ ہر کمال ظل کمال خداوندی ہے تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہو واقع میں کمالِ خداوندی کا عاشق ہے اور یہی معنی ہیں محبت خدا کے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ دیکھی اور اس نور کی وجہ سے وہ دیوار کا عاشق ہوگیا اس صورت میں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شخص واقع میں دیوار کا عاشق نہیں آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا تھا یعنی نور اور وہ کمال واقع میں آفتاب کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے اور اس سے وہ نور زائل ہو جائے عشق بھی زائل ہو جاتا ہے اسی کو کہا ہے ؎

عشق با مردہ نہ باشد پائدار　　عشق را باحیّ دباقیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود
عاشقی بامُردگاں پائندہ نیست　　زانکہ مُردہ سوئ ما آیندہ نیست

(مرنے اور فنا ہونے والے کے ساتھ عشق و محبت مضبوط نہیں ہوتے عشق اس ذات کے ساتھ قائم کرجو زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ جو محبتیں رنگ و روپ کی وجہ سے ہوتی ہیں وہ عشق نہیں ہے اس کا انجام تو شرمندی ہے۔ مردوں کے ساتھ عشق کرنا قائم نہیں رہتا اس لئے کہ مرنے والا مرکر پھر ہماری طرف آنے والا نہیں ہے)

علیٰ ہذا جس چیز کا بھی جو کمال ہے وہ واقع میں کمالِ خداوندی کا ظل ہے خود اس کا ذاتی نہیں دیکھئے ہر چیز کمال کے ساتھ اگر ایک وقت متصف ہے تو دوسرے وقت اس سے خالی بھی ہے تو اس خلو کی یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک وہ کمال خدا تعالیٰ کی جانب سے عطا نہیں ہوا اسی طرح جب اس کے ساتھ اتصاف ہوتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ اُدھر سے فیضان ہوگیا اس لئے ایک بزرگ لکھتے ہیں ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

(تو نے اپنی خوبی کو خوبصورتوں کے چہرے سے ظاہر کر دیا ہے مگر تو عاشقوں کی نظروں میں تماشا بن گیا ہے)

اس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ خدا کو حسینوں کے ساتھ اتحاد ذاتی ہے یا اس نے ان میں حلول کیا ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو ایمان کے بالکل خلاف ہے اور کفر ہے کوئی عامی بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا اگر ذرا سمجھ سے کام لے چہ جائیکہ کسی صاحب دل کے کلام کے یہ معنے ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اُس ذات مستجمع الصفات کے مظہر ہیں اور اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل کی اس موقع پر ضرورت نہیں یہ فن کا مستقل مسئلہ ہے غرض جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ عشق کمال سے ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہر کمال واقع میں کمالِ خداوندی ہے اگرچہ وہ دوسرے کے اندر نظر آئے تو یہ بات بلا شک ثابت ہو گئی کہ ہر عاشق خدا کا عاشق ہے اس کے معلوم کر لینے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت اور وقعت ہوتی ہے کیا اگر کسی عاشق کو اس کا معشوق حکم کرے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے چلچلاتے ہوئے دوپہر میں چار کوس تک برہنہ پا جلتے ہوئے ریت پر چلنے کا حکم کرے تو وہ عاشق انکار کرے گا یا اُس سے اِس حکم کے مصالح پوچھے گا۔ ہرگز نہیں اور اگر کوئی مدعی عشق اپنے معشوق کے حکم پر لِمَ اور کَیفَ کرے تو کیا اس کو اس دعوے میں سچا کہا جائے گا کبھی نہیں ظاہر ہے کہ اگر اس کو سچا عشق ہو گا تو اُس کے بلانے پر دوڑا ہوا آئیگا بلکہ اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہیں رُکے گا۔ اور کہے گا کہ مجھ میں امتثال کی وہ حرارت بھری ہے کہ یہ روک اس کے سامنے کچھ بھی نہیں غرض کسی قسم کے کسی امر و نہی میں اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہو گا لوگ اُس کی حرکات پر اس کو دیوانہ بتلائیں گے پاگل کہیں گے مگر اس کو ان خطابوں سے ذرا عار نہ ہوگی بلکہ وہ نہایت خوش ہو گا اور کہے گا کہ ؎

ما اگر قلاشں وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر غریب و مفلس یا اگر دیوانہ ہیں تو کیا ہوا ہم تو اس ساقی اور اس حقیقی پیالے کے مست

وعاشق ہیں)

جس طرح آجکل کے عقلاء علماء دین کو نیم وحشی وغیرہ وغیرہ خطاب دیتے ہیں لیکن وہ نہایت مسرور ہیں اس واسطے کہ ان کا یہ مذہب ہے کہ ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ وھوالاحبۃ منہ فی سودائہ

کہ ملامت گر کی ملامت تو قلب کے باہر ہے اس کے گرد اگرد چکر اکر رہ گئی ہے اور محبت سویدائے قلب تک پہنچ کر جاگزیں ہو چکی ہے الحاصل جب معلوم ہوا کہ عاشق کو معشوق کے ساتھ یہ برتاؤ چاہیئے اور ہم خدا کے عاشق ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو ہم کو بھی اس کے ساتھ یہی برتاؤ رکھنا چاہیئے اور اس کے احکام کے امتثال میں بے چون وچرا گردن جھکا دینی چاہیئے مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالبعلمی کہ چون وچرا نکند و ہر درویشے کہ چون وچرا کند ہر دو را در چراگاہ باید فرست (جو طالب علم استاد سے پوچھ پوچھ کر اپنی معلومات نہ بڑھائے اور جو درویش اپنے پیر سے جھک جھک کرے دونوں اس قابل ہیں کہ ان کو جنگل کی طرف بھگا دیا جائے)

وجہ یہ ہے کہ طالب علم اور تعلم کے وقت طلب فن میں ہے اور حصول فن کے لئے لازمی ہے کہ سوالات کرے اور قیل وقال سے مسئلے کی تہ تک پہنچے اور سالک سلوک کرتے وقت عمل میں مشغول رہے اُس کے لئے جرح وقدح موجب حرمان اور سبب ہلاکت ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک حکیم کے مطب میں کچھ مریض بھی علاج کرانے کو آئیں اور کچھ لوگ طلب فن کے لئے درسیاتِ طب پڑھنے بھی آئیں پس اگر ان طالبین فن میں سے کوئی شخص درس کے وقت بالکل خاموش بیٹھا رہے اور کسی قسم کا سوال نہ کرے تو وہ طبیب اس کو نالائق کہکر درس سے اٹھا دے گا لیکن اگر کوئی مریض نسخہ لکھواتے وقت کسی قسم کی چون وچرا کرے اور ادویہ یا ان کے اوزان کی حکمت دریافت کرنے لگے تو اس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوگا۔ غرض طالب علم کا گڑبڑ کرنا اور حکمت ومصلحت دریافت کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع نہیں اور عوام کا چون وچرا کرنا بُرا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع ہے۔ لیکن یہ مرض کچھ ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص احکام کی حکمتیں دریافت کرنے کے درپے ہے

اور اپنے کو حکمتیں سمجھ لینے کے قابل سمجھتا ہے۔ ایک شخص نے جو کہ پٹواری گری کرتے تھے میرے پاس ایک مسئلہ فرائض کا بھیجا۔ صورت مسئلہ یہ تھی کہ ایک شخص مرا اور اس نے ایک بھتیجا اور ایک بھتیجی چھوڑی۔ میں نے جواب دیا کہ بھتیجے کو حصہ پہونچے گا اور بھتیجی محروم ہو گی۔ کہنے لگے کہ آخر اس کی کیا وجہ بھتیجی بھی تو اس بھتیجے کی بہن ہی ہے اس کو کیوں نہیں ملے گا۔ میں نے کہا کہ جناب آپ پٹواری گری کرتے ہیں اس کو چھوڑیئے اور آکر درسیات شروع کیجئے۔ تین چار برس تک عربی کی کتابیں پڑھئے اس کے بعد پھر دریافت کیجئے تو بتلا دیں گے۔ راز اس میں وہی ہے طالب علم طالب فن ہوتا ہے اور عوام محض عمل کے لئے مسئلہ دریافت کرتے ہیں ان کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ حکم مسئلہ کا معلوم ہو جائے بس۔ دوسرے ایک راز اس میں یہ بھی ہے کہ طالب علم کو یہ تمیز ہوتی ہے کہ کونسی بات دریافت کرنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں اس لئے وہ جو کچھ دریافت کرتا ہے سمجھ بوجھ کر کام کی بات پوچھتا ہے۔ برخلاف عوام کے کہ ان کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی۔ میں نے بطور نظیر کے ان سے یہ پوچھا کہ اول یہ بتلایئے کہ آپ کی ناک چہرے پر کیوں لگائی گئی کمر پر کیوں نہیں لگائی گئی جب اس ترتیب کے وجوہ اور مصالح سب آپ کو معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اوقات نماز کی تعیین کے مصالح دریافت کیجئے گا غرض جس کو فن سے مناسبت نہیں ہوتی اس کا بولنا ہمیشہ بے موقع ہوتا ہے اور اس لئے وہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ایک مرتبہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے کچھ بیان فرما رہے تھے اور لوگ لکھ رہے تھے اور پوچھ بھی رہے تھے ان ہی میں ایک شخص بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی تم بھی کچھ پوچھو۔ عرض کیا۔ پوچھوں گا۔ بیان میں آپ نے فرمایا کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار میں دیر نہ کرے۔ اس شخص نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ بولوں۔ امام صاحب نے فرمایا کہو۔ تو کہتا ہے کہ اگر کسی روز آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کریں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تمہارا خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔

اسی طرح مشہور ہے کہ ایک دلہن بالکل بولتی ہی نہ تھی اس کی ساس نے اس سے کہا دلہن تم بھی بولا کرو تم خاموش کیوں رہتی ہو دلہن نے کہا کہ بہت اچھا اب بولوں گی۔ چنانچہ

ایک روز بولی۔ ساس کو خطاب کر کے کہنے لگی کہ اماں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر تمہارا لڑکا مرگیا تو میرا نکاح کسی دوسرے سے بھی کر دو گی۔ ساس نے کہا کہ دلہن بس تم خاموش ہی رہا کرو تمہارے لئے وہی بہتر ہے۔ تو دیکھئے تمیز نہ ہونے کی وجہ سے بات بھی پوچھی تو کیسی خوبصورت کہ ساس کا کلیجہ ہی ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کی برابر ہوتے ہیں تو جس شخص کو اقلیدس سے مناسبت نہ ہو اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکتا کہ کیونکر تین زاویے دو قائموں کی برابر ہوں گے اگرچہ اس کو سمجھانے کے لئے کوئی اقلیدس ثانی ہی پیدا ہو ہاں اگر اس کو سمجھنے کا شوق ہے تو اول اقلیدس حاصل کرے اس کے بعد نہایت آسانی سے یہ مسئلہ اس کو حل ہو جائے گا کیونکہ وہ علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ سے واقف ہو گا بلکہ جب اقلیدس سے مناسبت ہو جائے گی تو اپنے اس پہلے سوال پر ہنسے گا اور کہے گا کہ واقعی میرا سوال قبل از وقت تھا میں اس سے بھی زیادہ واضح مثال دیتا ہوں اگرچہ وہ ایک گونہ فحش مثال ہے لیکن اس سے یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ قبل از وقت کوئی چیز سمجھ میں نہیں آسکتی فرض کرو کہ ایک بہت بڑا ماہر حکیم ایک چار برس کے بچے کو جماع کی لذت اور اس کا طریقہ سمجھانا چاہے یہ ممکن ہے کہ وہ بچہ آرے اور بلے کہدے لیکن اس کی حقیقت کبھی اس کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ البتہ وہی بچہ جب تھوڑے دن کے بعد جوان ہوگا اور سن بلوغ کو پہونچے گا تو بغیر کسی کی تعلیم کے خود بخود لذت جماع کی حقیقت ذوقی کے طور پر اس کو معلوم ہو جائے گی اور اگر خود نہ بھی معلوم ہوئے تو تھوڑا سا اشارہ کافی ہوگا لیکن طالب علم بھی اگر کسی وقت طلب علم میں ہو تو اس وقت اس کو بھی مناسب نہیں کہ اس علم کی حکمتیں دریافت کرے مثلاً ایک طالب علم کو نماز میں کوئی شبہ ہوا اور اس نے کسی عالم سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو اس وقت اس کو مناسب نہیں کہ اس عالم کے جواب میں چون و چرا کرے اور علل دریافت کرنے کے درپے ہو بلکہ اس وقت سن کر تسلیم کرے اور اسرار کے دریافت کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھے اور اگر اس وقت دریافت کرے گا تو مجیب اگر حکیم ہے تو بھی اس کو جواب نہ دے گا اور اگر نرا خلیق ہے تو جواب کے لئے تیار ہو جائیگا۔ چنانچہ اس وقت عوام کے اخلاق کو زیادہ تر علماء کے اخلاق ہی نے خراب کیا ہے کہ اکثر علماء کو

اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جواب سائل کے مذاق کے موافق ہو ادھر علماء کی یہ شفقت ادھر سائلین کا یہ جہل کہ ان کو یہ خبر نہیں کہ کون سی بات ضابطے کی رو سے ہم کو پوچھنی چاہئے اور کون سی بات میں بلغیر لِمَ اور کیف کے سر تسلیم جھکا دینا چاہیئے غرض دونوں کی بدولت عوام تباہ ہوئے۔

صاحبو! شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہونا چاہیئے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک کا مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے اس نے کہا کہ جو آپ مقرر کریں پھر آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے غلام نے کہا جو آپ کھلائیں اسی طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ پہنائیں وہی لباس ہے۔ تو صاحبو! کیا خدا سے جو علاقہ ہمارا ہے وہ غلامی نہیں ہے بلکہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کو حقیقی غلامی حاصل ہے دیکھو انسانی غلامی سے انسان ایک وقت میں نکل بھی سکتا ہے یعنی جبکہ آقا غلام کو آزاد کردے برخلاف ہماری غلامی کے کہ یہ طوق ہماری گردن سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی یہی صورت ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے اور یہ غیر ممکن تو ہماری آزادی بھی غیر ممکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری آزادی محال عقلی ہے اور ہم ہمیشہ کے لئے غلام ہیں تو ہم کو غلام ہی کا برتاؤ بھی کرنا چاہیئے اور کسی حکم کے امتثال میں گرانی نہ ہونی چاہیئے اور میں کہتا ہوں کہ احکام کے دشوار معلوم ہونے سے ان میں کسی قسم کا شبہ کرنا تو بالکل ہی لغو ہے کیونکہ احکام کا نفس پر گراں گذرنا یہی تو دلیل ہے اس حکم کے خداوندی حکم ہونے کی کیونکہ جو حکم نفس کے موافق ہو اس کو تو نفس خود ہی اپنے لئے تجویز کر لیتا ہے اس میں کسی دوسرے کے حکم کرنے کی کیا ضرورت تو خدا کی جانب سے تو وہی احکام مقرر ہوں گے جو کہ نفس پر بار ہوں تا کہ خدا تعالیٰ دیکھیں کہ جو کچھ کرتے ہو اس سے اپنے نفس کا خوش کرنا منظور ہے یا خدا کا اور اس خوش کرنے میں بھی ہماری ہی مصلحت ہے نہ کہ خدا کی ؎

من نہ کردم خلق تا سُودے کنم   بلکہ تا بر بندگاں جُودے کُنم

(میں نے مخلوق کو اپنے نفع کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ اپنے بندوں پر سخاوت کروں)

اتنا وسیع نظام عالم ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے اور ہمیں کو نفع پہنچانا مقصود ہے اور ہر ہر طرح ہماری ہی مصلحتوں پر نظر ہے البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہماری مصالح حال کی بھی جن کو ہم نے اختراع کر کے مصلحت کا لقب دیا ہے ان احکام میں رعایت ہو لہٰذا ہم کو بھی یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الحال ہماری کیا مصلحت ہے بلکہ اگر مصالح حال پر نظر ہوتی تو احکام بتلانے کی ہی کیا ضرورت تھی جب ہم نے مصالح کو اختراع کیا تھا ان کے مناسب تجاویز بھی خود ہی سوچ سکتے تھے۔ غرض احکام کی سختی وسوسہ کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سختی ہی ان احکام کے من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ دیکھئے جب بچہ کا دودھ چھڑاتے ہیں تو کیسی کچھ مصیبت ہوتی ہے کتنی تکلیف بچہ کو پہونچتی ہے اور وہ دودھ پینے کے لئے کیا کچھ ضد کیا کرتا ہے لیکن اس کی ایک نہیں سنی جاتی بلکہ کبھی ایلوا لگا کر کبھی کسی دوسری تدبیر سے اس کو دودھ پینے سے روکا جاتا ہے وجہ یہی ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے سے زیادہ اس کی مصلحتوں کو جانتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت اس کی مرضی کے موافق کیا گیا تو جوان ہو کر تباہ ہوگا اور ساری عمر اسی بلا میں مبتلا رہے گا۔ بعینہٖ یہی حالت انسان کے نفس کی ہے ارشاد ہے لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ کہ اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان سب خراب اور برباد ہو جائیں۔ پس ہمارے لئے یہی شفقت ہے کہ ہماری ایک نہ سنی جائے جس طرح بچے کی رائے کو نہیں سنا جاتا اور محض اس وجہ سے کہ جوان ہو کر جو اجزائے بدن حرارت سے تحلیل ہوتے ہیں ان کے لئے صرف دودھ بدل ما یتحلل نہیں ہو سکتا بچے کی ضد کو مسترد کر دیا جاتا ہے حالانکہ بچے اور اس کے ماں باپ کا علم باوجود متفاوت ہونے کے پھر بھی کسی درجے میں متقارب ہے کیونکہ دونوں متناہی ہیں اور متناہیین کا تقارب ظاہر ہی ہے۔ برخلاف بندے کے علم اور خدا کے علم کے دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کے علم کو بھی خدا کے علم سے کوئی تناسب نہیں ہے کیونکہ مجموعہ کائنات کا علم کیسا کچھ بھی ہو پھر بھی متناہی تو ضرور ہوگا برخلاف علم خداوندی کے کہ وہ غیر متناہی ہے، خوب کہا ہے ؎

اگر آفتا بست یک ذرہ ایست ۔۔۔ دگر ہفت دریاست یک قطرہ ایست

چو سلطانِ عزت علم برکشد		جہاں سر بجیبِ عدم درکشد

(اگر وہ آفتاب ہے تو تو اس کے مقابلہ ذرہ کے جیسا ہے اگر وہ سات دریا کے برابر ہے تو تو ایک قطرہ کے برابر ہے۔ جب بادشاہ اپنی عزت کا جھنڈا بلند کرتا ہے تو ساری دنیا عدم کے گریبان میں سر چھپا لیتی ہے)

اور یہی وہ کیفیت ہے جس کو اہلِ فن نے وحدۃ الوجود کہا ہے وحدۃ الوجود کے جو معنے عوام میں مشہور ہیں کہ میں بھی خدا اور تو بھی خدا اور دیوار بھی خدا یہ معنے بالکل غلط ہیں اور بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی بالکل ہی موجود نہیں یہ بھی بالکل غلط ہے اور قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (اللہ تعالیٰ ہر چیز کے پیدا کرنے والے ہیں اور وہی ہر چیز کے ذمہ دار ہیں) حقیقت میں یہ حالی مسئلہ ہے قالی نہیں وہ حال یہ ہے کہ جب خدا تعالےٰ کی ذات پیش نظر ہوتی ہے اس وقت دوسروں کا اور اپنا وجود کالعدم معلوم ہوتا ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص اگر کسی خیال میں منہمک ہو تو اس کو دوسری تمام چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا اگر کوئی اس کو آواز دیتا ہے تو وہ نہیں سنتا بلکہ بعض اوقات خاص خیالوں میں اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی سر کے پاس آکر آواز دے تو مطلق خبر نہیں ہوتی اس کیفیت میں وہ شخص محاورے میں مجازاً کہہ سکتا ہے کہ لاموجود الا الامر الفلانی لیکن ظاہر ہے کہ یہ کہنا واقع کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے ہے اسی طرح وحدۃ الوجود بھی ایک اصطلاح ہے صوفیہ کی کہ وہ اپنی اس قسم کی کیفیت کو وحدۃ الوجود کے عنوان سے مجازاً تعبیر کرتے ہیں جس طرح قرآن و حدیث کے محاورات میں مجاز کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح اصطلاح تصوف میں بھی کیونکہ وہ بھی قرآن و حدیث ہی سے مستنبط ہے تو خلاصہ وحدۃ الوجود کا یہ نکلا کہ یہ وجودات متکثرہ گویا کہ نہیں ہیں پس حکم وحدۃ مجازاً ہوا اسی کو ان اشعار میں حل کیا ہے ؎

اگر آفتابست یک ذرہ نیست		دگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

چو سلطانِ عزت علم برکشد		جہاں سر بجیبِ عدم درکشد

بلکہ ان اشعار ہی میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ موجودات کچھ ہیں ضرور، کیونکہ آفتاب اور دریا کے ساتھ است کا حکم لگایا گیا ہے باقی آگے جو کہا ہے کہ "جہاں سر بجیب عدم در کشد" اس سے بھی یہی مراد ہے کہ اس کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ صاف عنوان سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید خجل شد چو پہنائے دریا بدید

کہ ایک قطرہ ابر سے اناکنا ادکنا کہتا چلا مگر دریا کی وسعت دیکھ کر شرمندہ ہو گیا اور باوجودیکہ اپنے اندر نورانیت اور شفافی سب کچھ پاتا تھا لیکن کہتا ہے ؎

کہ جائیکہ او ہست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

(کہ جس جگہ وہ موجود ہے میں کون ہوتا ہوں درحقیقت اگر وہ ہے تو میں قابل شمار نہیں ہوتا)

اس کے بعد شیخ نتیجہ نکالتے ہیں کہتے ہیں کہ ؎

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند کہ با ہستیش نام ہستی برند

کہ اگرچہ سب موجود ہیں لیکن ذاتِ باری کے سامنے سب کی ہستی ہیچ ہے زیادہ وضوح کے لئے۔ اس کو ایک اور مثال میں سمجھو مثلاً کسی گاؤں میں جہاں سب جاہل ہوں ایک شخص قل ہو اللہ کا حافظ ہو اور تمام گاؤں کے لوگ اس کو حافظ کہتے ہوں، اتفاق سے اسی گاؤں میں کوئی ماہر قاری آجائے جس کو علاوہ حفظ قرآن شریف و مشق سبعہ میں بھی مہارت ہو اور اس قاری کے سامنے کوئی شخص اس قل ہو اللہ کے حافظ کو حافظ صاحب کہکر پکارے تو اندازہ کیجئے کہ اس کی کیا حالت ہو گی شرم سے گڑ جائے گا اور اپنے کو اس قاری کے سامنے ہیچ تصور کرے گا۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے ہر شخص کے تمام دعاوی انانیت اس وقت تک ہیں کہ جب تک اپنے اوپر نظر ہے جس وقت کسی اپنے سے بڑے پر نظر پڑے اس وقت معلوم ہو کہ ہمارے کمالات کیا وقعت رکھتے ہیں ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چودھری اپنے بیٹے کے ساتھ چلا جارہا تھا، رستہ میں بادشاہ کا لشکر پڑا دیکھا اس کی صولت اور حشمت دیکھ کر ڈر گیا اور آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی لڑکے نے کہا ابا آپ کیوں ڈرتے ہیں اگر بادشاہ ہے تو کیا ہوا، آپ بھی تو اپنے گاؤں کے چودھری

ہیں چودھری نے جواب دیا کہ بھائی میں اگرچہ چودھری ہوں لیکن میری حکومت صرف اسی قطعۂ گاؤں تک ہے اور وہ بھی جب کہ مجھ سے کوئی بڑا وہاں موجود نہ ہو یہ بادشاہ ہے اس کی حکومت سارے ملک پر ہے میں اس کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں اس پر شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

تو اے غافل از حق چناں در دہی کہ برخویشتن منصبے مے نہی

(غافل تو حق تعالیٰ سے اسی طرح معاملہ کررہا ہے کہ تونے اپنے لئے بھی ایک خاص درجہ مقرر کر رکھا ہے)

تحصیلدار اسی وقت تک تحصیلدار ہے کہ گورنر کے سامنے نہ ہو لیکن اس کے سامنے آنے کے بعد اس کی تحصیلداری ہیچ ہے اگر گورنر کے سامنے کوئی اس کو حضور کہدے تو عرق عرق ہو جائیگا بس یہی حالت وحدۃ الوجود کی ہے۔ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ جس وقت حضور خداوندی ہوتا ہے اپنی تعظیم سے بلکہ اپنے کو موجود کہنے سے شرم آتی ہے اور جس قدر حضور خداوندی میں ترقی ہوگی اس کیفیت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سے زیادہ اعلم باللہ ہیں بلکہ آپ کا ارشاد ہے اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ (میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں) آپ کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے کہ باوجود سردار عالم ہونے کے کس قدر سادگی آپ کے ہر ہر انداز میں تھی بیٹھنے میں کبھی آپ نے کوئی ممتاز جگہ نہیں بنائی حتیٰ کہ لوگ جب زیارت کو آتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کرتے مَنْ مُحَمَّدٌ فِیْكُمْ (تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم جواب دیتے کہ هٰذَا الْاَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ یہ جو گورے گورے سہارا لگائے بیٹھے ہیں اور سہارا لگانے کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔ عربی محاورہ میں ہاتھ پر سہارا لگا لینے کو بھی اتّکا کہا جاتا ہے یہ ضروری نہیں کہ تکیہ وغیرہ ہی ہو چلنے میں یہ حالت تھی کہ ہمیشہ ہلے جلے چلتے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ باوجودیکہ آپ کی شان یہ ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر بات یہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذات باری کی عظمت ہمیشہ پیش نظر تھی۔ غرض آپکے کسی انداز سے بھی امتیاز اور بڑائی کی شان نمایاں نہیں ہوتی اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو مدینے کے لوگ حضور صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کو پہچان نہیں سکے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کرتے تھے کیونکہ ان کے کچھ بال پک گئے تھے جس کی وجہ سے وہ سب سے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ادب دیکھئے کہ برابر خود ہی مصافحہ کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہیں ہونے دی اسی طرح دوسرے صحابہ بھی خاموش دم بخود بیٹھے رہے کیونکہ سب حکیم تھے اگر آجکل کوئی شیخ مجلس کے سوا کسی غلطی سے کسی دوسرے سے مصافحہ کرلے تو جملہ حاضرین غل مچانا شروع کردیں اور جس سے مصافحہ کرلیا ہے اس کی تو ایسی بری گت بنے کہ الامان حتیٰ کہ جب دھوپ آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک پر شعاعیں پڑنے لگیں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کپڑا تان کر کھڑے ہوگئے اس وقت حاضرین نے پہچانا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے اِنِّیْ اٰکُلُ کَمَا یَاْکُلُ الْعَبْدُ کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکڑو بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ صاحبو! یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں اس کی قدر اس وقت ہوگی کہ جب اپنے اوپر یہ کیفیت غالب ہو اور یہی راز ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کھاتا کھاتے میں کوئی لقمہ گر جائے تو مٹی صاف کرکے کھالو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا جلدی جلدی تناول فرمایا کرتے آج اس کو سخت عیب سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح کھاتا ہے کہ گویا کبھی اس کو کھانے کو نہیں ملا۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر تھی ہم اس سے محروم ہیں۔ صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی والی ملک کسی معمولی سے آدمی کو بلاکر حلوا کھانے کو دے اور کہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ تو ذرا غور کیجئے کہ یہ شخص کس طرح کھائے گا ظاہر ہے کہ اس کے ہر لقمہ کا انداز یہ ہوگا کہ اس سے معلوم ہوجائے کہ بڑی رغبت اور شوق سے کھا رہا ہے اور یہی انداز اس وقت محبوب ہے اس کو طمع کہنا ہرگز درست نہیں اور اگر فرض کردیہ طمع ہی ہے تو سمجھ لو کہ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں ‏ ‏ ‏ خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(جب دین کا بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں کمی نہ کروں تو اس کے بعد پھر میرا قناعت کو اچھا سمجھنے اور نہ مانگنے پر افسوس ہے)

ع ہر عیب کہ سلطاں بہ پسند د ہنر است (جس کسی عیب کو بادشاہ پسند کر لیتا ہے وہ ہنر بن جاتا ہے)
اور اگر کھاتے ہوئے اتفاق سے کوئی لقمہ اس کے ہاتھ سے گر جائے تو یہ کیا کرے گا ظاہر ہے
کہ اس کو اٹھائے گا اور صاف کر کے کھا جائے گا۔ علیٰ ہذا یہ بھی سوچو کہ بادشاہ کے سامنے کس
انداز سے بیٹھ کر کھائے گا کیا اسی طرح جیسے اپنے گھر میں بیٹھ کر کھاتا تھا، کبھی نہیں بلکہ نہایت
ادب سے بیٹھ کر کھائے گا تو جب شاہانِ دنیا کے سامنے ان تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے تو کیا
خداوند جل وعلا کے سامنے ضروری نہیں۔ آجکل کی تہذیب نری لفاظی رہ گئی ہے جس میں
اصل حقیقت کا نام ونشان بھی نہیں ہے بہتر ہے کہ اس میں ہ کی جگہ عین بدل دیا جائے کہ اسم
بھی مسمیٰ کے مطابق پڑے۔ اور صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانے کے آداب کی تعلیم جو
فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح باطنی حالات کا اثر ظاہری اعضا پر پڑتا ہے یوں ہی ظاہری
ہیئت کا اثر بھی انسان کی اندرونی حالت تک پہنچتا ہے۔ اگر ظاہری ہیئت پر رعونت و
تکبر برستا ہے تو دل تک بھی اس کا چھینٹا ضرور پہونچے گا اور یہ ملکہ بددل میں ضرور پیدا
ہونا شروع گا۔ اور اگر ظاہری حالت منکسرانہ ہے تو دل میں بھی انکسار وخشوع وتذلل کے
آثار نمایاں ہوں گے اور سبب اس کا یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے ظاہر کو اتباع سنت
سے آراستہ کیا اور راہِ سنت پر گامزن ہوا تو اس نے کسی قدر قرب کا قصد کیا اور وعدہ ہے کہ
مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ
بَاعًا۔ کہ جو میری طرف تھوڑا سا بھی بڑھتا ہے میں اس کی طرف بہت سا بڑھتا جاتا ہوں۔
اور ظاہر ہے کہ خدا کا قرب اس سے زیادہ ہوگا کہ قرب باطنی میسر ہو جائے تو لازم آگیا کہ درستی
ظاہر سے قرب باطنی نصیب ہوتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(اگرچہ عام طور پر دنیا میں پیاسے ہی پانی کو تلاش کرتے ہیں مگر کبھی پانی بھی اس
دنیا میں پیاسوں کو ڈھونڈا کرتا ہے)

یہ وہ پانی ہے کہ پیاسے کے ڈھونڈھے نہیں ملتا بلکہ وہ خود پیاسے تک پہنچتا ہے
یہ شرط ہے کہ پیاس ہو ورنہ خدا پر بار نہیں ہے کہ وہ خوامخواہ لوگوں کے سر منڈھیں ارشاد ہے

اَنُلۡزِمُکُمُوۡهَا وَ اَنۡتُمۡ لَهَا کٰرِهُوۡنَ ۔ یعنی کیا ہم رحمت کو تمہارے سر مڑھ دیں باوجودیکہ تمہارے دلوں میں اس سے کراہت ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو اس قدر خشوع وخضوع بڑھا ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ذاتِ خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر وقت پیشِ نظر تھی اور جب یہ ہے تو ہم کو بھی احکام سُن کر بس یہی چاہیئے کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علت از کارِ تو

(تیری یاد سے زبان کو تر و تازہ رکھنا چاہیئے اور کوئی عذر تیری اطاعت سے مجھے روک نہیں سکتی)

اور قطع نظر اس کے کہ یہ مقتضاء عبدیت کا ہے ہمارے لئے مصلحت عقلاً بھی یہی ہے اور واقعی اگر یہ کاوش ہمارے لئے مضر نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو اجازت دیتے ممانعت نہ فرماتے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ممانعت فرمائی۔

دیکھئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور جن کی فطرتیں بالکل سلیم تھیں جب ان حضرات نے مسئلہ قدر میں گفتگو کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل روک دیا اور بہت خفا ہوئے اور فرمایا اگلی قومیں اسی کھود کرید کی بدولت ہلاک ہوئیں اور مضر ہونے کا سبب یہ ہے کہ جس طرح بہت سے امور استدلال سے حل ہوتے ہیں اسی طرح بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں کہ ان میں استدلال کا گذر نہیں اُن کے لئے مشاہدہ اور معاینہ کی ضرورت ہے اور وہ ہم کو نصیب نہیں تو ایسی باتوں میں لِم وکیف دریافت کرنے کا بدیہی یہ نتیجہ ہے کہ ہم تباہ ہوں اور خسر الدنیا والآخرۃ ہماری حالت ہو۔ مجھے اس کی مناسب ایک حکایت یاد آئی مشہور ہے کہ ایک لڑکے نے اپنے نابینا استاد کی دعوت کی اور کہا کہ میں آپ کو کھیر کھلاؤں گا۔ استاد صاحب نے چونکہ کھیر کو نہ کبھی دیکھا تھا نہ ابھی تک کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس لئے لڑکے سے پوچھا کہ بھائی کھیر کیسی ہوتی ہے لڑکے نے جواب دیا کہ کھیر سفید ہوتی ہے استاد نے کہا کہ سفید کس کو کہتے ہیں اس نے کہا جیسے بگلہ مگر استاد صاحب نے کبھی بگلہ بھی نہ دیکھا تھا اِس لئے اُس کی بابت بھی پوچھا اس نے ہاتھ سے بگلہ کی ہیئت بتائی استاد صاحب نے ہاتھ سے مس کر کے دیکھا تو فرمانے لگے کہ بھائی

یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے کیسے کھاؤں گا۔ تو جیسے اس نابینا کے سمجھنے کی غلطی کی وجہ یہی تھی کہ معاینہ کی چیز کو بیان سے سمجھنا چاہتا تھا یہی حالت ہماری بھی ہے۔

ہاں اگر سمجھنا ہو تو اول قلب میں نور پیدا کرو خود بخود یہ کیفیات پیدا ہوں گی اور ہر چیز کی سینکڑوں حکمتیں نظر آنے لگیں گی۔ دیکھو اگر کوئی معمولی شخص کسی والی ملک سے کہے کہ مجھے اپنے خزانہ کے جواہرات دکھا دو تو اس کی سخت غلطی ہے اور کبھی یہ شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔ البتہ کامیابی کی یہ صورت ہے کہ پہلے صاحب جواہرات سے ایک خاص تعلق پیدا کرے اور اس کے خواص میں داخل ہو جائے اس کے بعد بغیر درخواست ہی کبھی وہ مہربان ہوگا تو خود دکھلا دے گا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاءؑ بے کتاب و بے معید داد ستا
علم چوں بر تن زنی مارے بود علم چوں بر دل زنی یارے بود

(تو اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم کو بغیر کتاب کے اور مددگار کے اور بغیر استاد کے دیکھے گا۔ تو علوم سے اگر نفس کی موافقت میں کام لے تو وہ سانپ کے جیسا بن جاتا ہے اور جب تو علم کو روحانیت پر چلائیگا وہ تیرا دوست بن جائیگا)

تو دل پر مؤثر بناؤ اس کے بعد دیکھو کن علوم کا انکشاف ہوتا ہے۔ اب لوگ چاہتے ہیں کہ ساری باتیں استاد کے سامنے بیٹھ کر حل کرلیں حالانکہ یہ محض فضل خداوندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی جبکہ خدا تعالیٰ چاہیں کہ فضل اسی خاص طریقے سے ہو کیونکہ کبھی کسی خاص شخص کے بارے میں یہی فضل ہوتا ہے کہ اس کو اسرار پہ مطلع کیا جائے جیسا کہ بعض کے لئے مطلع ہونا فضل ہوتا ہے اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو جو کچھ اسرار معلوم ہونے لگتے ہیں تو ان کو ناز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض بعض اپنے کو اکابر کی برابر سمجھنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اس لئے یہی مناسب ہے جب ہر ایک کے لئے مصلحت جدا ہے تو خود کچھ بھی تجویز نہ کرو ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں اور مزدوروں کی طرح مزدوری حاصل کرنے کے لئے عبادت مت کر کیونکہ جو مالک ہے وہ اپنے بندوں کی پرورش کے طریقوں سے خود واقف ہے)

اسی واسطے یہ مذہب ہے کہ بلا اختیار جو وارد بھی ہو اسی میں خوش رہے اور خود ہرگز کسی خاص وارد کی خواہش نہ کرے گویا یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ ؎

بدُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ انچہ ساقی ماریخت عین الطافست

(تجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ یہ صاف شراب ہے یا تیچھے کا میل کچیل ہے بس تو پی جا کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے ساقی کی طرف سے حاصل ہو رہا ہے وہ اس کی عین مہربانی ہے)

اگر دُرد پائیں تب بھی اسی ذوق سے پینا چاہیئے جس طرح مۓ صاف پی جاتی ہے کیونکہ اس میں بھی کوئی حکمت ضرور ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر خلافِ مصلحت بھی ملتا تب بھی ہم کو دَم مارنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم عبد ہیں ہم کو اس نیت کی بھی مجال نہیں کہ یہ ہمارے لئے مصلحت ہے۔ کیونکہ آخر ہم ہیں کیا چیز۔ کچھ بھی نہیں جو کچھ ملے جتنا ملے جس طرح ملے سب اُن کا احسان ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت لقمانؑ نے کسی شخص کے ہاں باغبانی کی نوکری کی ایک روز وہ باغ میں آیا اور ان سے کہا کہ ایک ککڑی لیکر آؤ آپ ایک ککڑی لائے آقا نے اس کو چھیل کر اس کی قاشیں کیں اور اول ایک قاش حضرت لقمانؑ کو دی آپ لے کر کھا گئے اس کے بعد جو آقا نے کھائی تو معلوم ہوا کہ بالکل کڑوی ہے اُس نے حضرت لقمانؑ سے کہا کہ تم نے یہ تلخ ککڑی کھالی کہا کیوں نہیں کہ یہ تلخ ہے حضرت لقمانؑ فرماتے ہیں کہ جس ہاتھ سے ہزاروں شیریں چیزیں کھائیں اگر ایک دفعہ تلخ بھی مل جائے تو شکایت نہیں کرنی چاہیئے ؎

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

(ایسی ذات جو تجھ پر ہر دم اپنا کرم کر رہی ہے اس کو قابلِ غور سمجھو اگر کسی وقت اس کی طرف سے کوئی تکلیف پہونچ جائے۔)

پس اگر کبھی ہماری مصلحت کے خلاف بھی اُدھر سے برتاؤ ہو تب بھی ہمارے ادب میں فرق نہ آنا چاہیئے۔ صاحبو! عاشق تو ہر حالت میں عاشق ہی رہتا ہے کیا لوگوں کے خیال میں خدا تعالیٰ سے برادری کا سا تعلق ہے کہ اس سے کاوش کی جائے۔ دیکھئے عشاق کو تو جان جان کر ستایا جاتا ہے مگر وہ یہی کہتا ہے ؎

ناخوشِ تو خوش بود برجانِ من　　دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

(تیری ناراضی بھی خوشی ہی رکھتی ہے کہ یار پر ہی دل فدا ہے اور کو میری ہی فکر ہے۔)

غرض جو شخص اپنی تربیت چاہتا ہے اور اس کو اسرارِ شریعت پر مطلع ہونے کی ہوس ہوتی ہے تو اپنے اندر یہ کیفیت پیدا کرے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب کیا ہم جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بن جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ صاحب آپ جنید بغدادی نہ بنیں لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ بالکل نکمے ہی رہیں۔ غور کیجئے آپ جنید بغدادی کی برابر تو کسی بات میں بھی نہیں مثلاً ایک نماز ہی ہے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں جنید بغدادیؒ کی برابر نماز پڑھتا ہوں۔ ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ ایک رات قیام کی نیت کی ہے تو نیت باندھ کر ساری رات کھڑے ہی گذار دی۔ ایک رات رکوع کے لئے تجویز کی ہے تو تمام رات رکوع ہی میں ختم ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ افسوس رات بہت جلد ختم ہو جاتی ہے دل نہیں بھرتا یہ حالت تھی کہ ؎

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو　　گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

پس جب کسی حالت میں بھی ہم ان کی برابر نہیں لیکن پھر بھی ہم کسی بات کو چھوڑ نہیں دیتے نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں مثل مشہور ہے کہ گندم اگر بہم نہ رسد جو غنیمت ست (اگر گیہوں نہ مل سکے تو جو ہی غنیمت ہے) تو جب ساری چیزیں ہم میں ادنیٰ درجہ کی ہیں تو یہ حالت بھی ادنے درجے کی سہی۔ اور اس کا طریق یہی ہے کہ کسی صاحب باطن سے تعلق پیدا کیا جائے اگر صحبت ممکن ہو تو بہت ہی خوش قسمتی کی بات ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم مراسلت تو ضرور رکھنی چاہیئے اور اُن پر اپنا پورا حال ظاہر کر کے علاج کی تدبیر دریافت کیجئے صاحبو! اگر اپنی رائے سے کوئی شخص اپنی اصلاح کی تدبیر سوچ کر چار گھنٹے اس میں مشغول رہنے کے لئے مقرر کرے تو اس میں وہ بات حاصل نہ ہو گی جو کسی ماہر کی تجویز پر نصف گھنٹہ عمل کرنے میں حاصل ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں بخار میں مبتلا ہوا ایک طبیب سے رجوع کیا انھوں نے نسخہ تجویز کر دیا جس کے

استعمال سے چند روز میں فائدہ ہوگیا۔ میں نے نسخہ کو مفید دیکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھا اتفاق سے دوسرے برس پھر کچھ شکایت ہوئی تو میں نے اسی نسخے کو منگا کر استعمال کیا لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اس کے آخر پھر اُسی طبیب سے رجوع کیا اور ان کے تجویز کردہ نسخے سے صحت ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اول حکیم صاحب کی زبان میں یا قلم میں کوئی خاص اثر رکھا ہوا تھا کہ صحت اس پر موقوف تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ نسخے کی تجویز میں جس طرح مریض کے مزاج کی رعایت کی جاتی ہے زمان اور مکان کی رعایت بھی کی جاتی ہے یعنی ایام ربیع میں ایک نسخہ تجویز کیا جاتا ہے تو ایام خریف میں دوسرا کیونکہ دونوں موسموں کے مزاج بالکل الگ الگ ہیں۔ اسی طرح سرد ملک میں جو دوا مفید ہوگی گرم ملک میں اس کا مفید ہونا ضروری نہیں۔ تو جیسے بدن کے امراض میں محض اپنی تدبیر اور رائے میں مرض کے زوال کے لئے کافی نہیں ہے یوں ہی نفسانی امراض میں بھی ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کی زبان میں بھی اثر ہے اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے کو جو کہتا ہوں کوئی شخص میری اس تقریر سے یہ نہ سمجھے کہ میں نوکری کرنے یا تجارت میں لگنے کو منع کرتا ہوں اور ترک تعلقات کی رائے دیتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی اہلِ دل سے وابستگی پیدا کیجئے۔ صاحبو! یہ حضرات نہایت ذی عقل ہوتے ہیں۔ ان کو دین کی عقل کے ساتھ دنیا کی بھی کامل عقل ہوتی ہے۔ ان کی نسبت یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ وہ اس وابستگی کے بعد تم کو تمہاری اہل وعیال سے چھڑا دیں گے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہٗ سے جب کوئی خادم عرض کرتا کہ حضور جی چاہتا ہے کہ ملازمت چھوڑ دوں تو فرماتے کہ بھائی ایسا نہ کیجیو نوکری بھی کرو اور خدا کی یاد میں بھی لگے رہو۔ اور وجہ اس ممانعت کی یہ تھی کہ جانتے تھے قلب میں قوتِ توکل ہے نہیں۔ ظاہری سہارے کو چھوڑ کر خدا جانے کن مصیبتوں میں پھنس جائے اور حالت کیا سے کیا ہو جائے اکثروں کو ایسے

واقعات پیش آئے کہ انھوں نے معاش کی وجہ سے نصرانیت یا یہودیت کو اختیار کیا بعض کی دل میں خدا کی شکایت پیدا ہوگئی۔ اور وہ یوں دین سے برباد ہوگئے۔ تو اگر نوکری پر لگے رہیں گے تو زیادہ سے زیادہ کسی معصیت ہی میں مبتلا ہوں گے کفر و شرک سے تو بچے رہیں گے۔ پس یہ حضرات چونکہ چہار طرف نظر رکھتے ہیں اس لئے بقاعدہ مَنِ ابْتُلِیَ بَلِیَّتَیْنِ فَلْیَخْتَرْ اَهْوَنَهُمَا (جو شخص دو مصیبتوں میں پھنس جائے ایک کو اختیار کرنا ضروری ہو تو اس مصیبت کو اختیار کرے جو آسان ہو) کبھی ضعفاء کو ترکِ تعلقات کی رائے نہیں دیتے اور جن لوگوں کو گوشہ نشینی اور ترک تعلقات کا حکم انھوں نے کیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن کو انھوں نے پورے طور سے جانچ لیا ہے اور دیکھ چکے ہیں کہ ان کی قوتِ توکل کامل ہے۔ ایسوں کے لئے نہ ترک تعلق کی ترغیب مضر نہ اس پر عمل کرنا نقصان دہ۔ تو اہل اللہ سے تعلق پیدا کرتے ہوئے اس کا بالکل خوف نہ کیجئے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کے قصدِ ترک پر بھی نہ چھوڑنے دیں گے۔ غرض یہ ہے کہ بڑی عقل سے اسرار کو دریافت کرنے کی فکر بے سود فکر ہے اس کی تمنا ہے تو خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرو۔ دیکھو تجربہ کاروں کا قول ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

کہ اول ہم نے عقل سے کام لیا وہ تھوڑی دور چلے مگر تھک کر رہ گئے۔ آخر اس کو چھوڑا اور دیوانگی اور عشق کا دامن پکڑا اس نے منتہا تک پہونچا دیا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقل بالکل بے کار ہے عقل کارآمد ضرور ہے۔ لیکن ایک حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے۔ عقل کی حالت گھوڑے کی سی ہے۔ دیکھو اگر کسی کا محبوب ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہو۔ اور یہ عاشق اس کے پاس پہونچنا چاہے اور

ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلے تو ظاہر ہے کہ گھوڑا دامنِ کوہ تک پہونچ کر عاجز ہو جائے گا۔ آگے جہاں سے پہاڑی زینہ شروع ہوا ہے وہاں گھوڑا نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ عاشق آگے بھی جانا چاہے تو اس کی کیا صورت ہے۔ بجز اس کے کہ "وزانجا ببالِ محبت پری" یعنی عشق کا جوش اپنے اندر پیدا کرے اور راہ طے کرتا چلا جائے۔ غرض عقل سے کام لینا چاہیئے لیکن صرف اس قدر کہ فلاں شخص مقتدا بنانے کے قابل ہے اور فلاں شخص نہیں۔ مریض کو عقل سے کام لینا ہے لیکن محض انتخاب معالج میں کیونکہ ایسا نہ کرے گا تو کثرتِ مدّعینِ طبابت سے وہی حالت ہوگی کہ

ع۔ شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا
(مختلف قسم کی تعبیروں کی وجہ سے میرا خواب ہی برباد ہوگیا)

مگر انتخاب کے بعد، پھر چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جس رستہ معالج ڈالدے اس پر بے خوف و خطر چلا جائے ورنہ اگر وہاں بھی ایں چون ست و آں چرا ست سے کام لیا تو ایک قدم بھی نہ سرک سکے گا اور صدہا الجھنیں پیش آئیں گی اس لئے کہ معمولی عقل کبھی ایک فتوے پر قائم نہیں رہ سکتی صبح کچھ رائے دیتی ہے شام کو کچھ دن کو کچھ رات کو کچھ۔ بعضوں کو دیکھا ہے کہ آج اہل سنّت و جماعت میں داخل ہیں کل تشیع پر مائل ہیں۔ صبح کو قدری ہیں شام نہیں ہو کہ جبری بن گئے۔ یہ انقلاب اور تبدیلیاں اِسی باعث ہیں کہ عقل ایک ٹھکانے نہیں رہنے دیتی دربدر خاک بسر پھراتی ہے۔ گویا اس کی یہ حالت ہے ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست
(میں تیری اس پرانی خدائی سے جو تو رکھتا ہے۔ بیزار ہوں میرے لئے روزانہ تازہ خدا ہونا چاہیئے)

ابن العربی کا ایک خط اپنی کشکول میں علّامہ بہاء الدین عاملی نے نقل کیا

ہے جو انھوں نے اپنے ایک معاصر عالم کو لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک روز بیٹھے رو رہے تھے۔ آپ کے کسی شاگرد نے وجہ پوچھی تو آپ نے وجہ بیان کی کہ میں اتنے سال سے ایک دعوے کو دلیل عقلی سے صحیح سمجھے ہوئے تھا آج ایک مقدمہ اس دلیل کا مخدوش معلوم ہوا تو میں اس لئے رو رہا ہوں کہ اتنے زمانے تک جہل میں مبتلا رہا اور اب بھی اطمینان نہیں کہ جواب ثابت ہوا وہ بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ تم نے اپنے علم ظاہری کی قوت دیکھی اب چاہیئے کہ دوسرا علم حاصل کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خلوت اور دوام ذکر اختیار کرو۔ بس اسی قسم کا مضمون لکھا ہے۔ امام رازی اتنے تبحّر کے بعد جب کہ ان کو کچھ حقیقت شناسی کا رائحہ نصیب ہوا اُس وقت یوں کہتے ہیں ؎

نهاية اقدام العقول عقالٌ وغاية سعي العٰلمين ضلال

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بحثنا طول عُمْرِنَا سوى ان جمعنا فيه قِيلَ يُقَالُ

(اور ہماری ساری عمر کی بحثا بحثی نے ہمیں اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہونچایا کہ ہم نے یہ باتیں لکھ کر جمع کرلی ہیں کہ یوں کہا گیا ہے اور یوں کہا جائے گا)

کہ ساری عمر کے مباحث اور علوم کا نتیجہ جو اخیر میں کھلا تو یہ تھا کہ قِیْلَ کَذَا اَوْ قَالَ فلان کذا (اس طرح کہا گیا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ انتخاب جو کیا جائے تو کس معیار پر کیا جائے کیونکہ آجکل عوام الناس نے عجیب وغریب معیار تراش رکھے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کا دربار نہایت عالی ہو لوگوں کی آمد ورفت اس کی طرف زیادہ ہو سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا بزرگ ہے خصوصاً اگر امراء اور رؤساء کی جماعت بھی ادھر مائل ہو تب تو گویا ان کی بزرگی پر رجسٹری ہوگئی۔ حالانکہ میں نے ایک نہایت کامل اور ماہر فن جامع شریعت و طریقت شیخ سے سُنا ہے فرماتے تھے کہ جس درویش

کے پاس زیادہ تر دنیا داروں کا ہجوم ہو اور علماء و صلحاء کا رجوع کم ہو تم ادھر متوجہ نہ ہو کیونکہ دنیا داروں کا گرنا اور دینداروں کا پرہیز اس درویش کے نقص کی دلیل ہے اس لئے کہ اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ (ہر چیز اپنی چیز کی طرف جاتی ہے) کبوتر با کبوتر باز با باز۔ تو وہ درویش بھی دنیا دار ہے۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک معیار بزرگی اس کے علاوہ ایک دوسرا امر ہے اور وہ اس سے ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکثر کم سمجھ لوگ یوں جانتے ہیں کہ جس شخص میں کشف وکرامات زیادہ ہو خوارق کا صدور اس سے زیادہ ہوتا ہو وہ سب سے بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ معیار بھی بالکل لغو ہے کیونکہ کشف و کرامت کا صدور کثرت ریاضت ومشاق وصحت قوائے جسمانی ونفسانی پر موقوف ہے جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں گی اُسے کشف ہونے لگے گا اگرچہ وہ کافر ہی ہو۔ ایسے واقعات بکثرت سننے میں آئے اور نہ بھی سنتے تب بھی یہ بات ظاہر تھی۔ دیکھو دجّال جو کہ مدّعیِ الوہیت ہوگا کیسے کیسے شعبدے اس سے ظہور پذیر ہوں گے۔ بارش تک کر کے دکھلا دے گا۔ زمین کے خزانے اس کے ہمراہ چلیں گے۔ پس ظاہر ہوا کہ خوارق کا صدور بھی صحیح معیار نہیں۔ اب صحیح معیار دریافت کرنے کے لئے اول یہ سمجھو کہ انسان کے لئے سب سے بڑا کمال اس کی وہ حالت ہے جس کے لئے اس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کشف و کرامت کے لئے انسان کو دنیا میں نہیں بھیجا گیا کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو دنیا میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی عالمِ ارواح میں اس پر بہت کچھ منکشف تھا نیز مرنے کے بعد کافر تک کو بہت سے مغیبات منکشف ہو جائیں گے ارشاد ہے وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَكُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن پر وہ وہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں جن کا ان کو گمان بھی نہ تھا) پس معلوم ہوا کہ دنیا میں اس کو کسی دوسری بات کے حاصل کرنے کو بھیجا گیا ہے اور وہ حالت عبدیت ہے یعنی دنیا میں انسان کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ امتثال اوامر ونواہی کر کے عبدیت

حاصل کرے کیونکہ جب تک اس عالم میں نہ آیا تھا تو محض روح تھا اور روح بوجہ مجرّد ہونے کے نہ قیام پر قادر تھی نہ قعود پر نہ رکوع پر نہ سجود پر تو روح کو اس عالم میں وہ ترقی کرنا جو ان عباداتِ خاصّہ پر موقوف ہے ممکن نہ تھا اور یہ صفت عبدیت بکمالہا اس میں پیدا نہ ہوتی۔ اور جب صفت عبدیت مطلوب ہے تو جس کو اس سے تعلق ہو وہ مطلوب ہوگا۔ اسی معیار کی نسبت مولانا روم علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست　　کارِ دُوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردوں کا کام یہ ہے کہ ان کی روشنی یعنی علم حقیقی اور گرمی یعنی محبت موجود ہو۔ اور کمینوں کا یہ کام ہے کہ ان میں بہانہ بازی اور بے شرمی ہو)

دو چیزیں اس شعر میں علامت کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ایک روشنی دوسرے گرمی۔ روشنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں سے بیٹھے ہوئے کلکتہ اور بمبئی نظر آنے لگے بلکہ یہ معنی ہیں کہ دل میں عرفان اور علم حقیقی پیدا ہوجاتے اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جس کو محبوبِ حقیقی سے محبت ہو اور معرفت حاصل ہو وہ مرد ہے۔ لیکن محبت قلبی صفات میں سے ہے جن کا احساس نہیں ہوسکتا اس لئے اس کے کچھ لوازم بیان کئے جاتے ہیں سب جانتے ہیں کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے ایک تو اس کی یاد کسی وقت دل سے نہیں اُترتی۔ سوتے ہوئے خواب بھی دیکھتا ہے تو محبوب ہی نظر آتا ہے اور دوسرے اس کے ہر حکم کو گوشِ قبول سے سُنتا اور نہایت شوق سے آمادہ امتثال رہتا ہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوا کرتی ہے جس کی جانب پوری توجہ اور التفات نہ ہو اور جو چیز ہر وقت دل پر مستولی ہو اس میں بھول کا ہونا عادۃً ممکن نہیں اسی طرح نافرمانی اس کے حکم کی ہوتی ہے جس کی وقعت اور محبت دل میں نہ ہو۔ جب ہر دم کی یاد اور کامل اطاعت علاماتِ محبت سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہو کہ قابلِ انتخاب وہ ہے جس کی روشنی علم و معرفت اور گرمی

یعنی محبتِ خداوندی حاصل ہو۔

توخلاصہ مقتدا کی صفات کا یہ نکلا کہ اس کو بقدر ضرورت علم دین ہو اگرچہ وہ اصطلاحی مولوی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کو کسی شیخ کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہو کیونکہ گرمی امر مکتسب نہیں بلکہ موہوب امر ہے اور عادۃ اللہ ہے کہ وہ اسی طرح حاصل ہوتا ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے اور اس کی ہدایت کے بموجب عمل کرے اور یہی وہ چیز ہے کہ جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے نہ مورخ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ دنیا میں اس کے ماسوا بھی اکثر کام ایسے ہیں جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں مثلاً باورچی گری کا کام، درزی کا کام کہ اگر کوئی ساری خوانِ نعمت حفظ کرلے مگر جب تک کسی کامل استاد کے پاس نہ رہے تو اس کو باورچی گری نہیں آسکتی اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب میں دیکھ کر کرتہ اچکن وغیرہ کی کاٹ ۔۔ اش بالکل ازبر کرلے تو اس کو درزی کا کام نہیں آسکتا تصوف کے سینہ بسینہ ہونے کے یہی معنی ہیں نہ یہ کہ اس کے مسائل سینہ بسینہ ہیں کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں مدون ہیں بلکہ وہی ایک نسبت ہے جس کو گرمی سے تعبیر کیا ہے کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے ایک صفت یہ ہے کہ وہ باعمل ہو یہ تو علامات کامل ہونے کی ہیں اور مکمل ہونے کی علامات دوسری ہیں اور وہ بھی نہایت ضروری ہیں کیونکہ مریض کو اپنے مرض دور کرنے کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ خود بھی تندرست ہو اور طبیب بھی ہو تو اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دل میں ایک سکون اور راحت پیدا ہو اور خدا تعالیٰ کی محبت بڑھے دنیا کی محبت کم ہو اگرچہ یہ باتیں فوراً نہ پیدا ہوں بلکہ کچھ دنوں کے بعد ہوں۔ دوسرے اگر اس سے اپنا مرض بیان کیا جائے تو جواب سے دل کو تسلی ہو یوں معلوم ہو کہ یہ ہمارے مرض کو بالکل سمجھ گیا خوب کہا ہے: ”وعدۂ اہلِ کرم گنجے بود“، پس جب ایسا شخص میسر ہو جائے تو ضرور ہے کہ اس کی صحبت اختیار کی جائے۔ اگرچہ اس سے بیعت نہ ہو کیونکہ بیعت ہونا چنداں ضروری نہیں ہے لیکن یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ بیعت بالکل بے سود ہے۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ بیعت بالکل بیکار ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر ہی کام کرے میں نے کہا کہ صاحب آپ نے کبھی علاج بھی کرایا ہے کہ نہیں کہنے لگے کہ بیشک ضرورت کے وقت علاج کرایا ہے میں نے پوچھا کہ کسی ایک طبیب سے رجوع کیا ہے یا اس طرح کہ آج ایک سے کل دوسرے سے پرسوں تیسرے سے کہنے لگے کہ کسی ایک ہی کی طرف جس پر اطمینان ہوا رجوع کیا ہے پھر میں نے پوچھا کہ اس میں آپ نے کیا مصلحت سوچی کہنے لگے کہ روز روز نئے طبیب بدلنے سے کسی ایک کو بھی توجہ اور شفقت مریض پر نہیں ہوتی کیونکہ کوئی ایک بھی اس کو اپنا مریض نہیں سمجھتا میں نے کہا بس یہی حکمت اور نفع ہے بیعت ہونے کا کیونکہ بیعت ہونے کے بعد مرشد مرید کو اپنا سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے کہ یوں کہتا ہے ع من غم تو میخورم تو غم مخور۔ مرید کو ہر وقت یہ تسلی رہتی ہے کہ میرا ایک شفیق میرے ساتھ موجود ہے اور مرشد کو یہ لاج ہوتی ہے کہ یہ میرا شخص ہے۔ یہ مصلحت ہے بیعت میں ہاں اگر نرے نذرانے کی بیعت ہو تو کسی درجے میں بھی مفید نہیں۔ آج کل یہ حالت ہے کہ بعضے فخر کرتے ہیں کہ میرے ایک لاکھ مرید ہیں معاذ اللہ گویا ایک فوج جمع کی ہے۔ غرض اگر اس قسم کی پیری مریدی نہ ہو تو اس میں بیحد نفع ہے۔ کلام بہت دور پہونچ گیا۔ میں بیان کر رہا تھا کہ نسبت مع اللہ ایسی چیز ہے کہ جب یہ دل میں جگہ کر لیتی ہے تو خس و خاشاک ماسوا سب بہ جاتے ہیں بس نہ کوئی شبہ رہتا ہے نہ مزاحم ؎

عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اور اس کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ ؎

تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں لفظ لَا ایک تلوار کی طرح ہے اس تلوار کو اللہ تعالیٰ کے سوا تمام معبودوں کے قتل کرنے پر چلانا چاہیئے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اول میں لفظ لَا لگانے کے بعد دوسرا کیا باقی رہ گیا صرف اِلَّا اللّٰہُ باقی رہ گیا اور باقی سب چلا گیا

ہے اے عشق تجھے کو مبارک بادی کہ تو ہر شرکت دور کر دینے والا ہے)

تو جب یہ تمام وساوس منقطع ہو جائیں گے تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور معلوم ہو جائیگا کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے کیا تعلق ہے اس کے بعد کوئی حکم ناگوار نہ گذرے گا۔ کیونکہ عاشق کو کوئی حکم محبوب کا ناگوار نہیں ہوتا بلکہ یوں چاہے گا کہ کسی طرح ہر وقت ادھر سے کچھ ارشاد ہی ہوتا رہے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک طبیب پر عاشق ہو گیا تھا آخر بیمار پڑا لوگ اسی طبیب کو علاج کے لئے لائے تو یہ مریض یوں تمنا کرتا تھا کہ مجھے کبھی شفا نہ ہو تا کہ اسی بہانہ سے روزانہ یہ طبیب میرے پاس چلا تو آیا کرے۔ صاحبو! واقعی یہ آگ بہت غضب کی چیز ہے کہ عاشق تو عاشق معشوق کو بھی متوجہ کر دیتی ہے

عشق را نازم کہ یوسف را ببازار آورد   ہمچو صنعا زاہدی را زیر زنار آورد

(مجھے عشق پر ناز ہے کہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لے آیا ہے جیسا کہ عشق ہی ایک زاہد کو شہر صنعا میں زنار کے نیچے لے آیا تھا یعنی عشق کی وجہ سے مذہب تک بدل دیا)

دیکھئے اس مریض کو مرض ہی تھا کہ جس نے طبیب کو بھی کھینچ ہی لیا آجکل کے عقلاء اس کو نہ سمجھیں گے کیونکہ یہ محض ذوقی ووجدانی امر ہے چند ہی روز ہوئے کہ سفر الہ آباد میں پیش آیا ہمراہ میرے ایک دوست بھی تھے وہ چونکہ شاعر بھی ہیں ایک موقع پر اپنے کچھ اشعار پڑھ رہے تھے کہ ان میں یہ شعر بھی پڑھا

کیا بیٹھا ہے سینے پر زانو کو دھرے قاتل   ہاں پھیر بھی دے خنجر کیا دیر لگائی ہے

اس مجمع میں ایک مولوی صاحب بھی تھے جن کی کتابیں عربی کی سب تمام تھیں لیکن شعر سے بالکل مناسبت نہ تھی انھوں نے جو یہ شعر سنا تو نہایت تعجب سے کہا کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے یہ تو بالکل لغو معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ تو محبوب حقیقی نے کسی کے گلے پر خنجر پھیرا نہ اس شاعر کے مرشد نے کبھی ایسا کیا البتہ طمانچہ شاید کبھی کسی کو مار دیا ہو لیکن سینے پر زانو رکھ کر تو کبھی نہیں بیٹھے۔ غرض ان کو ہر چند سمجھایا گیا لیکن اخیر تک ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا وہ اس کو برابر غلط ہی کہتے رہے اور لوگ ہنسا کئے تو دیکھئے شعر سے مناسبت نہ ہو سکی وجہ سے وہ ایک ذرا سا شعر کو نہ سمجھ سکے تو اسی طرح جن لوگوں کو نسبت حاصل نہیں ہے ان کی سمجھ میں نہ آئیگا کہ کیا بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسے لوگوں کو اہل محبت پر طعن کرنا ہرگز زیبا نہیں غرض محبت ایک عجیب چیز ہے ذرا غور کر لیجئے کہ اگر ایک مرد اور عورت سے محبت ہو جاتی ہے

لے زنار سے مراد خلاف وضع و ناموس نہ کہ خلاف شرع کیونکہ عشق میں ننگ و ناموس و نخوت و کبر سب زائل ہو جاتا ہے ۱۲ منہ

تو کیا حال ہوتا ہے کہ اس کے درشت اور نازیب کلمات بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بے جا فرمائشیں بھی پوری کی جاتی ہیں اور دل پر ناگواری نہیں ہوتی۔ یہ سب تمہید تھی اس آیت کے متعلق جس کی اس وقت تلاوت کی گئی تھی کیونکہ اس میں حکم ہے توبہ کا اور توبہ بوجہ اس کے کہ گناہ میں لذت ہے انسان پر گراں ہوتی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے کیونکہ گرانی اس کی صرف ابتدا ہی میں ہے چند روز کے بعد تمکین حاصل ہو جاتی ہے پھر کچھ گرانی نہیں رہتی چونکہ تمہید بہت طویل ہو گئی ہے۔ نیز ضروری مضامین اکثر بحمد اللہ اس میں آگئے ہیں اور وقت بھی زیادہ گذر گیا ہے۔ اس لئے میں آیت کا صرف ترجمہ کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں نفس مضمون آیت کے متعلق خدا تعالےٰ نے چاہا تو کسی دوسرے موقع پر بیان ہو جائے گا۔ سو آیت میں خدا تعالےٰ نے توبہ کا حکم دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو خدا کی جانب رجوع کرو خالص رجوع ترجمہ پر غور کیجئے اور خدا تعالےٰ کے احسان وعنایت کو ملاحظہ فرمایئے کہ یوں نہیں فرمایا کہ بالکل گناہ ہی نہ کرو بلکہ یہ فرمایا کہ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کر لو۔ صاحبو! اس میں تو کوئی دقت نہیں ہے اس سے تو ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ دیکھئے شریعت کی آسانی کو ملاحظہ فرمایئے کہ اول تو یہ ہے کہ بد پرہیزی کر کے بیمار ہی نہ پڑو اور اگر بیمار پڑ جاؤ تو دوا پی لو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ توبہ سے کیا فائدہ کیونکہ پھر گناہ ہوگا۔ میں جواب میں کہا کرتا ہوں کہ یہ قانون امراض ظاہری میں کیوں نہیں چلایا جاتا کہ علاج سے کیا فائدہ جبکہ اگلے بھادوں میں پھر بخار کی آمد ہو گی۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیل اس آیت کی دوسرے وقت ہو جائے گی، اور اگر نہ بھی ہوئی تو جس کو طلب ہو گی جزئیات کی تفصیل اس کو خود ہی تلاش سے معلوم ہو جائے گی۔ دیکھئے جو شخص اسکول کے حالات معلوم کرنا چاہے اگر اس کو طلب ہے تو خود ہی اسکول میں داخل ہونے کی فکر کرے گا اور وہاں داخل ہو کر سب حالات خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ اب خدا تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل دے۔ آمین۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم کا
آٹھواں وعظ مسمّٰی بہ

تفصیل التوبہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد سوم کا

آٹھواں وعظ مسمّٰی بہ

تفصیل التوبہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
ریاست خیرپور سندھ برمکان [illegible] صاحب	شب ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹے	کھڑے ہو کر	تفصیل التوبہ	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تقریباً پچاس ساٹھ ۵۰-۶۰	مستورات بھی تھیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا ایھا الذین امنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا عسی ربکم ان یکفر عنکم سیاتکم الخ (اے ایمان والو

تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔)

یہ ایک آیت ہے جس کی صبح بھی تلاوت کی گئی تھی اور بطور تمہید کے اس کے متعلق کچھ بیان کیا گیا تھا اس وقت یہ علم نہ تھا کہ دوسرا موقع اتنی جلدی بیان کرنے کا مل جائیگا اس لئے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کا تتمہ پھر کبھی بیان کر دیا جائیگا۔ مگر یہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے اتنی جلدی موقع دیدیا لیکن یہ ضرور ہے کہ چونکہ مجمع مستورات کا بھی ہے اور اس بیان کی اصل مخاطب بھی وہی ہیں اس لئے رنگ بیان کا دوسرا ہوگا کیونکہ مستورات کے سمجھنے کے لائق دوسرے مضامین ہوتے ہیں۔ بعضے تو مضامین ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو عورتیں نہیں سمجھ سکتیں اور بعض دفعہ مضمون تو سہل ہوتا ہے مگر اس کا عنوان علمی ہوتا ہے اس وقت چونکہ مخاطب عورتیں ہیں اس لئے مضامین ان کی ضرورت کے لائق اور ان کے ساتھ مخصوص یا مشترک ہوں گے اور جو مشترک ہوں گے ان کو ایسے طرز سے بیان کیا جائیگا جو کہ عورتوں کی سمجھ کے مناسب ہو لہذا اگر مردوں کو اس وقت کے بیان میں حظ نہ آئے تو تنگ دل نہ ہوں اس لئے کہ اول تو حظ مقصود نہیں دوسرے کبھی تو عورتوں کو بھی سننا چاہیئے۔ صبح اس آیت کے متعلق صرف تمہید تھی مقصود باقی رہ گیا تھا مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے ایمان والے بندوں کو توبہ کا حکم کرتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے معلوم ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ اسی کو توبہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے یہی توبہ کی حقیقت ہے اور صرف لفظ توبہ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں کیونکہ صرف زبانی وہی توبہ ہے جس کو کہتے ہیں ؎

سبحہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ معصیت راخندہ می آید براستغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح ہو ہونٹوں (زبان) پر توبہ توبہ ہو اور دل اندر اندر گناہ کے مزے لے رہا ہو تو ایسی حالت میں خود گناہ کو بھی ہماری ایسی توبہ و استغفار پر ہنسی آجاتی ہے)

تو حقیقت توبہ کی یہ ہوئی کہ دل سے توجہ ہو تو فرماتے ہیں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا الخ (اے مسلمانو توبہ کرو) چونکہ توبہ کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لئے اب میں توبہ ہی کا لفظ کہوں گا کہ اے ایمان والے بندو توبہ کرو خدا کی طرف خالص توبہ یہ حاصل ہے اس جملہ کا

اور مقصود اس وقت صرف اسی جملہ کا بیان کرنا ہے آیت کے دوسرے اجزاء کا بیان اس وقت نہ ہوگا۔ اور اگر ہوا بھی تو صرف ترجمہ باقی تفصیل صرف جزء اول ہی کی مقصود ہے اس آیت کا یہ مضمون کوئی نیا مضمون نہیں ہے بہت دفعہ کانوں میں پڑا ہوگا لیکن شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب یہ پرانا مضمون ہے تو اس کے اس وقت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سو ضرورت یہ ہے کہ وعظ میں جو مضمون بیان کیا جاتا ہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور جب ایک مضمون پر متعدد مرتبہ سننے کے بعد بھی عمل نہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ہنوز اس کے مکرر بیان کی ضرورت ہے تاکہ اس طرف التفات پیدا ہو بلکہ نامعلوم مضامین سے بھی ایسے مضمون کی ضرورت زیادہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ ؎

فَإِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِيْ فَتِلْكَ مُصِيْبَةٌ وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِيْ فَالْمُصِيْبَةُ أَعْظَمُ

(اگر تو نہیں جانتا تو یہ نہ جاننا کہ خود ایک بری بات ہے اور اگر تو جانتا ہے اور پھر عمل نہیں کرتا تب تو بہت بُری بات ہے)

جان بوجھ کر خلاف کرنا بہت بڑی مصیبت ہے اس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بار بار کان میں پڑ کر عمل نہ ہونا یہی وجہ ہے اس کے ضروری الفرض ہونے کی دوسری بات یہ ہے کہ بعض احکام تو خاص حالتوں کے متعلق ہوتے ہیں کہ جن کی ضرورت مخصوص اوقات میں واقع ہوتی ہے اور بعض احکام ہر حالت کے متعلق ہوتے ہیں کہ ان کی ہر وقت حاجت ہوتی ہے سو جس شخص کو یعنی واعظ کو کسی موقع پر اکثر بیان کرنے کا موقع ملتا ہو اس کو تو چاہیئے کہ بالترتیب خاص خاص حالتوں کے احکام بیان کرلے اور جس کو گاہ گاہ موقع ملے جیسا اس وقت میرا آنا مسافرانہ ہوگیا ہے اس کو چاہیئے کہ اہم مضامین کو بیان کرے اور ظاہر ہے کہ اس مضمون سے زیادہ اہم کونسا مضمون ہوگا کہ جس کی ہر وقت ہم کو ضرورت ہو تو یہ کا مضمون ایسا ہے کہ ہر حالت کو عام ہے اور ہر وقت ہم کو اس کی ضرورت ہے کیونکہ توبہ گناہ سے ہوا کرتی ہے اور گناہ ہم سے ہر وقت ہوتے ہیں اس پر شاید کسی کو تعجب ہو کہ ہر وقت تو ہم گناہ نہیں کرتے پھر یہ کیونکر صحیح ہوا کہ کوئی وقت ہمارا گناہ سے خالی نہیں تو وجہ اس تعجب کی یہ ہے کہ لوگوں کو گناہ کی حقیقت معلوم نہیں صرف ٹوٹی پھوٹی فہرست گناہوں کی یاد کر رکھی ہے کہ چوری

قتل. زنا. جوا وغیرہ جب گناہ کی حقیقت معلوم ہوگی تو معلوم ہوگا کہ کوئی وقت بھی ہمارا گناہ سے خالی نہیں اور جب ایسا ہے تو ہر وقت ہم کو توبہ کی ضرورت ہے۔

گناہ کا خلاصہ ہے خدا کی نافرمانی کرنا تو اول یہ معلوم کرو کہ خدا نے کس کس بات کا ہم کو حکم کیا ہے۔ پھر دیکھو کہ ہم ان میں سے کتنے حکموں پر عمل کرتے ہیں اور کتنے نواہی سے اجتناب نہیں کرتے اور یہ اس وقت معلوم ہوسکتا ہے کہ شریعت کا علم سیکھا جائے کیونکہ یہ اس پر موقوف ہے افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں نے بالخصوص عورتوں نے علم دین کی طرف سے بالکل توجہ ہٹالی ہے عورتوں کو اول تو موقعہ نہیں ملتا کہ علم دین سیکھیں نیز ان کو توجہ بھی نہیں اور عورتوں کے بارے میں بڑا الزام مردوں پر ہے کہ وہ ان سے صرف کھانے پکانے کا کام لیتے ہیں اور علم دین سکھلانے کا ذرا اہتمام نہیں کرتے کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح باہر پھر کر نہیں سیکھ سکتیں اس لئے کہ ان کو پردے سے نکلنا جائز نہیں۔ اب اگر ان کی کوئی سبیل تعلیم کی ہوسکتی ہے تو اسی طرح کہ مرد توجہ کریں اور ان کی تعلیم کا خود ذمہ لیں۔ آج کل کے عقلاء پردے کے مسئلے میں بھی بہت موشگافیاں کرتے ہیں میں اس کے لئے مختصراً اتنا بیان کرتا ہوں کہ دیکھئے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تمام امّت کی امہات ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ماں کے ساتھ بیٹیوں کو کسی قسم کے فتنہ کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا لیکن باوجود اس کے دیکھ لیجئے پردے کے بارے میں اُن کو کیا کیا حکم ہوئے ہیں پہلا حکم یہ ہے کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے موافق مت پھرو) کہ گھر میں بیٹھو تو جب ان کو بصیغۂ امر ارشاد ہوا ہے کہ گھر میں رہو اور باہر نہ نکلو تو اور بیبیوں کو کیسے حکم نہ ہوگا بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ اس کا خطاب خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو ہے تمام امّت کی عورتوں کو نہیں لیکن ان معترضین پر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ نہ سمجھا کہ جب ازواج مطہرات کو یہ حکم ہے تو دوسری عورتوں کے لئے تو علی السبیل الاولویت ثابت ہوگا بدلالۃ النص اور یہ اس وقت ہے کہ جب قرآن شریف میں اسی پر اکتفا ہوتا حالانکہ دوسری

آیات بھی موجود ہیں فرماتے ہیں قل لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ الخ کہ مومنات کو حکم فرما دیجئے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور اپنی زیب و زینت ظاہر نہ کریں الخ دوسری جگہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں اپنی بیبیوں سے اور بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ ڈالیں اپنے اوپر اپنی چادریں) دیکھئے اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب عورتوں کے لئے برابر حکم ہے تو جب پردہ ضروری ہے تو ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسا موقع نہیں مل سکتا کہ وہ باہر پھر کر علم دین سیکھیں۔ اس لئے مردوں پر واجب ہے کہ ان کو دین کے احکام بتلائیں۔ حدیث میں ہے کلکم راعٍ وکلکم مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ یعنی تم سب ذمہ دار ہو اور تم سے قیامت میں تمہاری ذمہ داری کی چیزوں سے سوال ہوگا قرآن شریف میں ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (اے مسلمانوں! بچاؤ خود اپنی جانوں اور اپنی اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے) تو گھر والوں کو بچانے کے معنی یہی ہیں کہ ان کو تنبیہ کرو بتلاؤ بعض لوگ بتلا تو دیتے ہیں مگر پھر ڈھیل چھوڑ دیتے ہیں کہتے ہیں کہ دس دفعہ تو کہہ دیا نہ مانیں تو ہم کیا کریں۔ صاحبو! یہ سب قلت تدبر کی وجہ سے ہے میں نمونہ کے طور پر ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ اگر کسی دن کھانے میں نمک تیز ہو گیا ہو اور اس قدر تیز ہوا ہو کہ اس کی اصلاح ہی ممکن نہ ہو اور آپ بہت کچھ سخت و سست کہہ لیں لیکن باوجود آپ کے برا بھلا کہنے کے اگلے دن بھی وہی حالت ہو حتیٰ کہ پندرہ روز تک برابر کھانے میں نمک تیز رہے تو اس وقت آپ کیا معاملہ کریں گے آیا یہی جو کہ احکام دین میں کیا یا کچھ اور ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ نہ کیا جائے گا بلکہ کم از کم اتنا ضرور کیا جائے گا کہ اُس کا پکایا ہوا کھانا نہ کھایا جائیگا کیا کوئی صاحب بتلا سکتے ہیں کہ انھوں نے ایسے موقع پر نہایت نرمی سے کہا ہو کہ بی صاحبہ کھانے میں نمک تیز نہ کیا کیجئے اور اگر اس پر نہ مانا ہو تو یہ کہکر خاموش ہو رہے ہوں کہ ہم نے تو دس دفعہ کہہ دیا نہ مانے تو ہم کیا کریں۔ تو صاحبو! جب اپنے معاملات میں اس قدر سختی برتی جاتی ہے تو کیا وجہ کہ دین کے معاملہ میں یہ سختی نہیں معلوم ہوا کہ دین کا

اس قدر اہتمام خود تمہارے قلب میں نہیں ہے۔ اگر نماز روزے کے بارے میں بھی اسی تشدد سے کہا جاتا جس تشدد سے نمک تیز ہوجانے پر کام لیا گیا تھا تو ممکن نہ تھا کہ اثر نہ ہو ضرور اثر ہوتا۔ اور میں ایک آسان تدبیر اس کی بتلاتا ہوں کہ اس پر عمل کرنے سے ضرور دین کی پابندی ہوجائے گی وہ یہ ہے کہ جس روز نماز وغیرہ میں عورتوں کی ذرا سستی دیکھو اس روز ان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا ہے کہ اس کے بعد بہت جلد اصلاح ہوجائے گی کیونکہ جس روز تم ان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ گے اس روز یقیناً اُن کا بھی فاقہ ہوگا بس جب دو چار روز ایسا ہوگا خود سنبھل جائیں گی۔ تو طریقہ یہ ہے۔ صاحبو! کام تو کرنے ہی سے ہوتا ہے نرے الفاظ سے نہیں ہوتا۔ تو زیادہ تر الزام مردوں پر ہے بہر حال چونکہ اسباب عورتوں کی تعلیم کے کم ہیں اس لئے مناسب ہے کہ جب عورتوں کو کچھ سنائے تو انھیں کی ضرورت کا زیادہ لحاظ رکھے مردوں کی رعایت نہ کرے اس لئے اس وقت کا بیان بالکل سادہ ہوگا۔ اگرچہ ان میں سہل الفاظ سوچنے میں مجھے گونہ دقت ضرور ہے اور چونکہ اس وقت عورتوں کی طبائع کے انداز پر بیان ہوگا اس لئے جو مضامین صرف مردوں سے متعلق ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور یہ اس لئے بیان کر دیا کہ آگے یہ شبہ نہ ہو کہ فلاں جز بیان سے رہ گیا۔ دوسرے اس لئے بھی اس وقت خاص عورتوں کے مضامین بیان کئے جائیں کہ مردوں کو یہ بات معلوم ہوجائے کہ ہم جب عورتوں کو نصیحت کیا کریں تو کیا نصیحت کیا کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس مقام پر توبہ کا حکم ہے اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور گناہ کا علم دین کے جاننے سے ہوتا ہے کہ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گناہ کس قدر ہیں اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ شاید ہی کوئی وقت ایسا گذرتا ہو کہ ہم سے گناہ نہ ہوتے ہوں مثلاً دل ہی ہے کہ اس کے گناہوں کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا حالانکہ اس کے بہت سے گناہ ہیں مثلاً کسی شخص کو بنظر حقارت دیکھا یہ بھی گناہ ہے جس کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو سوال کرتے دیکھا جو کہ صحیح و تندرست تھا آپ نے دل میں فرمایا کہ یہ شخص صحیح سالم ہے اور پھر سوال کرتا ہے

رات کو آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص آپ کے پاس مردار لایا اور کہا کہ اس کو کھائیے انھوں نے کہا کہ یہ تو مردہ ہے کیونکر کھاؤں۔ اس شخص نے جواب دیا کہ آج صبح تم نے اپنے ایک بھائی کا گوشت کھایا ہے تو اس کے کھانے میں کیوں تامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو غیبت نہیں کی اس نے جواب دیا کہ گو زبان سے غیبت نہیں کی لیکن دل میں تو اس کو حقیر سمجھا اور دل ہی سے تو سب کچھ ہوجاتا ہے آخر جنید رحمۃ اللہ علیہ بہت گھبرائے اور اس فقیر کے پاس پہنچے وہ کوئی کامل شخص تھا ان کو دیکھتے ہی کہا وھوالذی یقبل التَّوبۃ عَنْ عِبَادِہٖ (وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے) سو ان گناہوں کی طرف کبھی ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی گناہ ہیں۔ اسی طرح بعض جوارح کے ایسے گناہ ہیں کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ نہایت بے تکلف کیا جاتا ہے جیسے زبان کے اکثر گناہ، اسی طرح اپنے کو بڑا سمجھنا اس کو بھی ہم لوگ گناہ نہیں سمجھتے بلکہ خود بینی اور خودداری کو عزت سمجھتے ہیں اور ضروری جانتے ہیں۔ صاحبو! گناہ کی علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہو دیکھ لیجئے کہ ان گناہوں پر کیا کیا وعیدیں ہیں غیبت پر کیا وعید ہے تکبر پر کیا وعید ہے اسی طرح بلا تحقیق کسی واقعہ پر حکم کردینا اس پر کیا وعید ہے تو جب لوگ علم دین حاصل کریں گے اس طرح کہ مرد تو پڑھیں اور عورتیں یا تو پڑھ لیں یا اگر اس کا موقعہ نہ ملے تو اہل علم کے چھوٹے چھوٹے رسائل سن کر یاد کرلیں اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ گناہ کیا کیا ہیں چنانچہ شادی اور غمی میں اس قدر رسوم خلاف شریعت ہوتی ہیں جن کی کچھ حد نہیں۔ اکثر لوگ شادی میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ناچ نہ کرایا اور گانا نہ ہوا تو بس کوئی رسم ہم نے نہیں کی شرعی نکاح ہوگیا حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی رسمیں ایسی ہیں کہ وہ بدعت بلکہ بعض شرک ہیں اگرچہ الحمد للہ ایسی رسوں میں سے اکثر چھوٹ گئی ہیں جیسے دولہا کو الو کا گوشت کھلانا یا دامن میں ہلدی باندھنا میانہ سے اتر کر چارپائی پر نہ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ کہ اس قسم کی رسمیں اکثر ترک ہوگئی ہیں لیکن ان کے چھوٹنے کے ساتھ ہی وہ رسمیں کہ جن میں فخر اور مباہات ہے اور زیادہ ہوگئی ہیں کیونکہ بہ نسبت سابق کے اس وقت تموّل زیادہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ پہلے لوگوں میں اس قدر تموّل کہاں تھا ایسا ساز و سامان کہاں تھا یہ رنگ برنگ کے کپڑا کوئی جانتا بھی

نہ تھا چنانچہ اب بھی جو لوگ پرانی وضع کے باقی ہیں ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی ہے اور آجکل کے نئے رنگینیوں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک مقام پر پہونچکر مجھے معلوم ہوا کہ شادی میں ڈیڑھ ہزار کا صرف کپڑا ہی کپڑا دیا گیا شاید اس کی تو ساری عمر میں بھی اس کپڑے کا نصف بھی اس کو پہننا نصیب نہ ہو کیونکہ اول تو اتنا کپڑا ۔ دوسرے عورتوں کا پہننا کہ ایک ایک کپڑے کو دس دس برس تک احتیاط سے رکھ کر پہنتی ہیں کیونکہ ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ایسی حالت میں رہیں گی کہ صورت دیکھ کر بھی نفرت پیدا ہو اور دوسری جگہ جائیں گی تو بن سنور کر خدا جانے دوسری جگہ کسی کو دکھلانا منظور ہوتا ہے اور پھر اس کپڑے سے اس قدر مشغولی ان کے قلب کو ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ آج دھوپ دکھلائی جا رہی ہے اور کل صاف کیا جا رہا ہے کپڑا جو کہ خادم تھا ان کا مخدوم ہو گیا تعجب ہے کہ ان کا جی نہیں گھبراتا لیکن جب دوسرا کوئی کام نہیں تو آخر یہ بچاری دن کس طرح کاٹیں۔

اسی طرح شادی میں فضولیات ہوتے ہیں مثلاً کھانا کھلانا ہے کہ ساری برادری کو نوتا جاتا ہے مشورہ کرنا ہے کہ ایک ایک سے رائے لی جاتی ہے ۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح کرنا چاہا اور یہ رائے ہوئی کہ اس خوشی میں ایک ہزار روپے کسی اسلامی مدرسے میں دیدیں اُن بیچاروں سے خطا یہ ہوئی کہ برادری کو جمع کر کے رائے لے لی تمام برادری نے ان کو دق کر دیا اور کہا کہ ہمارا جو کچھ آپ نے کھایا ہے وہ واپس کیجئے آخر مجبور ہو کر بچاروں کو ساری رسمیں کرنا پڑیں اِن لوگوں سے کوئی پوچھے کہ اس رقم کے برباد کرنے سے آپ کا کیا نفع ہوا ۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ صاحب اس میں کیا گناہ ہے کہ برادری کو کھلا دیا پلا دیا صاحبو! یہ عنوان تو بہت پیارا ہے مگر ذرا اس کی حقیقت کو تو دیکھو یہ ایسا ہی عنوان ہے جیسا کہ ایک چور نے کہا تھا کہ ہم تو جو کچھ کھاتے ہیں حلال کر کے کھاتے ہیں ۔ دیکھئے رات کو نیند برباد کرتے ہیں محنت کرتے ہیں جب کہیں ہم کو کھانے کو نصیب ہوتا ہے تو جیسا اس چور نے ایک نیا عنوان نکال کر چوری کو حلال کیا تھا ایسی ہی ہماری حالت ہے کہ ایسا عنوان اختیار کرتے ہیں کہ گناہ بظاہر نظر گناہ ہی نہ معلوم ہو کہ برادری کو کھلا دیا ادائے حق کیا لڑکی کو دیا صلہ رحمی کی تو اس میں کیا حرج ہے میں کہتا ہوں کہ اگر لڑکی کے ساتھ صرف صلہ رحمی

کرنی ہے تو کیا وجہ کہ برادری کو جمع کر کے اِن کو دِکھلا کر صلہ رحمی کی جاتی ہے اور اگر صلہ رحمی کے لئے برادری کو جمع کرنا ضروری ہے تو کیا وجہ کہ پندرہ سولہ برس تک جو صلہ رحمی لڑکی کے ساتھ کی گئی ہے اس میں برادری کو جمع کیوں نہیں کیا گیا کہ صاحبو دیکھ رکھو میں آج لڑکی کے واسطے کپڑا لایا ہوں آج اس کے لئے حلوا تیار کرایا ہے معلوم ہوا کہ شادی کے موقعہ پر مقصود تفاخر ہوتا ہے نہ کہ صلہ رحمی. دوسری علامت تفاخر مقصود ہونے کی یہ ہے کہ سامان دینے کے بعد اس طرف کان جھکتے ہیں کہ دیکھیں لوگ ہماری نسبت کیا کہہ رہے ہیں اگر کسی نے کہہ دیا کہ واقع حوصلے سے زیادہ کام کیا تو سمجھا جاتا ہے کہ بہت بڑی تعریف کی حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت بڑی ہجو ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہت بڑی حماقت کی کہ اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کر دیا لیکن یہ تعریف کم نصیب ہوتی ہے اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ نیت بھی پوری نہیں ہوتی بلکہ جتنا بھی یہ زیادہ خرچ کرتا ہے برادری زیادہ عیب نکالتی ہے اور ہمدردی بھی اگر کی جاتی ہے تو دل میں اس کے بگاڑنے کی فکر کی جاتی ہے ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے بگھرہ وہاں ایک نودولت تھے انھوں نے اپنے لڑکے کی شادی کی برادری کے لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے یہ شخص بہت بڑھ گیا ہے اس کو اپنا جیسا بنانا چاہیئے چنانچہ دو چار آدمیوں نے متفق ہو کر اُن کو یہ رائے دی کہ اس شادی میں طائفہ کو ضرور بلانا چاہیئے اور کہا کہ میاں کیا روز روز یہ موقع آتا ہے چنانچہ طائفہ کو بلایا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ کما کر جمع کیا تھا سب کھو کر بیٹھ رہے۔ برادری نے جب جب دیکھا کہ یہ بھی ہماری طرح کنگال ہو گیا تو بہت خوش ہوئے واقعی لوگوں کی وہ حالت ہے کہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھ نہیں سکتے۔ کسی کبڑی سے پوچھا تھا کہ تیری کیا تمنا ہے اس نے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں تاکہ میں بھی ان کو ہنسوں اور اگر اتفاق سے کسی نے ایسا سامان کر بھی لیا کہ اس میں کوئی عیب نہ نکل سکا تو کہتے ہیں کہ میاں اگر کیا تو کیا بڑی بات ہوئی جن کے پاس ہوا کرتا ہے کیا ہی کرتے ہیں بتلایئے کہ جب برادری بھی خوش نہ ہوئی اور خرچ بھی ہوا تو کیا فائدہ ہوا۔ تو صاحبو! کیا اس ساری کارروائی کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کھلا دینا پلا دینا ہے کیا یہ اسراف اور تفاخر نہیں ہے اور

کیا تفاخر گناہ نہیں ہے قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت دیکھئے
حدیث میں ہے مَنْ لَبِسَ ثوب شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
(جس کسی نے شہرت کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے)
غور کیجئے کہ کپڑے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے جب اس میں یہ وعید ہے تو دوسرے
فضولیات جن میں زیادہ خرچ ہوتا ہے کیا ان میں یہ وعید نہ ہوگی۔ اسی طرح کے اور
بہت گناہ ہیں جو سرسری سمجھے جاتے ہیں غرض گناہوں کی اس قدر کثرت ہے
کہ اگر ان کی فہرست پیش نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم ہر وقت گناہ میں مبتلا ہیں تو ہم کو توبہ کی بھی ہر
وقت ضرورت ہے۔ اور توبہ کرنا ہر وقت ہم پر واجب ہے لہٰذا اس کا بیان کرنا بھی ضروری ہوا لیکن چونکہ
نرے وجوب کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ اکثر موانع قوی ہوتے ہیں کہ
ان کے ارتفاع کا ذریعہ نہ بتلانے سے طبیعت پر گرانی اور مایوسی ہوتی ہے
اس لئے موانع کا بتلانا اور ان کے ارتفاع کی تدابیر بتلانا بھی ضرور ہوا کہ کن کن
چیزوں سے توبہ کرنی چاہیئے۔ تو نہ محض اجمالی کافی ہے اور نہ زیادہ تفصیل کا وقت
ہے اس لئے بیان مواقع کے ساتھ چند کثیر الوقوع گناہ بھی بتلاتا ہوں کہ ان سے اجتناب
کیا جائے اور چونکہ وہ کثیر الوقوع ہیں جب ان سے اجتناب ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ
سب گناہوں سے اجتناب ہو جائے گا۔ دوسرے یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان
کسی ایک گناہ کو چھوڑتا ہے تو سب گناہ اس سے چھوٹ جاتے ہیں یعنی ایک
گناہ کا ترک دوسرے کے ترک میں معین ہوتا ہے تو گویا اب دو باتیں بیان کرنی
رہ گئیں۔ ایک تو مختصر سی فہرست گناہوں کی دوسرے توبہ کرنے کے موانع اور ان کے
ارتفاع کے ذرائع سو سمجھنا چاہیئے کہ جب توبہ کا وجوب قرآن شریف سے ثابت
حدیث شریف سے ثابت تو اس کی طرف سے بھی توجہ ہونے کے اسباب
کا ارتفاع واجب ہوگا۔ اسباب یہ ہیں جن کو میں مع ان کے علاج
کے بیان کرتا ہوں اور یہ موانع استقراری ہیں ممکن ہے کہ ان کے علاوہ
اور بھی موانع ہوں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہم کو گناہوں کی تفصیل معلوم نہیں تو جب گناہ ہی کا علم نہ ہوگا اور توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے تو توبہ کیونکر ہوگی افسوس ہے ہم لوگوں کو علم سے اس قدر اجنبیت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی عالم ہمارے سامنے ہمارے افعال کا گناہ ہونا بیان کرتا ہے تو سُن کر تعجب ہوتا ہے علم سے اجنبیت کے متعلق ایک حکایت یاد آگئی ایک معتبر راوی سے معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی کے فاضل کو سفر میں پانی نہ ملا تو نماز کے وقت آپنے تیمم کیا اور مٹی لے کر اس سے کلی بھی کی خدا جانے کیا کیا ہوگا منہ میں مٹی لے کر اس کو تھوکا ہوگا۔ یا اور کوئی صورت نکالی ہوگی۔ ملاحظہ کیجئے کہ ناواقفی کس حد تک پہونچ گئی۔ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر دس بیس عورتوں کو جمع کر کے ان کی نمازیں سُنی جائیں تو شائد ایک کی بھی نماز صحیح نہ نکلے اور اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ مردوں سے سیکھ کر نماز صحیح کرلو تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کو تو شرم آتی ہے انھیں شرم والیوں سے اگر ان کا شوہر یہ کہے کہ میں تم کو ایک ہزار کا زیور بنادوں گا بشرطیکہ تم نماز صحیح کرلو تو دیکھیں اس وقت ان کی شرم کہاں جاتی ہے خاص کر اگر کسی بوڑھی عورت سے کہا جاتا ہے تو وہ تو ذرا بھی متوجہ نہیں ہوتی اور کہتی ہے کہ اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے لیکن اگر انہی بوڑھے طوطوں کو کوئی دنیا کا لالچ ہو تو دیکھئے کیسی زبان کھلتی ہے۔ افسوس ہے کہ عورتوں کو تو ثواب عذاب کا مردوں سے زیادہ خیال ہوتا ہے کہ وہ عذاب سے ڈرتی ہیں اور ثواب کی طرف راغب ہوتی ہیں پھر بھی وہ کیوں متوجہ نہیں ہوتیں ہاں اگر کسی نے تصحیح قرآن شریف میں محنت و مشقت کی اور پھر بھی حروف درست نہ ہوئے تو وہ معذور ہے پھر اس سے جس طرح بھی ادا ہو سکے جائز ہے لیکن محنت کئے بغیر معاف نہیں ہوگا غرض کوشش کرنی چاہیئے کہ نماز صحیح ہوجائے اسی طرح نماز تنگ وقت میں پڑھنا بھی عام عادت ہوگئی ہے خاص کر اکثر عورتیں کام کاج میں اس قدر دیر کردیتی کہ مکروہ وقت میں نماز پڑھتی ہیں لیکن اس کو ذرا بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ علیٰ ہذا جلدی جلدی نماز پڑھنا کہ گویا ایک بیگار ہے جس طرح بنے اس سے جان چھڑاؤ اس میں بعض اوقات ایسی صورتیں پیش آجاتی ہیں کہ نماز بالکل ہی نہیں ہوتی کہ پڑھی بھی اور ثواب بھی نہ ملا بلکہ اُلٹا گناہ ہوا عورتوں سے

تعجب ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف ذرا خیال اور توجہ نہیں کرتیں اسی طرح بہت سے ایسے امور ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کی خبر بھی نہیں سو اس کا علاج یہی ہے کہ علم دین پوری طرح حاصل کیا جائے اور کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم بہشتی زیور کے دسوں حصے ہی پڑھ لیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے کہ مرد علماء سے پڑھ لیں پھر جو کچھ پڑھا ہے عورتوں کو پڑھا دیں اور یہ نہ سمجھیں کہ صرف دیکھ لینا کافی ہوگا عورتیں تو بھولی بھالی ہوتی ہیں اکثر مقامات کو مرد بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے اور علم دین ہی کے ساتھ خاص نہیں ہر فن ہر علم کی یہی کیفیت ہے مثلاً دیکھئے کسی شخص نے آج تک ایسی جرأت نہیں کی کہ طب کی کتابیں دیکھ کر اپنا یا اپنی بیوی بچوں کا علاج کر لیا ہو اور منضج اور مسہل کے نسخے تجویز کر لئے ہوں بلکہ ہر مرض میں یہی کہتے ہیں کہ کسی طبیب سے رجوع کرو پس جب دوسرے علوم میں صرف مطالعہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا اور اپنے کو صاحب فن کا محتاج سمجھا جاتا ہے تو علوم دینیہ میں اپنے دیکھ لینے کو کافی کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی، ایک شخص مدت سے مجھ سے خط و کتابت رکھتے تھے لیکن جب ان کا خط آتا تھا کسی نہ کسی دنیاوی ہی غرض کے لئے آتا تھا، میں نے ان کو لکھا کہ تم جب لکھتے ہو دنیا ہی کی باتیں لکھتے ہو کیا تم کو دین کی باتوں میں کبھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو وہ جواب میں لکھتے ہیں کہ میرے پاس بہشتی زیور موجود ہے مجھ کو جو دین کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں دیکھ لیتا ہوں گویا ان کے نزدیک سارا دین بہشتی زیور ہی کے اندر آگیا ہے یا ان کو بجز ان مسائل کے جو اس میں ہیں اور کسی مسئلے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اس میں شک نہیں کہ بہشتی زیور میں ایک کافی تعداد مسائل کی موجود ہے لیکن اول تو اس میں زیادہ تر وہ مسائل ہیں جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں یا مشترک ہیں عورتوں اور مردوں میں اور قطع نظر اس سے اس میں مسائل اس قدر نہیں کہ ان کے بعد ضرورت دریافت کی ہی نہ ہو نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے سارے مسائل مطالعے سے حل ہی ہو جائیں اور کسی مسئلے میں شبہ ہی پیدا نہ ہو غرض ضرورت اس کی ہے کہ اول اس کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھا جائے اس کے بعد عورتوں کو پڑھایا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اول خود کتابیں دیکھیں اور جس مقام پر شبہ ہو وہاں نشان بنا دیں اور جب کبھی علماء سے ملاقات ہو اس کو حل کر لیں۔ یا کسی عالم کے

پاس لکھ بھیجیں کہ وہ اس کا مطلب لکھ کر بھیجدیں اگر ایک مدت تک اس التزام سے مطالعہ کیا جائے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ بہت کم غلطی ہوگی دوسرے ایک دفعہ دیکھنے پر اکتفانہ کریں بلکہ دینیات کی کتابیں روزانہ مطالعہ میں رکھیں جیسے کھانا پینا روزانہ ہوتا ہے۔ صاحبو! جب قالب کا تغذیہ روزانہ ہوتا ہے تو کیا روح کے تغذیہ کی روزانہ ضرورت نہیں ہے بیشک ضرورت ہے اور میں تجربہ کی بات بتلاتا ہوں کہ ایک دفعہ کا دیکھا ہوا بہت کم یاد رہتا ہے بلکہ اکثر ذہن سے نکل جاتا ہے پس اگر کسی نے ایک دفعہ دیکھ کر کتاب کو اٹھا کر طاق میں رکھ دیا تو اس کو دیکھنے سے کیا نفع ہوا۔ غرض خوردونوش کی طرح روزانہ اس کا بھی دور رکھو اگرچہ قلیل ہی مقدار میں ہو جب دیکھتے دیکھتے کتاب ختم ہو جائے پھر دوبارہ ابتدا سے دیکھنا شروع کر دو اسی طرح سلسلہ جاری رکھے پس اس طرح کتاب بالکل حفظ ہو جائے گی لیکن پھر بھی بعض صورتیں تم کو ایسی پیش آئیں گی کہ ان کا حکم اس کتاب میں نہ ملے گا ایسی صورتوں کو کسی سے دریافت کرلو اور ساری عمر اسی شغل میں رہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی دنیا کا حرج کرو بلکہ تم کو دنیا کے کاموں سے جو وقت بچے اس وقت میں کچھ دین کا کام بھی کرلو اب یہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کے کاموں میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے اور فضول غپ شپ میں غیبت شکایت میں کتنا وقت جاتا ہے بس اس کے وقت میں سے کچھ تھوڑا سا دین کے کام میں بھی صرف کردو اگرچہ مناسب تو یہ ہے کہ یہ زائد وقت سارا دین ہی کے کام میں صرف ہوتا اور زائد وقت کو میں نے دین کے لئے اس واسطے تجویز کیا کہ آج کل اکثر لوگ خدا کے لئے وہی چیز تجویز کرتے ہیں جو اپنے سے بیکار ہو جائے مثلاً کپڑا جب تک سالم رہے تو اپنے لئے اور جب بالکل بیکار ہو جائے کہ پیوند بھی اس میں نہ لگ سکے اس وقت وہ خدا کے لئے دیا جاتا ہے مجھے اس کے مناسب ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ ایک عورت نے کھیر پکائی اور اس کو ایک رکابی میں لگایا اتفاق سے اس میں کتے نے منہ ڈال دیا اور کچھ اس سے کھا بھی گیا اس عورت نے اپنے لڑکے سے کہا کہ جا اس کو موذن کو دے آ چنانچہ وہ لے گیا اُس بچارے غریب کو خدا جانے کئے وقت کے بعد کھانے کو ملا تھا، مشہور ہے کہ یہ لوگ حریص ہوتے ہیں

صاحبو! کیوں نہ ہوں ان بچاروں کا رزق تو آپ کے ذریعہ سے ہے اور آپ ان کو غمی کے سوا کسی وقت پوچھتے ہی نہیں اگر ہمیشہ ان کا خیال رکھو تو کیوں وہ حریص ہوں۔ واقعی ان لوگوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دعائیں کرتے ہیں کہ کوئی مرے تو ہماری پوچھ ہو ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے وہاں ایک شخص کا انتقال ہوا اس کے ورثاء نے کفن کا چادرہ ایک غریب آدمی کو دیدیا تو وہاں کا تکیہ دار کہتا ہے کہ صاحب یہ تو ہمارا حق ہے یہ آپنے دوسرے کو کیوں دیدیا انھوں نے کہا بھائی تم کو تو ہمیشہ ملتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ واہ صاحب خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی آپ نے ہمارا حق دوسرے کو دیدیا۔ غرض اس مؤذن نے کھانا شروع کر دیا اور ادھر ہی سے ہاتھ مارا جدھر سے کتے کا کھایا ہوا تھا لڑکے نے کہا ملا جی ادھر سے مت کھاؤ کتے کا کھایا ہوا ہے یہ سن کر اس ملا نے رکابی کو اٹھا کر پھینک دیا کہ وہ ٹوٹ گئی رکابی کے ٹوٹنے سے لڑکے نے رونا شروع کیا اس نے کہا کہ کمبخت ایک تو مجھے کتے کی جھوٹی کھیر کھلادی پھر روتا ہے کہنے لگا اس لئے روتا ہوں کہ یہ رکابی میرے بھائی کے بچا نہ اٹھانے کی تھی تو نے وہ توڑ ڈالی مجھے ڈر ہے کہ میری والدہ مجھے مارنے نہ لگیں۔ یہ حکایت صحیح ہو یا غلط لیکن ان لوگوں کے ساتھ ہمارا جو برتاؤ ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں تو جیسے ہم لوگ ہر چیز بیکار خدا کے لئے تجویز کرتے ہیں اسی طرح وقت بھی تھوڑا سا نکمّا ہی وقت میں سے نکال کر خدا کے کام میں صرف کر لینا چاہیے۔ اور صاحبو! یہ نہ سمجھو کہ اس طرح ہم فاضل تو بن ہی نہ سکیں گے پھر کیا فائدہ۔ دیکھو مَالَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ (جو اچھی چیز پوری نہ حاصل کی جا سکے اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے) اگرچہ تم پورے عالم نہ ہو جاؤ گے لیکن جو کچھ علم ہو جائے گا وہ کیا کم ہے۔ بڑا فائدہ اس میں یہ ہے کہ جب چار باتیں تم کو معلوم ہوں گی ان کی بنا پر اپنے ماتحتوں کو تم روکتے ٹوکتے رہو گے اس روکنے سے بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ جب انسان ایک بات کو دس دفعہ سنے گا تو ضرور ہے کہ اس پر اثر ہوگا۔ دوسرے جب بڑے آدمی کو کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو اس سے بہت سے لوگوں کو

نفع ہوتا ہے کیونکہ وہ جس طرح چھوٹوں کو کہہ سکتا ہے بڑوں کو بھی کہہ سکتا ہے۔ برخلاف ایک غریب اور ادنیٰ درجہ کے آدمی کے کہ وہ اگر کہے گا بھی تو صرف اپنے سے چھوٹے یا اپنے برابر کے لوگوں کو اس کی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ان بڑے لوگوں کو کچھ کہے۔ علیٰ ہذا ایک یہ انتظام کیا جائے کہ عوام الناس کے لئے ایک وقت مقرر کیا جائے اگرچہ دن میں ایک ہی گھنٹہ ہو بلکہ خواہ ہفتہ میں ایک ہی گھنٹہ ہو کر اس وقت میں سب کو ایک جگہ جمع کر کے احکام سنائے جائیں اور اگر زیادہ مجمع ہو جائے تو ایک ایک معلم کو چالیس چالیس یہ پچاس پچاس آدمی دیدیئے جائیں یا یہ کیا جائے کہ ایک محلے کے لئے ایک آدمی تجویز کر دیا جائے دوسرے محلے کے لئے دوسرا آدمی اور اگر متعدد آدمی نہ مل سکیں تو ایک ہی آدمی نمبر دار ہو ہر محلے میں جایا کرے اور جس قدر لوگ جمع ہو جائیں ان کو احکام سُنا دیا کرے لیکن احکام کتاب میں دیکھ دیکھ کر سنائیں اس طرح سے اگر ایک سال بھی سلسلہ رہے تو تمام مسلمان دین کے عالم ہو جائیں غرض ضرورت اس کی ہے کہ تعلیم دین بالکل عام ہو اور جب تک تعلیم دین عام نہ ہو گی احکام کی خبر ہی نہ ہو گی تو پھر توبہ کیونکر ہو سکے گی۔ دوسرا مانع توبہ سے یہ ہے کہ بعض لوگ گناہ کا گناہ ہونا تو جانتے ہیں لیکن اس کو کوئی بڑی چیز نہیں سمجھتے بلکہ ایک ہلکی بات سمجھتے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ کبھی گناہ کر کے ان لوگوں کا جی بُرا نہیں ہوتا دوسرے توبہ نہیں کرتے دیکھئے اگر اس شخص کو جو کہ شراب نہ پیتا ہو دھوکے میں کوئی شراب پلا دے تو دل پر کتنا صدمہ ہو گا لیکن جن گناہوں کی عادت ہو گئی ہے اور عادت کی وجہ سے ان کو خفیف سمجھ لیا ہے جیسے غیبت اس کے کرنے سے ذرا بھی جی بُرا نہیں ہوتا اور گناہ کے خفیف سمجھنے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ اس گناہ کے کرنے سے ہم کو کیا سزا ملے گی اور کتنا عذاب ہو گا اس کا علاج یہ ہے کہ احادیث ترغیب و ترہیب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا جائے اور ایسے لوگ ان کو مطالعہ میں رکھا کریں لیکن ابواب فقہ کے دیکھنے کی اجازت عوام کو نہ دی جائے۔ کیونکہ ایسے احکام مختلف فیہا ہیں اگر عوام ان کو دیکھیں گے تو ان کو ضرر زیادہ ہو گا اس لئے صرف ترغیب و ترہیب کی احادیث ان کو دی جائیں چنانچہ منذری کی ترغیب و ترہیب بہت عمدہ کتاب ہے

اس بارے میں اگر اس کا ترجمہ ہوگیا ہو تو اس کو دیکھیں اور اگر اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو تو کسی اہل علم کو چاہئے کہ اس کا ترجمہ کردے اور بہشتی زیور میں بھی میں نے سو حدیثوں کا ترجمہ کردیا ہے اس کا دیکھنا بھی بہت مفید ہے اس سے معلوم ہوگا کہ فلاں گناہ میں یہ عذاب ہوگا اس لئے اس گناہ سے بچنا چاہیئے۔ دوسرا سبب گناہ کے خفیف سمجھنے کا یہ ہے کہ گناہ کرتے کرتے ہماری عادت ثانیہ ہوگئی ہے کہ اس سے ذرا بھی طبیعت میلی نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف التفات بھی نہیں جاتا کہ ہم نے فلاں گناہ کیا ہے چنانچہ بعض اوقات اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو تعجب سے پوچھا جایا کرتا ہے کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا جس کے پاداش میں یہ مصیبت ہم پر نازل کی گئی ہیں۔ اس تعجب پر تعجب کرتا ہوں صاحبو! کیا کوئی وقت بھی گناہ سے بچا ہے پھر اس کے کیا معنے کہ جانے کونسا گناہ ہوگیا ہے بلکہ انصاف اور عقل کی رو سے تو یوں چاہیئے تھا کہ اگر ہم پر خدا تعالیٰ کا کوئی انعام ہو تو تعجب کریں کہ ہم جیسے گنہگاروں سے کیا بھلائی بن پڑی ہوگی جس پر یہ انعام ہوا ہے عادت ایسی بری چیز ہے کہ اس کی بدولت معصیت کا معصیت ہونا بھی ذہن سے نکل جاتا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ گناہ کی عادت چھوڑی جائے اور اپنے اوپر جبر کرکے گناہ کو ترک کیا جائے مثلاً غیبت کا گناہ ہے کہ اس میں علی العموم لوگ مبتلا ہیں اس کے چھوٹ جانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہمت کرکے ایک ہفتہ تک زبان کو غیبت کرنے سے اور کان کو غیبت سننے سے بند رکھا جائے جب ایک ہفتہ اس طرح گذر جائے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ دیکھو گے کہ غیبت کرنا تو درکنار غیبت سننا بھی گوارا نہ ہوگا بلکہ ایسا معلوم ہوگا گویا کسی نے ایک پہاڑ تم پر رکھدیا ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود ۔۔۔ گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اللہ والوں کے دل پر ہزار درجہ کا غم ہوتا ہے اگر دل کے باغ (دلی ودیعتی میزان میں) سے ایک تنکے کے برابر کمی ہو جائے)

ایک مانع توبہ کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کو بہت ہی بڑی چیز سمجھ لیتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اتنے بڑے گناہ کے مقابلہ میں توبہ سے کیا کام نکل سکے گا علیٰ ہذا بعض کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ اس قدر

کثیر ہیں کہ ان کی معافی ممکن ہی نہیں اگرچہ ہم کتنی ہی توبہ کریں ان دونوں غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی بارگاہ کو بندوں پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں عادت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بہت بڑے امر میں کسی کی نافرمانی کرے یا معمولی باتوں میں ہمیشہ نافرمانی کرے تو ان دونوں کے قصور کو معاف نہیں کیا جاتا اسی طرح گویا خدا کے کارخانے کو بھی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے بندہ اول تو محتاج ہے اس کو اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی بھی ضرورت ہے دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بات رکھنے کی بھی ضرورت ہے دوسرے بندہ متاثر ہے کہ جب کسی نے اس کی مخالفت کی تو اس پر کچھ اثر ہوا اگر مکرر مخالفت ہوئی اُس اثر اور انفعال میں ترقی ہوئی اسی طرح ترقی ہوتے ہوتے اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ استعداد موافقت سلب ہو جاتی ہے اِس لئے یہ معاف نہیں کر سکتا برخلاف خدا تعالیٰ کے کہ اُن کا ہر فعل اختیاری ہے وہاں تاثر کا نام بھی نہیں وہ عذاب بھی کرتے ہیں تو ارادہ محض سے کہ اس میں غیر اختیاری جوش کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اس کا علاج یہ ہے کہ اس خیالِ فاسد سے توبہ کرے اور رحمت کی حدیثیں مطالعہ میں رکھے یقین ہے کہ اُن سے یہ مایوسی مبدل بأمید ہو جائے گی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے تمام روئے زمین کی برابر گناہ کئے اور وہ توبہ کرے تو خدا تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرمادیں گے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدد گناہوں کا بڑھ جانا موجب یاس نہ ہونا چاہیئے رہی کیفاً زیادتی اس کو یوں سمجھئے کہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کفر ہے کہ اس کی برابر کوئی دوسرا گناہ نہیں ہے پھر دیکھ لیجئے جس وقت حضور پرنور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم رونق افروزِ عالم ہوئے دنیا کا کیا حال تھا بجز معدودے چند فرقوں کے اور ان میں بھی گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ ساری دنیا کفر و جہل سے پُر تھی خصوصاً عرب اور اور پھر اس میں بھی خاصکر قریش کے انھوں نے تین سو ساٹھ بُت اپنے لئے بنا رکھے تھے یعنی ہر دن ایک نیا خدا (بزعمِ شاں) اُن سے سرِ تسلیم خم کراتا تھا لیکن دیکھ لیجئے خدا تعالیٰ نے اسی قبیلۂ قریش سے فلکِ اسلام کے لئے کیسے نیّر اکبر پیدا کئے۔ حضرت ابوبکر

رضی اللہ عنہ اِسی قبیلے کے ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ (جب وہ کہنے لگے اپنے ساتھی سے غم نہ کرو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قبیلے کے ہیں جن کے لئے حدیث ہے اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ وَعَلٰی ھٰذَا (احکام الٰہی کے جاری کرنے میں سب سے زیادہ مضبوط حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں) غرض یہ سمجھنا کہ ہمارے گناہ معاف نہ ہوں گے غلطی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بغیر توبہ کئے مرجاتا ہے۔

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ سے پھر گناہ ہو جائے گا اور جبکہ ہنوز صدورِ گناہ کا احتمال باقی ہے تو توبہ سے کیا فائدہ ہوگا لہٰذا توبہ اس وقت کرنی چاہیئے کہ اس کے بعد پھر گناہ نہ ہوگا۔

صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ زندگی کا کون سا حصہ ہے جس میں نہ ہونے کا یقین کرلیا ہے جوانی میں اگر چالاکی عیاری نہیں ہوتی تو بدمستی لاابالی پن ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں اگر آوارگی بدمستی نہیں ہوتی تو حرص طولِ امل حیل سازی مکر وفریب حسد بغض۔ غرض بیسیوں امراض باطنی پیدا ہو جاتے ہیں تو حاصل اس عذر کا یہ ہوا کہ مر کر توبہ کریں گے مگر سمجھ لو کہ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ (جو مر گیا تو سمجھ لو کہ بس اس کی قیامت کا سلسلہ شروع ہو گیا) اور قیامت میں قبول توبہ ہے نہیں نتیجہ جو ہے ظاہر ہے اور سبب اس مانع کے پیش آنے کا یہ ہوتا ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب توبہ کے بعد بھی گناہ کا صدور ہوا تو وہ توبہ ٹوٹ گئی حالانکہ یہ غلط خیال ہے بلکہ پچھلے گناہ جو معاف ہو چکے ہیں وہ معاف ہو چکے ہیں اُن پر اب دار وگیر نہ ہوگی اسی طرح جس جس گناہ سے توبہ کرتے جاؤ گے وہ محو ہوتا جائیگا لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بہت آسان ترکیب آئی بس آئندہ سے یہی کیا کریں گے کہ خوب جی بھر کر گناہ کئے پھر توبہ کرلی پھر گناہ کئے پھر توبہ کرلی کیونکہ جس توبہ کے وقت آئندہ گناہ کرنے کا بھی قصد ہو وہ توبہ مقبول نہیں جیسا کہ میری پچھلی تقریر بابت حقیقت توبہ سے معلوم ہوا ہوگا اور قبول توبہ کے مضمون میں یہ خیال کہ خوب گناہ کریں اسی کو پیدا ہوگا جو کہ نہایت بلید الطبع ہو اور بالکل ہی گیا گزرا ہو ورنہ سلیم الطبع کو تو اس سے اطاعت کا زیادہ

جوش پیدا ہوگا کہ اللہ اکبر جب بارگاہ خداوندی میں اس قدر رحم و کرم ہے تو ہم کو ہرگز مناسب نہیں ہے کہ اُس کی مخالفت کریں حاصل یہ کہ حدیث میں ہے مَآ اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ یعنی جس شخص نے گناہ کے بعد توبہ کرلی وہ گناہ پر ہٹ کرنے والوں میں نہیں ہے اور فرماتے ہیں کُلُّکُمْ خَطَّاؤنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ کہ گنہگار تو سب ہیں مگر ان میں اچھے وہ ہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔ پس اگر اتنی ہمت نہ ہو کہ گناہ چھوڑ دو تو توبہ کرنے سے تو ہرگز ہمت نہ ہارو بلکہ جو گناہ ہو جایا کرے اس سے فوراً توبہ کرلیا کرو۔ اگر پھر ہو جائے پھر توبہ کرلو۔ دیکھو ایک شخص بیمار ہو جائے اور اس کو کوئی یہ رائے دے کہ علاج سے کیا فائدہ آخر پھر بھی احتمال ہے کہ بیمار ہو جاؤ گے، تو وہ جواب دیتا ہے کہ میاں اگر پھر بیمار ہوں گے تو پھر علاج کرلیں گے آئندہ کی بیماری کے اندیشے سے موجودہ بیماری کا علاج کیوں نہ کریں تو جو فتویٰ آپ کی عقل نے جسمانی مرض میں دیا ہے وہ فتویٰ روحانی امراض میں کیوں نہیں ہوتا اسی حدیث مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً یعنی اگرچہ ستر دفعہ توبہ ٹوٹ جائے۔

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ بندہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے اس کو ہمارے گناہ بخش دینے کیا مشکل ہیں لیکن صاحبو! یہ جواب ظاہری بیماریوں میں کیوں نہیں دیا جاتا اور امراض سمی میں اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اس نے اس خیال سے کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ ہم کو ضرور تندرست کردے گا۔ امراض جسمانی کا علاج نہ کیا ہو یا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اُس نے خدا کی رحمت پر بھروسہ کرکے زہر کھا لیا ہو کبھی نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا یوں کہے کہ میاں خدا کی رحمت پر بھروسہ کرکے سنکھیا کھا جاؤ تو اس کو دیوانہ بتلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا کے غفور رحیم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سنکھیا کھاؤ تو ضرر نہ کرے بلکہ سنکھیا ضرر بھی کرے گا اور خدا غفور رحیم بھی رہے گا۔ اسی طرح گناہ کا ضرر ہوتا ہے لیکن اس سے خدا تعالیٰ کے غفور رحیم رہنے میں کوئی نقص نہیں آتا۔

صاحبو! اس خیر سے کہ ہم غفور رحیم ہیں مقصود یہ ہے کہ جو گناہ تم سے ہو گئے ہیں

ان کی وجہ سے پریشان خاطر مت ہو اور تو بہ کو بیکار نہ سمجھو ہم اُن سب کو معاف کردیں گے چنانچہ اس آیت قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (آپ فرمادیں کہ اے میرے بندو جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر کے گناہ کر چکے ہو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو جاؤ بیشک اللہ تعالےٰ سب گناہوں کو معاف کردے گا درحقیقت وہی بخشش کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں) کا شانِ نزول یہی ہے کہ جب حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اول مکہ مکرمہ میں مبعوث ہو کر دعوتِ اسلام فرمائی تو لوگوں نے آکر عرض کیا کہ ہم آپ پر ایمان تو لے آئیں لیکن جو گناہ ہم نے اس کے قبل کئے ہیں اُن پر تو ہم کو ضرور سزا ہوگی۔ پس جب دین آبائی بھی چھوڑا بدنامی بھی اُٹھائی اور آخرت کا عذاب بھی باقی رہا تو ہم کو فائدہ ہی کیا ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم لوگ پچھلے گناہوں کا اندیشہ نہ کرو ہم غفور رحیم ہیں سب پچھلے گناہ بھی معاف کردیں گے اور اگلے بھی بس معلوم ہوا کہ مقصود آیت سے ان لوگوں کی ناامیدی کو دور کرنا ہے جو اسلام اور توبہ سے اس خیال پر رُکتے تھے نہ کہ وہ مقصود جو لوگوں نے سمجھا۔ ایک مانع یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں بلکہ زبان سے کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے جنت یا دوزخ وہ ضرور ہو کر رہے گا پھر نہ طاعت سے کچھ فائدہ اور نہ گناہ سے کوئی ضرر مگر تعجب ہے کہ یہ تقدیر دنیا کے کاموں میں مثلاً کمانا کھانا مال و دولت جمع کرنا ان میں کہاں چلی جاتی ہے ہم نے کسی کو نہ دیکھا کہ اس نے تقدیر کے بھروسہ پر کمانا چھوڑ دیا ہو یا کھانا نہ کھایا ہو یا کھیتی کرنی چھوڑ دی ہو اور اس میں تخم ریزی نہ کی ہو۔ کہ اگر تقدیر میں ہے تو خود بخود سب کام ہو جائیں گے اس موقعہ پر تو کہتے ہیں کہ صاحب تقدیر حق ہے لیکن تدبیر بھی تو کرنی چاہیئے بدون تدبیر کے کوئی کام نہیں ہوتا افسوس یہاں تو تدبیر کی ضرورت اور دین کے کام میں تدبیر کی ضرورت نہیں حالانکہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی خدا تعالےٰ نے ایک حد تک ذمہ داری بھی کی ہے فرماتے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (زمین پر چلنے والی اور رہنے والی جتنی بھی چیزیں ہیں سب کا رزق اللہ تعالےٰ کے اختیار میں ہے۔) اور معاد کے بارے میں ذرا بھی ذمہ داری نہیں

فرمائی بلکہ صاف ارشاد ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کو اسی قدر ملے گا جس قدر وہ کوشش کرے گا) اور مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَیْھَا (جس نے اچھے عمل کئے تو اپنے فائدے کے لئے کئے جس نے بُرا عمل کیا اپنے لئے کیا) کہ ہم بالکل وعدہ نہیں کرتے جو جیسا کرے گا بھرے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ارشاد فرمایا اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ اَنْ یُّدْخَلَ جَنَّۃَ نَعِیْمٍ کَلَّا (کیا ہر شخص اس کی خواہش کرتا ہے کہ وہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے ایسا تو ہرگز نہ ہوگا یعنی عمل کے موافق جزا ملے گی) تو جب تک پاک نہ ہوگے ہرگز دخولِ جنت کے قابل نہ ہوگے۔

غرض معاش کو تدبیر پر رکھنا اور معاد کو تقدیر پر چھوڑ دینا سخت غلطی ہے بالخصوص جبکہ تحصیل معاد کی تدابیر خود خدا تعالیٰ ہی نے بتلائی ہیں اگر معاد کا حصول محض تقدیر سے ہوتا۔ اور تدبیر کو اس میں دخل نہ ہوتا تو تدابیر بتلانے کی کیا ضرورت تھی اسی طرح اور بہت سے موانع ہیں گو یہاں سب مذکور نہیں ہوئے مگر اس مختصر سی فہرست سے تھوڑے سے غور کے بعد وہ بھی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ پس جب موانع اور ان کے ازالہ کی تدابیر معلوم ہوگئی تو جلدی سے ان موانع کو زائل کرنا چاہیئے اور توبہ کر لینا چاہیئے تاخیر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ تاخیر کی خاصیت یہ ہے کہ پھر اکثر توبہ میسر ہی نہیں ہوتی یہ حالت ہوتی چلی جاتی ہے کہ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم　　باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(میں ہر رات کو توبہ کے وقت یہ کہتا ہوں کہ ضرور اس بُرے خیال کو چھوڑ دوں گا لیکن جب دوسرا دن آتا ہے پھر یہی کہتا ہوں کہ کل سے نہ کروں گا۔)

کیونکہ توبہ ندامت کا نام ہے اور ندامت کہتے ہیں جی بُرا ہونے کو اور قصور پر شرمندہ ہونے کو اور شرمندگی اس وقت ہوتی ہے کہ طبیعت پر اثر باقی رہے اور اثر تھوڑے دنوں کے بعد زائل ہو جاتا ہے تو جب دل سے مقدمہ تو بہ ہی نکل گیا تو توبہ کیونکر نصیب ہو سکے گی۔ غرض کبھی توبہ کرنے میں دیر نہ کرے بلکہ دن کے گناہوں سے رات آنے کے قبل توبہ کر لے اور رات کے گناہوں سے دن ہونے سے پہلے۔ اور اگر کہو کہ سب سے آخری جو توبہ ہوگی اس کے بعد کے گناہ تو پھر بھی بلا توبہ کے رہ جائیں گے تو مواخذہ

ہر حال میں ہوا پھر روز کی توبہ کیا مفید ہوئی تو جواب یہ ہے کہ کیا وہ شخص جس پر دس برس کے گناہوں کا بار ہو اور وہ شخص جس پر ایک دن کے گناہوں کا بار ہو برابر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص پر دس مقدمے فوجداری کے ہو جائیں اور اس سے وکیل یوں کہے کہ اگر پیروی کی گئی تو امید ہے کہ نو مقدموں سے تم بری ہو جاؤ گے لیکن ایک مقدمہ میں باوجود پیروی کے بھی تم کو سزا ہو گی تو میں پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں کیا رائے قائم کی جائے گی آیا یہ کہ جب ایک میں سزا ہو گی تو پیروی کی کیا ضرورت لیقینًا نو میں بھی ہوتے دو یا یہ کہ باوجود ایک میں یقین سزا ہونے کے دوسرے مقدمات کی اس لئے پیروی کی جائیگی کہ جس قدر بھی سزا کم ہو بہتر ہے ظاہر ہے کہ دوسری تجویز پر عمل ہو گا تو جو شخص پچاس برس کے گناہوں کی پوٹ لے گیا اور جو شخص ایک دن کے گناہ لے گیا کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں اور اگر کہئے کہ برابر ہیں تو میں کہتا ہوں کہ مقدمات کی پیروی میں دونوں کو برابر کیوں نہیں سمجھا گیا اور نو مقدمات کی پیروی کیوں کی گئی۔ بعض موانع ضروری اور بھی قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ ایک مانع خاص معصیت اکتساب حرام سے توبہ کرنے کا یہ بھی ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتا کیونکہ ہم کھانے کمانے کی طرح طرح کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اُن میں حلال وحرام کی تمیز بہت مشکل ہے ہاں مولویوں کو گناہ چھوڑ دینا آسان ہے کیونکہ ان لوگوں کو مفت کا ملتا ہے اس لئے بآسانی گناہ چھوڑ سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو میں وقت ترک گناہ کے لئے کہہ نہیں رہا میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب گناہ ہو جایا کرے توبہ کر لیا کرو تو گناہ کے نہ چھوٹ سکنے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ توبہ بھی نہ ہو سکے دوسرے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو کوئی ناجائز ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو ترک نہ کیا جا سکے اور یہ جو ہم کو ترک کرنا گراں معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اخراجات روزمرہ میں بعض ایسی چیزیں بڑھا لی ہیں کہ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم ان کو ضروری سمجھ رہے ہیں تو اس کا جواب وہی ہے جو کہ کسی شخص نے ایک ادھورے شاعر کو جس نے شعر میں تشدید آنے میں ضرورت کا عذر کیا تھا اُس کو جواب

دیا تھا کہ شعر گفتن چہ ضرور تو اگر بضرورت کثرت تعلقات گناہ ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ تکثیر تعلقات چہ ضرور اصل جواب تو یہی ہے لیکن یہ جواب ان لوگوں کے لئے جو کہ عالی ہمت ہوں اور دین کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح نہ دیتے ہوں کم ہمتوں کے لئے دوسرا جواب بھی ہے مگر میں اس جواب کو زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کم فہم لوگ اس سے گناہ کی اجازت نہ سمجھ جائیں مگر حاشا وکلا گناہ کی اجازت دینا ہرگز مقصود نہیں بلکہ منظور تقلیل اثم ہے حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ اگر ان کو نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی کام اٹکتا ہے بعض وہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان نہیں ہے مثلاً لباس خلاف وضع اسلامی پہننا اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی نقصان نہیں۔ اسی طرح ٹخنوں سے نیچے پاجامے پہننا کہ ان کے ترک سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہے یا مثلاً عورتیں اس قدر باریک لباس پہنتی ہیں کہ اس میں پورے طور پر ستر نہیں ہوتا تو ان باتوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان بھی نہیں ہے رشوت وغیرہ میں تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بغیر ان کے ہمارے کام چلنے دشوار ہیں لیکن ان معاصی پر لے لذت میں کیا نفع ہے اور ان کے ترک میں کیا نقصان ہے علیٰ ہذا کسی اَمرد یا اجنبی عورت کو بری نظر سے دیکھنا کہ اس میں کچھ بھی نفع نہیں نہ اس کے ترک میں کوئی ضرر۔ اگر کہو کہ صاحب نہ دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے تو یہ بالکل غلط ہے بلکہ تکلیف دینے میں ہوتی ہے کہ اول نظر پڑتے ہی قلب میں ایک سوزش پیدا ہوئی اس کے بعد جب وہ نظر سے غائب ہو گیا تو اس سوزش میں ترقی شروع ہوئی حتیٰ کہ بعض لوگوں کا اس میں خاتمہ ہو گیا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ نہ دیکھنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو تھوڑی سی تکلیف کا پھر وہ بھی چند دن کی۔ برداشت کر لینا کیا دشوار ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بہت ہی تکلیف ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر ضرر کیا ہوا کیا اس تکلیف سے تنخواہ بند ہو گئی یا کھانا بند ہو گیا ہرگز نہیں اور خود یہ تکلیف وہی کوئی معتدبہ ضرر نہیں۔ غرض ان معاصی کو تو فی الفور چھوڑ دیا جائے اور جن معاصی کو یہ زعم خود

موقوف علیہ حوائج دنیویہ کا سمجھ رکھا ہے اُن کو اگر ترک نہ کرسکیں تو روزانہ ندامت واستغفار اور یہ دعا کہ اے اللہ ہم کو اس سے نجات دے یہ تو ممکن ہے اتنا ہی کرلیا کرو یہ بے فکری وبے پروائی تو بہت بُری چیز ہے۔

ایک مانع یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ گناہ کو لذیذ سمجھتے ہیں اور اس لئے نہیں چھوڑ سکتے اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ مآل پر نظر کرے اور سوچے کہ یہ ساری لذت ایک دن ناک کے رستے نکلے گی۔ دوسرے اہل فہم کے لئے اِس کا یہ جواب ہے کہ کہنا ہی غلط ہے کہ گناہ میں لذت ہوتی ہے۔ دیکھئے اگر عادت سے زیادہ مرچیں سالن میں ڈال دی جائیں تو اگرچہ اُن میں لذت ہوگی لیکن اس لذت کے ساتھ سوزش ایسی ہوگی کہ اس کے سامنے لذت کا ادراک بھی نہ ہوگا اور اگر کچھ ادراک ہو بھی تو لذت کا ادراک تو فوراً ہی ختم ہوجائیگا لیکن سوزش بہت دیر تک باقی رہے گی اسی طرح گناہ کرنے میں گو کچھ لذت بھی ہو لیکن اس روحانی تکلیف وپریشانی کے مقابلہ میں جو کہ گناہ میں ہوتی ہے یہ لذت کچھ بھی نہیں۔ دوسرے اس لذت کا خاتمہ تو فوراً ہی ہوجاتا ہے اور اس روحانی تکلیف کا اثر مدت تک باقی رہتا ہے ہم کو التفات نہیں ورنہ معلوم ہوسکتا ہے کہ گناہ کرکے کس قدر کدورت اور طبعی توحش پیدا ہوتا ہے فوراً ہی مرتکب کی طبیعت یہ فتویٰ دیتی ہے کہ تم نے بہت بُرا کام کیا کبھی اُس کو وہ مسرت نصیب نہیں ہوتی جو کہ نیکی کرکے مثلاً نماز پڑھ کر یا روزہ رکھ کر ہوتی ہے کہ قلب میں ایک اطمینان ایک نور سا معلوم ہوتا ہے برخلاف گناہ کے کہ اس کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سر پر جوتیاں ماردیں مگر افسوس ہے کہ ہم پھر بھی باز نہیں آتے گویا جوتیاں کھانے کی عادت ہوگئی ہے جیسے چماروں کی عادت ہوجاتی ہے یا جیسے نمرود کی عادت ہوگئی تھی اور یہ تکلیف تو فی الحال ہوتی ہے پھر اس کا ایک مآل ہوتا ہے یعنی دنیا ہی میں کہ اس پر طرح طرح کی آفتیں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اکثر رزق سے محروم ہوجاتا ہے اور اُس کو بشرطِ غور معلوم بھی ہوجاتا ہے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے خوب کہا ہے ؎

ہرچہ برتو آیدت ظلمات وغم آں زبیباکی وگستاخی ست ہم
غم چو بینی زود استغفار کن غم بامر لق آمد کار کن

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے اِنَّ الْعَبْدَ یُحْرَمُ الرِّزْقَ بِخَطِیْئَۃٍ یَعْلَمُھَا (درحقیقت بندہ کے گناہ کی وجہ سے اس پر رزق بند کر دیا جاتا ہے اور بندہ اپنے گناہ کو جانتا ہے) اور کھانے کو ملے بھی تو اس کی برکت بالکل جاتی رہتی ہے اس کا سہل طریقہ مشاہدے کا یہ ہے کہ آپ دو مہینے کی رخصت لے کر اُن میں سے ایک مہینہ تو کسی ایسے شخص کے پاس گذاریے جو کہ نہایت تنعّم اور آرام میں زندگی بسر کرتا ہو اور کسی گناہ سے نہ بچتا ہو اور دیکھئے کہ ان گناہوں کی بدولت اس کے قلب کی کیا کیفیت ہے آخر بات چیت سے اُس کے انداز کا پتہ لگ ہی جائے گا خاص کر اس وقت میں جب اس پر کوئی مصیبت آئے مثلاً بیمار ہو جائے یا کسی دشمن کی مخالفت کا اندیشہ ہو اس کے بعد کسی ایسے شخص کے پاس رہیئے کہ اس کو اچھی طرح کھانے کو بھی میسر نہ آتا ہو مگر خدا کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کے قلب کی کیفیت دیکھئے خاص کر کسی مصیبت کے وقت اس کے بعد ان دونوں کی قلبی حالت کا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ سرورِ اصلی کس کے قلب میں ہے آپ پائیں گے کہ وہ فاقہ مست ہر وقت شاداں و فرحاں ہے اور یہ متنعّم ہر وقت غم و الم میں مبتلا ہے اور یہ ایسا یقینی اور بیّن فرق ہے کہ جب چاہے اور جس کا جی چاہے امتحان کر دیکھے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ یہ پریشانی کس چیز کی ہے اور وہ سرور کس چیز کا ہے ظاہر ہے کہ پریشانی نافرمانی کی اور سرور فرمانبرداری کا ہے بس نافرمانی میں لذت اور فرمانبرداری میں کلفت کہنا غلط ہوا بلکہ امر بالعکس ہے قرآن شریف میں ارشاد ہے وَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً (ہم ضرور اسی کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے) یہ تو فرمانبردار کیلئے ہے اور ارشاد ہوتا ہے فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (بیشک اس کے لئے تنگی کی زندگی ہے) یہ نافرمان کے لئے ہے غرض فرمانبرداری میں پوری راحت ہے اور راحت کا نام عیش ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر ایک امیر کبیر کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس سے

کہا جائے کہ تم اس پر راضی ہو کہ یہ تمام دولت اس غریب کو دیدو اور یہ تمہاری عوض پھانسی لے لے تو وہ یقیناً قبول کر لے گا اب بتلایئے کہ یہ قبول کیوں ہوا اس لئے کہ دولت کے بدلے میں ایک مصیبت سے نجات ہوئی اور راحت نصیب ہوئی، غرض یہ کہنا کہ لذّت کی وجہ سے گناہ نہیں چھوٹ سکتے غلط ہوا یہاں تک تو توبہ کے موانع اور اُن کے علاج کا ذکر تھا اب ایک مختصر سی فہرست اُن گناہوں کی جن میں سب مبتلا ہیں بیان کرنی باقی ہے۔

سو اول یہ سمجھے کہ دین کے پانچ جزو ہیں۔ پہلا جزو عبادات جیسے نماز، روزہ زکوٰۃ، حج وغیرہ دوسرے معاملات جیسے بیچنا خریدنا، نوکر رکھنا، رشوت لینا، سود لینا روپے کے عوض پیسے لینا یا گوٹہ ٹھپہ خریدنا وغیرہ۔ تیسرے عقائد کہ خدا کو ایک جاننا اور اس کو قادرِ مطلق ماننا سیتلا وغیرہ کے توہمات کو باطل سمجھنا وغیرہ چوتھے معاشرت کہ آپس میں میل جول کس طرح رکھیں، جب ملیں سلام کریں مصافحہ وغیرہ، پانچویں اخلاق یعنی ملکاتِ باطنہ کا درست کرنا حسد، بغض، کینہ، عداوت وغیرہ سے دل کو پاک کرنا۔ تحمل، بردباری، وقار، نرمی، خوش کلامی اپنے اندر پیدا کرنا۔ یہ پانچ حصے دین کے ہیں۔ ہمارے مسلمان بھائیوں نے دین کو صرف عبادات میں منحصر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ چاروں اجزاء کو دین سے خارج سمجھتے ہیں گویا اُن کے نزدیک بہت سی نفلیں پڑھ لینا گلے میں تسبیح ڈال لینا روزہ رکھ لینا بس اسی کا نام دین ہے۔ بعضے عبادات کے ساتھ تصحیح عقائد کو بھی دین سمجھتے ہیں۔ باقی معاملات اور معاشرت اور اخلاق کوئی شخص دین کا جزو ہی نہیں سمجھتا الا ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے دنیا کے حالات ہیں ان میں ہم جس طرح چاہیں کریں شریعت کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ یہ سب شریعت کے اجزاء ہیں اسی طرح عقائد بھی۔ ان اجزاء میں ہر جزو کے اندر بہت سے احکام ہیں مگر میں ہر ایک میں سے بطور نمونہ کے دو چار اجزاء کا بیان کر کے وعظ کو ختم کر دوں گا۔ اول عقائد کو لیجئے کہ ان میں سے بعض عقائد غلط اور خلاف واقع ہیں۔ مثلاً عورتیں بہت سی اچھی چیزوں کو بُری یا بُری چیزوں کو اچھی سمجھتی ہیں جیسے دنوں کو منحوس کہنا اکثر عورتیں بدھ

کے دن کو منحوس سمجھتی ہیں اور غضب ہے کہ بعض مرد بھی اس میں ان کے ہم عقیدہ ہیں یا مثلاً عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی دن کوّا گھر میں بولے تو اس دن مہمان ضرور آتے ہیں اسی طرح اگر آٹے میں پانی زیادہ ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ آج کوئی مہمان آنے والا ہے اکثر جانوروں کو منحوس سمجھ رکھا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قمری منحوس ہے اس کو گھر میں نہ پالو بلکہ اگر شوق ہو تو مسجد میں پالنا چاہیئے شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر اُجڑے تو اللہ ہی کا گھر اُجڑے۔ نعوذ باللہ۔

غرض جتنی چیزیں اپنے سے نکمّی ہوں سب خدا کے لئے۔ بعض عورتیں کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتی ہیں کہتی ہیں کہ یہ درخت مُردے کے کام میں آتا ہے اس لئے اس کو گھر میں نہ ہونا چاہیئے کہ شگون بد ہے اور مردے کی چارپائی کو اُس کے کپڑوں کو منحوس سمجھتے ہیں مگر تعجب ہے کہ اس کے کپڑوں کو تو منحوس سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اس کا قیمتی دوشالہ ہو یا اس کی جائداد ہو تو اس کو منحوس نہیں سمجھتے حالانکہ اگر مردے کے ساتھ تلبّس سے اُس کے لباس میں نحوست آئی ہے تو اس تلبّس سے اس کے قیمتی کپڑوں میں نحوست آنی چاہیئے اور اگر مُردے کی طرف نسبت سے ان چیزوں میں نحوست آئی ہے تو اسی نسبت سے اس کی جائداد میں بھی نحوست آنی چاہیئے یہ عقیدہ بالکل مہمل اور وہم ہے مسلمانوں میں اس کا رواج ہندوؤں سے آیا اور بعض چیزوں کو مرد بھی منحوس سمجھتے ہیں جیسے اُلّو کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ جس مقام پر بولتا ہے وہ مقام ویران ہو جاتا ہے اس لئے وہ منحوس ہے حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے نہ الّو منحوس ہے نہ اس کے بولنے سے کوئی جگہ ویران ہوتی ہے یاد رکھو وہ جو بولتا ہے تو خدا کا ذکر کرتا ہے تو کیا خدا کے ذکر سے یہ نحوست آئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ذاکر تو ہے لیکن اس کا ذکر جلالی ہے اس لئے اس کا یہ اثر پڑتا ہے حالانکہ خود یہ تقسیم اور یہ کہ جلالی میں یہ خاصیت ہوتی ہے یہی بے اصل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ الّو ایسے مقام کو تلاش کرتا ہے جہاں یکسوئی ہو اور اس کو اندیشہ نہ رہے اس لئے وہ ویرانوں میں بیٹھتا ہے اب یہ دیکھئے کہ وہ ویرانی جو پہلے سے ہے کہاں سے آئی سو وہ ہم لوگوں کے گناہ اور اعمال بد کی وجہ سے ہوتی ہے اُس کے

بعد کو اُس مقام پر آتا اور بولتا ہے بس ویران کن ہم اور ہمارے گناہ ہوئے نہ کہ الو اور جب یہ ہے تو منحوس گنہگار ہوئے الو کیوں منحوس ہوا بعض پڑھے ہوئے لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے اِستدلال کیا ہے دن کے منحوس ہونے پر وَ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ الخ (اور ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو ان کے حق میں منحوس تھے) کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں عاد پر عذاب نازل ہوا ہے وہ دن منحوس ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ دِن کون کون ہیں اِس کا پتہ دوسری آیت کے ملانے سے چلے گا فرماتے ہیں کہ وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (اور قوم عاد کو ہلاک کر دیا گیا تیز و تند ہوا کے ذریعہ جو ان پر سات رات اور آٹھ روز مقرر کر دی گئی تھی) کہ آٹھ دن تک ان پر وہ عذاب رہا۔ تو صاحبو! اس اعتبار سے تو چاہیئے کہ کوئی دن مبارک ہی نہ ہو بلکہ ہر دن منحوس ہو کیونکہ ہفتہ کے ہر دن میں اُن کا عذاب پایا جاتا ہے جن کو ایام نحسات کہا گیا ہے تو کیا اس کا کوئی قائل ہو سکتا ہے۔ اب آیت کے صحیح معنے سنئے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان پر جن ایام میں عذاب ہوا وہ ایام بوجہ نزولِ عذاب خاص اُن کے لئے منحوس تھے نہ کہ سب کے لئے اور وہ عذاب تھا بوجہ معصیت کے پس مدار نحوست کا معصیّت ہی ٹھیری اب بحمد اللہ کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں نے قرآن شریف کی دوسری آیت سے استدلال کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نحوست ہمیشہ کے لئے ہے قرآن شریف میں ہے فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (منحوس دن میں آندھی چلائی) مگر میں کہتا ہوں کہ مستمر کے دو معنی ہیں ایک دائم دوسرے منقطع۔ دوسری تفسیر پر یہ معنی ہونگے کہ وہ نحوست منقطع ہو گئی اور یہ قاعدۂ عقلی ہے کہ اِذَا جَآءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ (جب کسی چیز میں شک پیدا ہو جائے تو اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں) اور اگر کسی کی خاطر سے ہم مان

بھی لیں کہ مستمر کے معنی دائم ہی کے ہیں تو ہم وہی پہلا جواب دیں گے کہ نحس سے مراد نحس علیہم ہے اور ان کے حق میں بوجہ عذاب کے دائم ہونے کے وہ یوم ہمیشہ ہی کے لئے منحوس ہے۔ غرض یہ اعتقاد کہ چیزوں میں نحوست ہے غلط ہے۔

ایک ہندو کا ایک قصہ یاد آگیا جو مجھ سے ایک معتبر راوی نے کہا کہ وہ شہر بھر کے وہ گھوڑے جن کو منحوس سمجھ کر مالک بیچ دیتے تھے ارزاں خرید لیتا تھا اور ان کو خوب نفع سے بیچتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مجھ کو اُن کی نحوست نہیں لگتی۔ بعضے لوگ اگر کسی عورت کی جیب کالی ہو تو اس کو منحوس سمجھتے ہیں اس کا نام رکھا ہے کال جیبی یہ بھی لغو ہے۔ صاحبو! یہ جو کچھ نحوست ہے بدولت معاصی کے ہمارے اندر ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کو اپنے اندر نہیں نظر آتی دوسروں میں نظر آتی ہے۔ ہماری وہ حالت ہے جیسے ایک حبشی چلا جاتا تھا رستے میں دیکھا کہ ایک آئینہ پڑا ہوا ہے اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر آئی بہت خفا ہوا اور غصے میں آکر اس کو زمین پر پٹک دیا اور کہنے لگا کہ ایسا بد صورت تھا تب تو کسی نے یہاں پھینک دیا۔ ایک اور دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا اتفاق سے ایک ٹکڑا پانی کی بدھنی میں گر گیا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر آئی باپ سے کہنے لگا کہ ابا جان اس نے ہمارا ٹکڑا لے لیا۔ ابا جان نے جو لوٹے میں دیکھا تو اپنی صورت نظر پڑی آپ نے سمجھا کہ یہی ہوگا جس نے ٹکڑا چھینا تو آپ فرماتے ہیں کہ سفید ڈاڑھی مُنہ پر لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے شرم تو نہ آئی آخر غصے میں آکر لوٹے کا پانی گرا دیا پھر جو دیکھا تو ٹکڑا موجود ہے مگر صورت ندارد، تو آپ فرماتے ہیں کہ اگرچہ غاصب تھا مگر تھا حیا دار دیکھو ٹکڑا ڈال کر غائب ہوگیا۔ بعینہٖ یہی ہم لوگوں کی حالت ہے کہ اپنے عیوب دوسروں میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ نحوست اپنے اندر ہے کہ گناہ پر گناہ کرتے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ الو منحوس ہے اور قمری منحوس ہے۔ ایک گناہ عقیدے کے

متعلق عورتیں یہ کرتی ہیں کہ ٹونے ٹوٹکے کرتی ہیں افسوس ہے کہ نہ شریعت کا لحاظ ہے نہ خدا کا خوف ہے۔

ایک گناہ عقیدے کے متعلق یہ ہے کہ اکثر عورتیں منت مانتی ہیں کہ اگر ہمارا یکام ہو جائے تو ہم فلاں بزرگ کی نیاز دیں گے اور کہا جاتا ہے کہ ہم تو ایصال ثواب کرتے ہیں اور ایصال ثواب میں کیا حرج ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے وہاں محض ثواب پہنچانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس فعل سے یہ خوش ہوں گے اور چونکہ یہ خدائی کارخانے میں دخیل ہیں اس لئے ان کی خوشی سے ہمارا کام پورا ہو جائے گا۔

سو بیبیو! یاد رکھو کہ خدائی کارخانے میں کوئی دخیل نہیں ہے نہ وہاں کسی کا کچھ اثر ہے۔

ایک گناہ عقیدے کے متعلق یہ ہے کہ عورتیں قریب کل کے اور اکثر مرد بھی نکاحِ ثانی کو بُرا سمجھتے ہیں اور افسوس ہے کہ بعض لکھے پڑھے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب نکاح ثانی فرض نہیں تو نکاح اول فرض ہے اور اگر نہیں ہے تو نکاح اول کے ساتھ یہی معاملہ کیوں نہیں کیا جاتا اگر اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے تو خیر مولویوں کے کچھ تو آنسو پچھ جاتے۔ کیا وجہ ہے کہ نکاح اول کے لئے تو اس قدر کوشش کی جاتی ہے کہ اگر لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہو جاوے اور کہیں سے پیام نہ آئے تو فکر پڑ جاتی ہے اور اس کے تذکرے کئے جاتے ہیں ہاں اگر کسی عورت پر شوہر اول کا بہت رنج غالب ہو یا اس کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے ہوں کہ ان کی پرورش کا انتظام نکاح کے بعد دشوار ہو یا بچوں کی جائیداد وغیرہ موجود ہو کہ اس کا انتظام اس کے سپرد ہو تو البتہ ایسی عورت کو اجازت ہے کہ وہ نکاح نہ کرے بشرطیکہ مرد کی بالکل خواہش نہ ہو لیکن اگر کوئی مانع بھی نہ ہو اور پھر بھی عرف کی شرم کی وجہ سے نکاح ثانی نہ کرے اور اس کو عیب سمجھے تو سخت گناہ ہے بعض مقامات پر اس قدر جہالت ہے کہ اگر منگنی کے بعد لڑکے کا انتقال ہو جائے تب بھی نکاح نہیں کرتے اور لڑکی کو بٹھلائے رکھتے ہیں یہ سخت جہالت ہے۔ اور عورتوں سے زیادہ مردوں کی حالت

پر افسوس ہے کہ وہ باوجود ذی عقل ہونے کے بھی اس کو عیب سمجھتے ہیں اور بعضے مرد اگرچہ زبان سے اس کو برا نہیں کہتے لیکن ایسی عورت کو جس نے دوسرا نکاح کرالیا ہو ذلیل سمجھتے ہیں اوران کے دل میں اس کی اتنی عزت نہیں ہوتی جتنی اس عورت کی جو کہ ساری عمر بیوہ بنی بیٹھی رہے علماء اس بارے میں جتنی کچھ کوشش کرتے ہیں ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں کے دل سے اس کے عیب سمجھنے کا خیال نکل جائے یہ تو مختصر سی فہرست عقائد کے متعلق تھی۔ اب عبادات کو لیجئے کہ ان میں بھی بہت سی باتوں میں کوتاہی ہورہی ہے۔ مثلاً عورتیں اکثر تو نماز ہی نہیں پڑھتیں اور یہ عذر کرتی ہیں کہ ہم کو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ہوتی میں کہتا ہوں کہ ان عذر کرنے والوں کو اگر عین کام کے وقت پیشاب کی ضرورت اس شدت سے ہو کہ اس کو روک ہی نہ سکیں اور اتفاق سے بیت الخلاء میں جانے کے بعد بند پڑجائے تو اس صورت میں یہ کیا کریں آیا اس وقت تک کہ جب تک پیشاب سے فراغت ہو کام کا حرج کریں یا نہیں ظاہر ہے کہ مجبوراً کام کا حرج کرنا پڑے تو کیا خدائی حکم کی اتنی ضرورت بھی نہیں جتنی کہ طبعی تقاضوں کی اور بعض عورتیں اگر نماز پڑھتی بھی ہیں تو بہت ہی دیر کرکے اور مکروہ وقت میں اور پھر اس قدر جلدی کہ نہ قیام درست نہ رکوع ٹھیک گویا ایک قید ہے کہ جس طرح بنے اس سے چھوٹیں۔ بیبیو! اگر زیادہ ہمت نہیں ہے تو خیر نفلیں نہ پڑھا کرو لیکن فرائض وسنن میں تو کتر بیونت نہ کیا کرو ان میں تو ارکان کی تعدیل کا لحاظ ضرور کرلیا کرو۔ اسی طرح زکوٰۃ دینا حج کرنا اس میں عورتیں بہت سستی کرتی ہیں یاد رکھو کہ جس مال پر زکوٰۃ نہیں دی جاتی وہ قیامت کے دن سانپ کی شکل بن کر ڈسیگا۔

اب معاملات کو سنئے ان میں بھی بہت زیادہ گڑبڑ کر رکھی ہے مثلاً عورتیں اکثر گیہوں کے آٹے سے چنے یا مکئی کا آٹا بدلتی ہیں مگر ان کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے بدلنے کا کیا طریقہ ہے اس میں بعض صورتیں ایسی ہیں کہ اُن کے بدولت یہ لین دین سود کا لین دین ہو جاتا ہے اور اس سے سود کا گناہ ہوتا ہے یہ مثال میں نے اس لئے بیان کی کہ ہم کو معلوم ہو کہ کھانے پینے میں بھی مسائل شرعیہ کے جاننے کی ہم کو ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ مردوں کو بھی ان مسائل سے آگاہی نہیں اور لیجئے عورتیں زیور بنواتی ہیں اور خرید کرتی ہیں۔ اس میں

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پرانے زیور سے نیا زیور بدلا گیا اور فرض کیجئے کہ نیا تو بارہ تولہ ہے اور پرانہ پندرہ تولہ ہے اور اس بارہ تولہ کو بیس تولہ کی عوض میں لیا گیا تو یہ معاملہ سود کا معاملہ ہو گیا۔ اسی طرح اکثر چاندی کا زیور روپے سے خریدا جاتا ہے اس میں بھی بہت گڑبڑ کی جاتی ہے۔

صاحبو! ان میں سخت ضرورت ہے مسائل دین کے سیکھنے اور معلوم کرنے کی بتلایئے کہ جب بدن پر ناجائز مال لپٹا ہوا ہوگا تو نماز روزے کی توفیق اور اعمال صالحہ کی ہمت کیونکر ہو گی۔ اسی طرح سفر ریل میں اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی اس قدر اسباب لیجاتے ہیں کہ وہ حدِ اجازت سے زیادہ ہو جاتا ہے اور نہ اس کا محصول دیتے ہیں نہ اس کو وزن کراتے ہیں اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود تو تیسرے درجے کا ٹکٹ لیا تھا لیکن اتفاق سے درمیانہ درجے میں کوئی دوست بیٹھا ہے اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور دو تین اسٹیشن تک اس میں بیٹھے چلے گئے۔ یا ٹکٹ لیا دو تین اسٹیشن کا اور چلے گئے بہت دور تک ان سب صورتوں میں یہ شخص ریلوے کمپنی کا قرضدار رہتا ہے اور قیامت کے دن اس سے وصول کیا جائے گا۔ اگر کبھی ایسی غلطی ہوگئی ہو تو اس کا سہل طریقہ ادا کرنے کا یہ ہے کہ حساب کر کے جس قدر قیمت ریلوے کی اپنے ذمہ نکلے اس قیمت کا ایک ٹکٹ خرید کر اس سے کام نہ لے اس سے کمپنی کا روپیہ بھی ادا ہو جائے گا اور اس شخص پر کوئی الزام بھی نہ آئے گا۔ اب معاشرت کو لیجئے کہ اس میں لوگوں سے بہت گناہ ہو جاتے ہیں آجکل نوجوانوں نے اہل یورپ کی تقلید کو تہذیب اور انسانیت سمجھ رکھا ہے صاحبو! قرآن و حدیث کو دیکھو تو معلوم ہو کہ تمہارے مذہب کی برابر تہذیب اور شائستگی دنیا کے کسی مذہب اور کسی فرقے میں نہیں ہے علیٰ ہذا عورتوں کی معاشرت بالکل خراب ہے اکثر عورتوں میں پردہ بہت ہی کم ہے اور سر تو ان کا ہمیشہ ہی کھلا رہتا ہے خصوصاً آدھا سر تو گویا ڈھانپنا ان کو ضروری ہی نہیں ہے اکثر عورتیں زیور ایسا پہنتی ہیں جس میں آواز پیدا ہوتی ہے یاد رکھو ایسا زیور پہننا جائز نہیں ہے ہاں آپس میں لگ کر بجے اور قدم بھی آہستہ سے رکھا جائے کہ اس میں زیادہ آواز پیدا نہ ہو تو جائز ہے۔ عورتوں میں ایک مرض یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو بالکل میلی کچیلی خراب حالت میں رہیں گی اور جب برادری میں جائیں گی تو خوب بن

سنور کر بلکہ پڑوس تک کا زیور بھی مانگ کر لیجاینگی اور بجتا ہوا زیور ضرور پہنیں گی۔ اور پھر اس پر اس قدر توجہ ہے کہ ہر عورت سے مجمع بھر کی عورتوں کا زیور اُن کا لباس سب ایک ایک کر کے دریافت کر لیجئے گویا اس فہرست لینے ہی کے لئے یہ اُس مجمع میں گئی تھیں۔ اسی طرح لباس ایسا بیہودہ پہنتی ہیں کہ اس میں ذرا بھی پردہ نہیں ہوتا اور سارا بدن جھلکتا ہے اور ایک جز معاشرت کا یہ ہے کہ عورتیں سلام شریعت کی تعلیم کے بالکل خلاف کرتی ہیں بعض عورتیں تو صرف سام کہتی ہیں گویا اس قدر تخفیف کہ چار حرف بھی پورے زبان سے نہ نکلیں اور اس سے بھی زیادہ لطف یہ کہ جواب دینے والی سارے کنبے کی فہرست گنوادیگی کہ بھائی جیتا رہے اور بیٹا زندہ رہے اور شوہر خوش رہے لیکن ایک لفظ وعلیکم السلام نہ کہا جائیگا وغیرہ وغیرہ۔ اب رہے اخلاق ان کو تو کوئی جانتا ہی نہیں بس یہ سمجھتے ہیں کہ نرمی باتیں کر لینا یہی اخلاق ہے۔ صاحبو! اخلاق کہتے ہیں ملکاتِ باطنہ کو مثلاً اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا اعمال میں ریا نمونہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آجکل تواضع کی شکل میں تکبر ہوتا ہے یعنی بہت سے لوگ صورت تواضع اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ لوگ اُن کی اور زیادہ تعریف کریں مثلاً کہتے ہیں کہ صاحب میں تو کوئی چیز نہیں ہوں اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ میں سب کچھ ہوں یہ صرف اس لئے کہہ رہا ہے کہ سننے والے زیادہ تعریف کریں گے اور اس کا امتحان کہ ان الفاظ سے واقعی تواضع مقصود ہے یا محض تصنع اور بناوٹ ہے یہ ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ میں تو نالائق ہوں سامع بھی اگر اس کی موافقت کرے اور کہے کہ واقعی آپ نالائق ہیں تو پھر دیکھئے اِنکی کیا حالت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کی بالکل وہ حالت ہے کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو (میں تجھ کو حاجی کہوں تو مجھے حاجی کہہ) غرض اخلاق کی اصلاح کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے اس وقت زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ میں اس کے متعلق بہت سی جزئیات بیان کرتا۔ بس یہ پانچ قسم کے گناہ ہیں جنکی اصلاح کی ہم کو ضرورت ہے ان کے علاج کا خلاصہ یہ ہے کہ اول احکام کو معلوم کرو دوسرے عمل کا قصد پختہ کرو تیسرے قصد کے پختہ کرنے کیلئے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو لیکن عورتیں چونکہ پردہ نشین ہیں اس لئے وہ اس کیجائے اہل اللہ کی حکایات دیکھا کریں خاصکر بزرگ عورتوں کی حکایتیں کہ ان سے بہت کچھ اثر ہوگا اور بہت قوی ہوگی اس سے تمام گناہ چھوٹ جائیں گے اور خدا تعالیٰ کی طرف کامل توجہ ہو جائیگی اور اس کے بعد تم اس کے مخاطب ہو سکو گے۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (قریب ہے کہ آپ کا رب ان کے گناہوں کو بدلدے اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کردے جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں)

اب خدا سے دعا کرو کہ وہ توفیق دے۔ آمین

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوّم کا

نواںؔ وعظ ملقب بہ

تکمیلُ الاِسلام

(منجملۂ ارشادات)

حکیمُ الاُمّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

محمد عبد المنّان غُفِرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔اے جناح روڈ) کراچی ا

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

نواں وعظ ملقب بہ

تکمیل الاسلام

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
کراچی بندرگاہ مدرسہ حسن علی	شب ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹے	کھڑے ہو کر	تکمیل اسلام	مولوی سعید احمد صاحب	تقریباً ۳۵۰	اکثر معززین دنیا اور ایک انگریز پرنسپل اور کئی بزرگ علماء موجود تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَسَلَّمَ۔ **اَمَّا بَعْدُ** فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ

اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ
بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ۭ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ
تَھْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ۭ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَکُوْنُوْا
کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ۭ
وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۙ یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا
الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ
اللّٰہِ ۭ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۝ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ۭ
وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِی الْاَرْضِ ۭ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

(مومنو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔ اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح خدا تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بین کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف و) اختلاف کرنے لگے

یہ وہ لوگ ہیں جن کو (قیامت کے دن) بڑا عذاب ہوگا۔ جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں گے (اُن سے خدا فرمائے گا) کیا تم ایمان لاکر کافر ہو گئے تھے؟ سو (اب) اس کفر کے بدلے عذاب (کے مزے) چکھو، اور جن لوگوں کے منہ سفید ہوں گے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ خدا کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو صحت کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں اور خدا اہل عالم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ اور سب کاموں کا رجوع (اور انجام) خدا ہی کی طرف ہے)

صاحبو! قبل اس کے کہ میں ان آیات کے متعلق کچھ بیان کروں دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ میرے بیان کے متعلق ابھی جو کچھ کہا گیا ہے[1] یہ محض ان حضرات کا حسن ظن ہے۔ نیز اشتہار[2] میں میرے متعلق جو الفاظ لکھ دیئے ہیں یہ بھی ان حضرات کے حسن ظن کا ثمرہ ہے ورنہ میں اپنے کو ان الفاظ کا مستحق نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے ساتھ ہی جب یہ سوچتا ہوں کہ حدیث میں اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ۔ (تم دنیا میں اللہ کی طرف سے گواہ ہو) فرمایا گیا ہے حتیٰ کہ مسلمان اگر کسی کے متعلق حسن ظن سے کچھ کہہ دے تو حق جل و علا شانہٗ اس کی برکت سے تصدیق شہادت کے لئے اس کو کسی اچھے درجے پر پہونچا دیتے ہیں تو میں اس نعمت پر خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں دوسرا امر یہ ہے کہ اگرچہ میں نے پورا رکوع تلاوت کیا ہے مگر میں مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ زیادہ بیان کرنے میں لوگوں کا حرج ہوگا خاص کر ایسے لوگوں کا جو اپنے اوقات کے پابند ہیں۔ دوسری بات کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ وعظ درحقیقت

---

[1] قبل شروع وعظ ایک صاحب نے اس کی اطلاع مجمع کو دی تھی کہ ایک ایسا ایسا وعظ ہونے کو ہے۔

[2] دن میں اس وعظ کا ایک اشتہار بھی دیا گیا تھا۔

امراض روحانی کا علاج ہوتا ہے یعنی اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ امراض روحانی کی تشخیص کی جائے اور پھر ان کا علاج بتلا دیا جائے ۔ میں نے اس لئے عرض کر دیا تاکہ سامعین کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ وعظ سننے کے وقت کیا نیت رکھیں۔ اور وجہ اس کے عرض کی یہ ہوئی کہ تتبع احوال سے یہ معلوم ہوا کہ سامعین کی اغراض وعظ سننے سے مختلف ہوتی ہیں اور اسی طرح واعظ کی بھی مختلف نیتیں ہوتی ہیں میں اپنا تبریہ اغراض فاسدہ سے نہیں کرتا۔ لیکن بحمداللہ مجھے اس پر تنبیہ ہو جاتا ہے اور لغزش ہو جانے سے میں استغفار کر لیتا ہوں۔ واعظین کے متعلق کہنا تو اس وقت فضول ہے کیونکہ یہ مجمع واعظین کا نہیں ہے ہاں سامعین کی اغراض کے متعلق دو چار جملے کہدینا خالی از فائدہ نہ ہوگا وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی غرض تو وعظ کے سننے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ واعظ کے بیان سے قابل اعتراض اجزاء کو انتخاب کریں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں بعضوں کی نیت یہ ہوتی ہے کہ تقریر سے لذت حاصل کریں گے۔ صاحبو! اس میں شک نہیں کہ اللہ جل شانہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اور اس کی شرح میں لذت ضرور ہے لیکن ہر ایک چیز کا اصلی موضوع لہٗ علٰحدہ ہوتا ہے سو یہ دیکھو کہ اس کلام کی اصلی غرض کیا ہے لذت یا اور کچھ سو اس کی نسبت ارشاد ہے کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔ اس میں خدا تعالیٰ نے تصریحاً فرمادیا کہ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم اور عمل کا فائدہ حاصل کریں لِيَدَّبَّرُوْٓا میں علم کی طرف اشارہ ہے اور لِيَتَذَكَّرَ میں عمل کی طرف۔ بعضوں کی غرض یہ ہوتی ہے اور یہ بظاہر اور اغراض سے اسلم ہے کہ ہم کو اس مجلس کی شرکت سے ثواب ہوگا سو خوب سمجھ لو کہ اگرچہ شرکت فی الوعظ سے ثواب لازم آجائے اور اس پر مرتب ہو جائے لیکن اصلی غرض یہ بھی نہیں ہے جیسا کہ اور آیت سے معلوم ہوا ثواب کے لئے دوسرے کام بہت ہیں نماز روزہ تلاوت قرآن اگرچہ بے سمجھے ہی تلاوت ہو تو نفس ثواب

کے لئے کچھ ضرورت نہیں کہ قطع مسافت کر کے گھر سے مجلس وعظ تک آتے وقت صرف کرے پس معلوم ہوا کہ وعظ کی غرض اصلی یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ مجھ میں کیا کیا مرض ہیں جتنے امراض وعظ میں بیان کئے گئے ہیں ان میں سے میرے اندر کتنی باتیں پائی جاتی ہیں اور جو پائی جاتی ہیں ان کا علاج کیا ہے اس مقصود کے سوا باقی سب خیالات غیر اصلی ہیں اور جب یہ ہے تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اگر کسی وعظ میں ذرا بھی لذت نہ آئے تو اس کی پروانہ کرنی چاہیے دیکھئے آپ نے کبھی طبیب سے نسخہ لکھوا کر یہ انتظار نہ کیا ہوگا کہ آپ کو اس میں لذت بھی آئی یا نہیں۔ البتہ اگر کوئی صاحب فن خود نسخے کو دیکھ کر اس طرح لذّت یاب ہو کر کیسی دقائق کی رعایت اس میں رکھی گئی ہے تو دوسری بات ہے باقی اصلی غرض نسخے سے یہی ہوتی ہے کہ مرض وعلاج متعین ہو جائے اور علاج کرنے سے مرض کا قلع قمع ہو جائے بس یہی غرض وعظ میں بھی ہونی چاہیئے کہ ہم میں کیا کیا امراض ہیں اس کے سوا ساری اغراض کو فراموش کر دینا چاہیئے۔ بالکل یہ حالت ہونا چاہیئے کہ ؎

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　　الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(ہم نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا مگر دوست کی باتیں کہ جن کو بار بار دہراتا رہتا ہوں)

حقیقت میں بڑی بات یہی ہے اور قرآن مجید میں جو قصص مذکور ہیں ان سے بھی یہی غرض ہے کہ لوگ سابقین کی حالت پر اپنی حالت کو قیاس کریں اور دیکھیں کہ اُنھوں نے کیا کیا اور اس کا کیا ثمرہ ان کو ملا اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم کو بھی وہی ثمرہ حاصل ہوگا۔ تو اب معلوم ہوگیا ہوگا کہ وعظ کی اصلی غرض کیا ہے یعنی جو کچھ بیان ہو اس کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھنا اور میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اس بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھئے اس وقت جو کچھ خرابیاں ہو رہی ہیں وہ سب اسی سبب سے ہیں کہ ہم اپنی حالت کو نہیں دیکھتے جو کچھ سنتے ہیں اس مصداق دوسروں کو سمجھتے ہیں یہ کبھی احتمال بھی نہیں ہوتا کہ ہم میں بھی یہ امراض ہوں گے۔

بس اب اپنا بیان شروع کرتا ہوں اور اول اجمالاً یہ بتلا ئے دیتا ہوں کہ اس وقت جو مضمون میں بیان کروں گا وہ کیا ہے سو وہ یہ ہے کہ اسلام حقیقی کیا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ہم جو کہتے ہیں اَنَا مُسْلِمٌ آیا یہ سچ ہے یا نہیں کیونکہ محض زبان سے کہہ لینے سے اسلام نہیں حاصل ہو سکتا ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوٰی ولکن لایخفٰی کلام المنافق

(عشق میں محبت کا دعویٰ کرنا جائز ہے مگر منافقوں کی بات چھپی ہوئی نہیں رہتی)

اس میں شک نہیں کہ آجکل مسلمان بیدار ہیں اکثر کو اپنے اسلام کی طرف توجہ ہے غفلت کی شکایت اب بہت کچھ دور ہو گئی ہے لیکن نرا تنبہ مفید نہیں جب تک کہ اس کی حقیقت معلوم نہ ہو دیکھو اگر ایک شخص کو یہ معلوم ہو کہ مال کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے لیکن نہ اس کی حقیقت معلوم ہو اور نہ ذریعۂ تحصیل تو کیا نرا احساس ضرورت مال حاصل کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا ہرگز نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مال کی حقیقت بتلا دی جائے ممکن ہے کہ ایک شخص ایک پیسے کو بھی مال سمجھتا ہو اور ایک پیسہ کما کر اپنے کو مالداروں کی فہرست میں شمار کرنے لگے کیا کوئی شخص اس کو مال دار سمجھے گا یا یوں کہا جائے گا کہ اس کو جنوں ہو گیا ہے۔ پیسہ بھی کوئی مال ہے۔ حالانکہ اَدْنٰی مَا یُطْلَقُ عَلَیْہِ اِسْمُ الْمَالِ (کم سے کم درجہ میں جس کو مال کہا جا سکے پیسہ بھی ہے۔ لیکن یہاں دقائق فلسفیہ کا لحاظ نہیں ہوتا یوں تو ہر شخص اپنے کو مال دار سمجھ سکتا ہے لیکن مال کی حقیقت معتبرہ معلوم کرنے کے بعد وہی مالدار سمجھا جائے گا جس کے پاس معتدبہ مقدار مال کی موجود ہو ورنہ وہی حال ہو گا کہ ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

پس اسی طرح حالت موجودہ میں کہ بہت سے اعمال دین سے ہم متروک ہیں ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم مسلمان ہیں ایسا ہی دعوےٰ ہے جیسا کہ اس شخص کا ایک پیسہ کما صاحب مال ہونے کا دعوےٰ تھا پس جس طرح اس کو مجنوں کہا گیا ہم کو بھی مجنوں

کہا گیا ہم کو بھی مجنوں کہا جائے گا۔ البتہ ہمارا دعویٰ اس وقت قابل التفات ہوگا کہ جب ہمارے پاس اُس حد تک ایمان ہو کہ اس غرض علی وجہ الکمال حاصل ہو سکے اور دیکھئے میں خدا تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت پر متنبہ کرتا ہوں یعنی اس تقریر کا مقتضا تو یہ تھا کہ ناقص الایمان کو مؤمن ہی نہ کہا جاتا جیسا کہ ایک پیسے کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا تھا چنانچہ خوارج اور معتزلہ نے ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہا پھر معتزلہ تو اس کو ایمان سے خارج کرتے ہیں لیکن کافر نہیں کہتے اور خوارج تو بالکل کافر ہی کہتے ہیں اب دیکھئے اہل سنت والجماعت نَصَرَهُمُ اللهُ کو کہ انھوں نے شارع کی نصوص رحمت کو سمجھ کر ایسا حکم نہیں کیا۔ اس پر مجھے بطور جملہ معترضہ کے ایک ضروری بات یاد آئی یعنی ہم میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ نصوص کو عقل پر منطبق کرتی ہے اور اصل رہبر عقل کو قرار دیتی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ رائے بڑی معیبت کی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عقل آپ کی اتنی خیرخواہ نہیں ہے وحی جیسی ہے دیکھئے عقل آپ کی ایسی دشمن نکلی کہ ایک نافرمانی میں کافر بنا دیا جس کی اوپر تقریر ہوئی۔ اب وحی کے خواص کو دیکھئے کہ باوجود آپ کی نافرمانی کے ارشاد ہے کہ لاتکفرہ بذنب ولاتخرجہٗ عَنِ الْاِیْمَانِ (کافر کہے ان کو گناہ کی وجہ سے اور خارج کہے ان کو ایمان سے) اور دو جملے ارشاد فرمانے کی ایک وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جملہٗ اول سے خوارج کا رد فرمانا منظور ہے اور جملہ ثانیہ سے معتزلہ اور خوارج دونوں کا۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے کتنے خیرخواہ ہیں اور آپ کی عقل کس قدر دشمن ہے اسی لئے خدا تعالےٰ فرماتے ہیں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے لئے ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں) کیا معنے کہ ہمارے نفس نے تو عقل کے مشورے سے ایک نافرمانی سے کفر کا فتوٰے دے دیا تھا اس قاعدے سے کہ ناتمام ذخیرے پر تموّل کا حکم نہیں کیا جاتا جیسا کہ اوپر کی مثال سے معلوم ہوا۔ اس طرح ایمان ناقص پر بھی ایمان کا حکم نہ کیا جائے گا۔ یہ تو عقل کا فتویٰ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود گناہ میں مبتلا دیکھنے کے بھی مسلمان ہی فرمایا

تو معلوم ہوا کہ شریعت ہم سے زیادہ ہماری خیر خواہ ہے لہذا اب یوں کہنا چاہیئے اور یہی مذہب رکھنا چاہیئے کہ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے اپنی عقل کو جو بہت دور کی سوچنے والی ہے خوب ہی آزمایا پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنا نا ہی مناسب سمجھا)

یعنی عقل کا تو امتحان کرلیا وہ تو مخالف ثابت ہوئی اب دیوانۂ وحی رہنا چاہیئے اور اس دیوانگی کے واسطے یہ کہنا چاہیئے کہ ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر محتاج اور پاگل سے بنے ہوئے ہیں تو اس ساقی اور اس پیمانہ پر ہی مست ہیں)

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

(دیوانہ اور پاگل تو در اصل وہی ہے جو اس کا عاشق نہیں ہوا اور عقل مند در اصل وہی شخص ہے جو اپنی عقل پر چلنے کی بجائے محبت سے اطاعت کرے)

یہ وہ دیوانگی ہے کہ اس پر ہزار فرزانگی قربان ہے۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ جیسے مالدار وہ ہے کہ اس کے پاس اصلی ذخیرہ ہو ایسے ہی اسلام کا دعوے اس کو زیبا ہے کہ اس کے پاس کامل ایمان ہو ورنہ ہمارا دعویٰ ایسا ہے جیسے اس ایک پیسے والے کا اور مثال لیجئے۔ حسین اس کو کہیں گے جس کی آنکھ ناک سب درست ہو اور جس کی یہ حالت ہو کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے لیکر پاؤں تک اور چوٹی سے لیکر ایڑی تک جہاں سے بھی دیکھتا ہوں اس کی کشش دل کو اپنی طرف کھینچے لیتی ہے کہ یہی جگہ دیکھنے کے قابل ہے)

ورنہ اگر کسی کی ناک کاٹ لی جائے اور وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر آئے تو کتنا حسین

معلوم ہوگا لیکن کوئی ہاتھ ہٹا دے تو پھر دیکھئے کتنا پژمردہ ہوتا ہے۔ تو جیسا ایک حسن ظاہری ہے ویسا ہی ایک حسن باطنی بھی ہے جب ہر صفت کمال کے ساتھ ہوگی اس وقت حسین اور معلم کہیں گے ورنہ اس کا حسن باطنی اور اسلام ایسا ہے جیسے آپ کسی دوست سے کہیں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ ایک مدت کے بعد آپ کے پاس ایک آدمی کو ایک چارپائی پر لاد کر لایا جتنے امراض ہیں قریب قریب سب میں مبتلا ہے آنکھیں بھی نہیں کان بھی نہیں ہاتھ پیر بھی بیکار ہیں فاتر العقل بھی ہے البتہ جاندار ہے کہ اگر اس کو کوئی قتل کر دے تو قانوناً اس کو پھانسی ہو جائے مگر کیا اس آدمی سے آپ کی غرض پوری ہو سکتی ہے ہرگز نہیں کیا آپ تعجب سے نہ پوچھیں گے کہ اس کو کیوں لائے ہو اب اگر وہ دوست یہ کہے کہ آپ کے واسطے لایا ہوں آپ نے فرمائش کی تھی کہ ایک آدمی لا دو۔ تو آپ ہنسیں گے اور کہیں گے کہ اگرچہ یہ لغۃً اور قانوناً آدمی ہے لیکن جب اس سے میری غرض حاصل نہیں تو میرے لئے تو یہ آدمی نہیں ہے جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب دیکھئے کہ اسلام سے کیا غرض ہے آیا نجات کاملہ یا محض ایک قومی شعار بنانا جیسا کہ آج کل کے عقلاء نے سمجھ رکھا ہے کہ غرض مذہب سے صرف یہ ہے کہ اس سے ہماری ایک قوم بن جائے اور ہمارے اندر ایک اجتماع کی شان پیدا ہو جائے جیسا کہ اس وقت اکثر لوگوں نے یہی غرض سمجھی ہے مذہب کی حیثیت سے بہت کم لوگ اس پر متوجہ ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں مذہبی رنگ نہیں ورنہ اگر مذہب کے لحاظ سے متوجہ ہوتے تو مذہبی رنگ بھی ان میں ضرور پیدا ہوتا۔ میں ایک انجمن میں بلایا گیا اس کی حالت جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نہ اس کے ممبروں کی آمدنی شریعت کے موافق ہے نہ اعمال ان کے درست ہیں ترک صلوٰۃ و شرب خمر تک میں بعضے مبتلا ہیں میں نے داعی سے کہا کہ غرض اہل انجمن کی خیر خواہی قوم بیان کی جاتی ہے لیکن اگر وہ خیر خواہ قوم ہیں تو اپنے خیر خواہ کیوں نہیں اور جب انھوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو کیسے مان لیا جائے کہ ان کو قوم پر توجہ ہے۔ صاحبو! میں لیڈران قوم کو متوجہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ اپنی اصلاح

نہ کریں گے اس وقت تک، ان کی خیر خواہی کسی درجے میں مؤثر نہ ہوگی نہ ان کی خیر خواہی کو کوئی تسلیم کرے گا اسی کو تو فرماتے ہیں اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو) تو ان حالات کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام من حیث الاسلام بہت کم لوگوں میں ہے صرف اسلام من حیث القوم رہ گیا ہے۔ جیسے اپنے ہمعصروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب کے ذریعہ سے ایک اجتماعی شان پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح خود بھی ان کے قدم بقدم چلتے ہیں اور بڑی علامت اس کی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنی اصلاح کچھ بھی نہیں کرتے اور میں کچھ ان ہی کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اپنی بھی شکایت کرتا ہوں کہ ہم بھی فکر اصلاح سے خالی ہیں چنانچہ ہم لوگ گو شراب نہیں پیتے زنا نہیں کرتے لیکن غیبت میں ہی مبتلا ہیں اگر ہم نے زنا کو خدا کا گناہ سمجھ کر چھوڑا ہے تو دوسرے گناہوں کو کیوں نہیں چھوڑتے۔ معلوم ہوا کہ شراب وغیرہ کو چھوڑنے کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ خاندان ووضع کے خلاف ہونے سے چھوڑا ہے کہ کبھی باپ نے نہیں پی تھی، دادا نے نہیں پی تھی تو اگر ہم پئیں گے تو سخت رسوائی ہوگی تو اپنی وضع کی حفاظت کے لئے اس سے اجتناب کیا نہ کہ شریعت کے زجر سے بخلاف غیبت کے کہ باپ دادا سب کرتے چلے آئے ہیں اس لئے اس کو عیب نہیں سمجھا گیا لہٰذا اس کے ترک پر کبھی توجہ نہیں ہوئی ورنہ گناہ ہونے کی رو سے شرب خمر اور ارتکاب غیبت دونوں مساوی ہیں، خوب کہا ہے ؎

ریا حلال شمارند جام بادہ حرام زہے طریقت وملت زہے شریعت وکیش

کہ عجیب بات ہے ریا کو تو عملاً حلال سمجھ رکھا ہے اور جام بادہ کو حرام سمجھ رکھا ہے حالانکہ دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو چھوڑنا چاہیئے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ دونوں میں مبتلا ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا ماٹ کا ماٹ ہی بگڑ گیا ہے۔ خوب کہا ہے اور یہ بزبان حال استغاثہ ہے نہ اس اعتقاد سے کہ

حضور صلے اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں بلکہ محض جوش میں کہا ہے کہ ؎

اے بہ سرا پردۂ یثرب بہ خواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے مدینہ منورہ میں اپنی خواب گاہ میں آرام فرمانے والے اٹھئے کہ پورب پچھم ساری دنیا خراب ہوگئی ہے)

جدھر جاکر دیکھتے ہیں خرابی ہی خرابی ہے۔ بہرحال گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑنا چاہیئے اور چونکہ اس امر میں سب گناہ مشترک ہیں اس لئے سب کو چھوڑنا چاہیئے ایسا نہ کرنا چاہیئے جیسے بعضے لوگ اپنے تقدس میں بٹہ لگنے کے خیال سے شراب تو چھوڑ دیتے ہیں مگر غیبت نہیں چھوڑتے کیونکہ عرفاً اس سے تقدس میں بٹہ نہیں لگتا اس تقدس پر کہ معصیت سے بھی زائل نہ ہو مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حکایت تو بے تمیزی کی ہے لیکن آج کل کے تقدس کا پورا فوٹو ہے۔

مشہور ہے کہ ایک آوارہ عورت تھی بی بی تمیزہ اس کو کسی بزرگ نے نماز کا پابند کر دیا اور وضو بھی سکھلا دیا وہ سمجھے تھے کہ اس کی بدولت فحش گناہ بھی چھوڑ دے گی۔ پانچ چھ مہینے کے بعد جو آنے کا اتفاق ہوا تو پوچھا کہ بی بی نماز پڑھا کرتی ہو کہنے لگی کہ جی ہاں انھوں نے کہا کہ وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ آپ کرا تو گئے تھے بس اسی سے پڑھ لیتی ہوں۔ تو جیسے اس بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ نہ سونے سے ٹوٹتا تھا نہ بدکاری سے ٹوٹتا تھا۔ ایسا ہی آج کل کا تقدس بھی ہے کہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں بس عوام میں تقوٰے اس کو سمجھا جاتا ہے کہ وضع ظاہر کو درست کرلیں رہا باطن اس کی جو حالت بھی ہو۔ خوب کہا ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عزّ و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے ایسی حالت کہ جیسے بہترین نقش و نگار والی قبر ہو اور اندر خدائے بزرگ و برتر کا غضب بھرا ہوا ہے اپنی ظاہری حالت سے

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے جیسے بزرگ پر بھی طعنے مارے اور تیری اندرونی
حالت ایسی خراب ہے کہ یزید جیسا شخص بھی شرمندہ ہو جائے۔

اور جیسے یہ پرانے لوگوں کی شکایت تھی ایسے ہی نئی وضع کے لوگوں کی یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اسلام کو بالکل ہی نہیں سمجھا غرض جب اسلام سے مقصود نجات کاملہ ہے اور وہ حاصل ہوتی ہے اسلام کامل سے جس طرح مقصود تموّل سے انتفاع کامل تھا اور وہ حاصل ہوتا تھا تمول کامل سے پس اب اسلام کامل کو تحقیق کرنا چاہیئے پس میں چند جملوں میں اس کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں اے مسلمانو! ڈرو خدا سے جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو بجز اسلام کے کسی حالت پر موت نہ آنا چاہیئے۔ یہ ایک آیت کا ترجمہ ہے اس ترجمہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں خدا تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا ہے دو چیزوں کا جن میں ایک امر ہے اور ایک نہی ہے امر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور نہی یہ ہے کہ بجز اسلام کے کسی حالت پر مت مرو۔ یہاں چند امور قابل غور ہیں انہی سے میرا مضمون نکل آئے گا ایک یہ کہ یہ خطاب جو ایمان والوں کو ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ دوسرے لوگ نہ ڈریں بلکہ اوروں کو خطاب اس لئے نہیں کیا کہ یہ خطاب ان کے لئے قبل از وقت تھا اور اسی سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کفار جزئیات کے مخاطب ہیں یا نہیں سو قبل از وقت و مخاطب جزئیات کے نہیں ہیں البتہ جب وہ اس زمرے میں داخل ہو جائیں اس وقت وہ بھی مخاطب ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی کالج میں ایک کورس بنایا گیا اور یہ خطاب کر کے اس کو پیش کیا گیا کہ اے طالب علمو! اس کو سیکھو تو یہاں جو خاص طالب علموں کو خطاب ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اوروں سے سیکھنے کا مطالبہ نہیں کیونکہ یہ پرنسپل اوروں کو بھی کالج میں داخل ہو کر طالب علمی کرنے کی ترغیب دے رہا ہے تو مطلوب ہر ایک سے ہوا لیکن جو شخص ہنوز کالج کا طالب علم نہیں بنا اس کو یہ خطاب قبل از وقت ہے اس کو اول یہ کہیں گے کہ تم اس کالج کے طالب علم ہو جاؤ۔

اس کے بعد جب وہ نام لکھالے گا تو اس کو یہ خطاب کیا جائے گا کہ تم فلاں کورس سیکھو۔

اسی طرح کلام مجید کے اس خاص خطاب کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اہل اسلام سے تقویٰ مطلوب نہیں لیکن ان کو یہ خطاب کرنا قبل از وقت ہے ان سے اول یہ کہا جائے گا کہ تم ایمان لے آؤ اس کے بعد تقوی کا حکم کیا جائے گا اور اگر کہیں قرآن شریف میں خطاب عام سے اِتَّقُوْا فرمایا ہے تو وہاں اِتَّقُوْا سے اٰمِنُوْا مراد ہے کیونکہ ایمان بھی تقوٰے کا ادنیٰ درجہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایک بات کا تو امر فرمایا ہے اور ایک سے نہی چنانچہ ترجمے سے ظاہر ہے اس کا قائل ہونا ممکن نہیں کہ مضامین میں ارتباط نہیں اور یہ تو ایک ہی آیت کے دو جملے ہیں خود آیتوں میں بھی اس کا قائل ہونا صحیح نہیں کیونکہ اگر آیتوں میں ترتیب نہ ہوتی تو ترتیب تلاوت کو ترتیب نزول کے خلاف کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نازل تو کہیں ہوئی اور رکھی گئی کسی دوسری جگہ اس سے معلوم ہوا کہ مناسبت مضامین کے لحاظ سے ترتیب مقرر ہوئی ہے اور جب آیتوں میں ارتباط ہے تو اجزائے آیات میں علی سبیل الاولیت ارتباط ہوگا اور جب یہ ہے تو بظاہر امر ونہی دونوں میں عنوان ایک ہونا چاہیے تھا یہ کیا بات ہے کہ امر میں تو تقوٰے کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ فرمایا گیا ہے کہ مرتے وقت تک مسلمان رہنا اور ربط کا ہونا ضروری ہے پس یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ اور مُسْلِمُوْنَ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقوٰے کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علیٰ ہذا اسلام کامل حق تقوٰے ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں سو اس کے لئے حق تقوٰے کی تفسیر کو دیکھ لیجئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ہے ورنہ نہیں تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ان یطاع ولا

یعصی اور بعض نے یہ لکھا ہے ان یشکروا ولا یکفروا اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں سب کا اجتماع مقصود ہے خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اعمال اسلام کو کامل کرلیا جائے سو اس کا ایک جزو اطاعت و ترک معصیت بھی ہے ایک جزو شکر و ترک کفر بھی ہے اور ان کی تخصیص بطور تمثیل کے ہے مقصود یہ ہے کہ سب اعمال کو جمع کرنا چاہیئے۔ پس اسلام کامل تو یہ ہے مگر اس وقت لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو دوسرے طور پر سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے دواؤں کا ست نکالا تھا مگر اس وقت کے عقلاء نے اسلام کا ست نکالا ہے کہ اپنے خیال کے موافق کچھ چیزیں اسلام میں داخل رکھ لیں کچھ چیزوں کو خارج کر دیا مگر صاحبو! ست اس چیز کا نکلا کرتا ہے جس میں کوئی فضول جزو بھی ہو تو کیا آپ کے نزدیک اسلام میں کوئی فضول جزو بھی موجود ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے تو اس سے تو خدا تعالےٰ پر اعتراض لازم آتا ہے۔ صاحبو! اسلام کا کوئی جزو بھی قابل ترک کے نہیں حتیٰ کہ حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ کچھ فرض نہیں اور توریت پر بھی عمل ہو جائے گا۔ اس پر یہ آیت نہایت شد و مد کے ساتھ نازل ہوئی یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ الخ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ شیطان کے قدم بقدم مت چلو) خیال کیجئے کہ گوشت کھانا بھی کیا کوئی رکن اعظم تھا مگر اس کے ترک کو قربت سمجھنے پر کس قدر شد و مد ہوا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا اتنا جزو بھی ترک کے قابل نہیں پھر ست کیسے نکل سکتا ہے اور ست اسلام کا اس طرح نکالا ہے کہ بعض نے تو صرف عقیدوں کو کافی سمجھا اور اعمال وغیرہ کی کچھ بھی ضرورت نہ سمجھی اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عقیدوں میں بھی انتخاب کیا ہے لیکن وہ بہت اقل و نادر ہیں مگر ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کی ضرورت اب نہیں رہی یہ عرب کے واسطے مقرر ہوئی تھی کہ وہ نا مہذب تھے اب ہم

متمدن ہیں ہم میں کوئی توحش کی شان باقی نہیں رہی لہذا (نعوذ باللہ) اس کو اسلام سے حذف کر دیا جائے۔ اِنَّا لِلّٰہ۔ اس مشورے کا سیدھا اور صحیح جواب یہ ہے کہ یہ قرآن شریف کے خلاف ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ آجکل اس جواب کی قدر نہیں کرتے اور اس کو عجز اور دفع الوقتی پر محمول کرتے ہیں اور علماء سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ قطع نظر حوالہ قرآن وحدیث سے ہر قانون کی لم بیان کرو۔ صاحبو! قوانین ظاہری جن میں بہت سے خلاف عقل عوام بھی ہیں ان کی لم کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔ صرف وجہ یہ ہے کہ اس قانون کی وقعت دلوں میں ہے اور قانون اسلام کی وقعت نہیں ورنہ اگر اس کی بھی وقعت ہوتی تو ہرگز اس میں چون وچرا نہ کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو　　　نینگیختن علت از کار تو

(زبان کو ہر وقت تیرے ذکر سے تازہ رکھنا چاہیئے تیرے کام کے لئے کوئی وجہ اور شرط نہ ہونی چاہیئے)

اور یہ شان ہوتی ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندگی بخشے تو یہ تیری مہربانی ہے اور اگر تو موت دے تو ہم خود تجھ پر فدا ہیں میری جان تیرے حوالہ ہے جو تیری مرضی چاہے وہ کر میں ہر حالت پر راضی ہوں)

دیکھئے انسان کو اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے کیسا سرافگندہ ہو جاتا ہے مجنوں کی لیلیٰ کے عشق میں کیا حالت ہو گئی تھی تو ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(اللہ کا عشق لیلیٰ سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اس کی یاد اور تلاش میں گلی گلی پھرنا زیادہ بہتر ہے)

کیا خدا کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہو گئی۔ اور لیجئے اگر محبوب دس روپے مانگے تو محب کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ دس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے بلکہ غنیمت سمجھتا ہے اور مسرور ہوتا ہے افسوس کہ ایک مردار کی فرمائش پر تو مسرت ہو اور خدا تعالیٰ کے ارشاد کی لم تلاش کی جائے اور میں ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ قانون کی حکمت واضع قانون سے دریافت کرنی چاہیئے نہ کہ عالم

قانون سے۔ مثلاً اگر کوئی حاکم قانون مروج کی رو سے فیصلہ کر دے اور آپ اس سے پوچھیں کہ اس قانون کے مقرر کرنے میں کیا مصلحت ہے تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کے حافظ ہیں واضع نہیں مصالح واضعانِ قانون سے دریافت کرو صاحبو! جب حاکم کو یہ جواب دینے کا اختیار ہے تو کیا علماء یہ جواب نہیں دے سکتے اور جب حاکم کا یہ جواب زبردستی اور عجز پر محمول نہیں کیا جائے گا تو علماء کے اس جواب کو عجز پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ سائلین پر اتنی شفقت نہ کیا کریں اور خوامخواہ عوام کو دلیر نہ بناویں اور اپنے درپئے نہ کریں۔ رہا یہ ڈر کہ بعض لوگ مصالح نہ معلوم ہونے سے اسلام سے نکل جائیں گے تو میں کہتا ہوں کہ بلا سے نکل جائیں ؂

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست　　　　بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(ہمارے ناقص عشق سے یار کا جمال بے پرواہ ہے۔ خوبصورت چہرہ کو رنگ و روپ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی کیا ضرورت ہے)

اسلام کو ایسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس قانون کے موافق جواب دو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس لئے پوچھتے ہیں کہ دوسروں کو بتلائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ؂

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ　　　　بر نتابد کوہ را یک برگ کاہ

(جتنی چاہے تمنائیں کرو مگر حد کے اندر کرو۔ گھاس کا پتہ پہاڑ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا) تمنا کرو لیکن اپنے تحمل سے نہ بڑھو اسلام کی خدمت کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق اگر تم نے دو چار باتیں معلوم کر کے ایک دو سوال کا جواب دیدیا تو ان کے علاوہ دوسرے سوالات میں کیا کرو گے ؂

چار پارا قدرِ طاقت بار نہ　　　　بر ضعیفاں قدرِ قوت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر　　　　طفلِ مسکیں را ازاں ناں مُردہ گیر

یعنی بچے کو اگر روٹیاں دینے لگو تو نتیجہ یہ ہو گا کہ مرے گا' تو عوام کو چاہیئے کہ اپنے درجے پر رہیں

میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کی خدمت نہ کرو مگر جو خدمت تحقیق لیبات کی تم نے شروع کی ہے اس کو محدود کرو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے۔ غرض بعض نے عقائد میں بھی تلخیص کی ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں۔ باقی اعمال کی تلخیص و حذف کرنے والے تو بہت ہی ہیں اور بعض نے عقائد کے ساتھ اعمال کو بھی ضروری سمجھا مگر کسی نے تو صرف نماز کو اختیار کیا اور زکوٰۃ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ اگر چار ہزار روپیہ ہوگا تو اس میں سے ایک سو روپیہ دینا پڑے گا اس لئے اُس کو بالکل ہی ترک کر دیا ان لوگوں کی وہ حالت ہے کہ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ❊ ور زر طلبی سخن دریں ست

(اگر تو میری جان چاہتا ہے تو کچھ حرج نہیں لیکن اگر روپیہ پیسہ طلب کروگے تو سوچنا پڑیگا)

کوئی صاحب اندیشہ نہ کریں کہ شاید اب چندے کی فرمائش کی جائے میں چندہ نہیں مانگوں گا مقصود زکوٰۃ دینے والوں کی حالت کا بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا صرف زبانی دعوے رکھتے ہیں باقی امتحان کے وقت جی چراتے ہیں۔ مشہور ہے کہ کسی بخیل سے اس کے دوست نے انگوٹھی مانگی تھی کہ وہ یادگار کے طور پر رہے اس نے کہا کہ جب اپنا ہاتھ خالی دیکھا کروگے تو مجھے یاد کر لیا کیجو کہ ہم نے ایک دوست سے انگوٹھی مانگی تھی مگر اس نے نہیں دی۔ تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایسی ہی محبت رکھیں کہ صرف نماز تو پڑھ لیا کریں تاکہ اس کے ذریعے سے بزرگوں میں داخل سمجھے جائیں باقی اور اعمال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بعض نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی لیا لیکن حج کو چھوڑ دیا کہ اتنے دنوں تک دکان بند کرنی پڑے گی نقصان ہوگا۔ سفر میں تکالیف ہوں گی۔ بعض نے اس کو بھی کیا لیکن ابواب آمدنی کو نہیں روکا پھر ان میں بعض نے تو رشوت لینی شروع کر دی بعض نے سود خواری اختیار کر لی اور کہا جاتا ہے کہ اگر رشوت یا سود لینا چھوڑ دیں تو آمدنی کے وسائل بند ہو جائیں گے یہ تو وہ کوتاہیاں تھیں جن میں اکثر اہل دنیا مبتلا ہیں۔ بعض وہ کوتاہیاں ہیں کہ ان میں دیندار بھی مبتلا ہیں مثلاً اکثر لوگ جن میں دیندار بھی ہیں ریل کے سفر میں اسباب زیادہ لے جاتے ہیں حالانکہ یہ بالکل جائز ہے

خوب سمجھ لو کہ قیامت میں یہ سب دینا پڑے گا۔ علیٰ ہذا ڈاکخانہ کے بعض قواعد مثلاً اگر کسی ٹکٹ پر بالکل مہر نہ لگی ہو اور وہ ایک مرتبہ کام میں آچکا ہو تو اس کو دوسری دفعہ کام میں لانا جائز نہیں ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ میرے ایک عزیز سے کسی نے پوچھا کہ دیانت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دیانت یہ ہے کہ ڈاکیا ایک لفافہ دے کر جائے اور اس کا ٹکٹ مہر سے محفوظ نظر آئے اور اس وقت کوئی شخص اس مکتوب الیہ کے پاس نہ ہو نہ کسی کو خبر ہونے کا اندیشہ ہو اور یہ ٹکٹ کو سالم اتار کر کام میں لا سکتا ہو اور وہ ایسے وقت میں محض خدا کا خوف کر کے لفافہ کھولنے سے پہلے اس ٹکٹ کو اتار کر پھاڑ ڈالے اگر کوئی ایسا کرے تو سمجھا جائے گا کہ یہ پورا دیانتدار ہے۔ مقصود اس سے دیانتداری کی ایک مثال دینا ہے نہ کہ اس میں منحصر کرنا اور اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اسلام کی کیا خوبیاں ہیں۔ واللہ اسلام ہرگز چالاکیوں اور مکاریوں کی اجازت نہیں دیتا کہ لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ یعنی کسی کو ذراسی تکلیف پہونچانا بھی اسلام کے خلاف ہے یہاں تک حکم ہے کہ جانور کو اگر ذبح کرو تو اس کو راحت دو یعنی چھری کو خوب تیز کر لیا کرو کیا انتہا ہے رحمت کی کہ ذبح کہ بظاہر تکلیف ہے لیکن شرافت انسانی کی وجہ سے اس کی اجازت دیدی گئی ہے اس میں بھی راحت رسانی کا کتنا بڑا خیال ہے۔ رہا یہ شبہ کہ تکلیف تو اب بھی ہوہی گی سو اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو کیا خبر ہے کہ خود مرنے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے یا ذبح میں زیادہ ہوتی ہے اگر شبہ ہے تو مرنے میں بھی ہونا چاہیئے کیونکہ ذبح کا شارع اور موت کا خالق ایک ہی ہے اگر اس کی تشریع پر شبہ ہے خلاف رحمت ہونے کا تو موت کی تکوین پر بھی شبہ ہونا چاہیئے تو جس نے جانور پر رحمت کا حکم کیا ہے وہ انسان کے لئے رحم کو کیوں نہ واجب کرے گا۔ پھر دھوکا دغا بازی خیانت کو کیسے جائز رکھے گا مگر افسوس کہ ہم نے اس کی ذرا بھی رعایت نہ کی اپنے بھائیوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بخصوص جو لوگ آجکل بھی بڑے کہلاتے ہیں ان کے معاملات کی تو بری حالت ہے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ریل میں سوار ہوئے ایک قلی کے سر پر اُن کا

اسباب تھا اسباب رکھوا کر انھوں نے قلی کو ایک گھسی ہوئی دو آنی دی اُس نے کہا حضور یہ تو خراب ہے کہنے لگے ہم کیا کریں اُس نے کہا بدل دیجئے کہنے لگے ہم نہیں بدلتے۔ اُس نے کہا کہ صاحب میں کیا کروں گا کہنے لگے کہ چلا دینا اس نے کہا میں کیسے چلا دوں گا تو کہنے لگے جیسے ہم نے چلا دی۔ بھائی تم نے تو اس لئے چلا دی کہ تم بڑے شخص ہو اگر اس قلی کو بھی کوئی ایسا ذلیل مل جائے جس کی ذلت کی نسبت اس کی عزت کے ساتھ ایسی ہو جیسے اس کی ذلت کی نسبت تمہاری عزت کے ساتھ تو وہ بھی چلا سکے مگر ایسا شخص اس کو کہاں ملے گا آخر وہ روتا ہوا واپس چلا گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔ ایسا افسوس ہوا کہ جب یہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہمدردی کے لکچر دیتے ہیں اس وقت ان کی زبان کیسی چلتی ہے اور کس قدر زور ہوتا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کی برابر دنیا بھر میں کوئی ہمدرد نہیں اور اعمال کی یہ حالت ہے صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ مذہب کا پابند ہو کر تو ہمدردی کرنا ممکن ہے ورنہ ہرگز ممکن نہیں۔ نرے تمدن سے کبھی کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل واقعات سے ظاہر ہے اس وقت لوگوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اگر مذہب کی پابندی ہو جائے تو ہرگز کبھی کسی سے کسی کو تکلیف نہیں پہونچ سکتی اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے امن عام کی کتنی حفاظت کی ہے۔ میں ایک دوسری بڑی مثال تعلیم حفظ امن کی اسلام میں دکھلاتا ہوں۔ ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے لَا تَسُبُّوا الْمُلُوْكَ فَاِنَّمَا قُلُوْبُهُمْ بِيَدِيْ (الحدیث) یعنی اگر حکام سے تم کو تکلیف پہونچے تو اُن کو بُرا بھلا نہ کہو کیونکہ ان کے قلوب تو میرے اختیار میں ہیں بلکہ مجھ سے اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرو میں ان کے قلوب کو نرم کر دوں گا۔ اللہ اکبر کس قدر امن پسندی ہے کہ حکام کو زبان سے بھی کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگرچہ ان سے بظاہر کچھ تکلیف ہی پہونچی ہو بلکہ یہ حکم ہے کہ میری اطاعت کرو غرض معاملات کے متعلق یہاں تک تعلیم ہے مگر ہم لوگوں کے معاملات میں دیکھ لیجئے کیسا حالت ہے۔ اور بعض نے معاملات کو بھی لیا لیکن معاشرت کو بگاڑ دیا حالانکہ شریعت نے معاشرت کا بھی اسی قدر انتظام کیا ہے جس قدر معاملات وغیرہ کا۔ وضاحت کے لئے میں معاشرت کی ایک جزئی بیان

کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (اے مسلمانو اپنے گھر کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو اور سلام کرو اس کے رہنے والوں پر یہ تمہارے لئے بہتر ہے) یہ مسئلہ استیذان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر استیذان کے کسی کے گھر میں داخل نہ ہوا اور یہ آیت مجمل ہے اس میں استیذان کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کب تک اجازت مانگا کریں۔ حدیث شریف میں اس آیت کی شرح ہے کہ تین مرتبہ اجازت چاہو اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ چوتھی بار مت پوچھو کہ مخاطب تنگ ہوگا اور یہ مردانہ و زنانہ دونوں کے لئے ہے لیکن مردانہ قطعات مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں آنے کی ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے جیسے حکام کی عدالتیں یا مجلس عام وہاں استیذان کی ضرورت نہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں بیٹھنے کی غرض قرائن سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خلوت ہے اور علی العموم سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ تو شریعت کا حکم ہے کہ اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت اس شخص کو خلوت مقصود ہے تو بغیر استیذان وہاں ہرگز نہ جاؤ پھر کیا کوئی صاحب اس پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اس کو طعن کیا جاتا ہے نیز حکم ہے کہ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اجازت نہ دے پھر دیکھئے جو عمر بھر اس طرف رُخ بھی کریں۔ کیوں صاحب اگر وہ آزاد نہ ہوا تو طلب اجازت کیا ہوئی یہ تو محض اطلاع ہوئی کہ ہم آگئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ لیجئے۔ حکم ہے کہ جب نماز جمعہ سے فارغ ہو جاؤ اور کوئی دوسرا بھی جلسہ مثل وعظ وغیرہ کے نہ ہو تو منتشر ہو جاؤ اور کماؤ کھاؤ۔ لیکن دل بیار دست بکار۔ خدا کو نہ بھولو۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جس کام کے لئے جمع ہوئے تھے جب وہ کام ہو چکے تو متفرق ہو جاؤ کیونکہ بیکار ازدہام میں ممکن ہے کہ کوئی فساد کھڑا ہو جائے اسی طرح حدیث میں ہے کہ اگر تین آدمیوں کا مجمع ہو تو ان میں سے دو کو یہ جائز نہیں کہ

ایک کو تنہا چھوڑ کر کسی خفیہ مشورے میں لگ جائیں جب تک کہ تیسرا چلا نہ جائے یا کہ کوئی چوتھا نہ آجائے کیونکہ اس کو ناگوار ہوگا اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ مجھ کو غیر سمجھا اور مجھ سے پردہ رکھا اور جب چوتھا آجائے گا تو اس تیسرے کو اس لئے رنج نہ ہوگا کہ اس کو احتمال ہوگا کہ شاید چوتھے سے مخفی کرنا راز کا مقصود ہے اور چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر چیز کے متعلق ایک نہایت مناسب قانون مقرر فرمادیا مگر افسوس ہے ہمارے بھائیوں نے ان قانونوں کو کبھی دیکھا بھی تو نہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے معاشرت کو بھی کچھ کچھ لیا ہے مگر اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جن کو اخلاق کے صحیح معنے بھی معلوم نہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ تہذیب اخلاق وہی چیز ہے جس کو تصوف کہتے ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ہم جس طرح اعمال ظاہرہ کے مکلف ہیں اسی طرح اعمال باطنہ کے بھی مکلف ہیں۔ ہم کو حکم ہے کہ تکبر نہ کریں ہم کو حکم ہے کہ خدا کی محبت پر کسی کی محبت غالب نہ کریں ہم کو حکم ہے کہ دل میں بغض وکینہ نہ رکھیں پھر بتلایئے کہ ہم نے اس کی کیا فکر کی ہے اور جو لوگ کچھ کر بھی رہے ہیں وہ حقیقت کو چھوڑ کر رسم پرستی کر رہے ہیں اصل حقیقت کی طرف کسی کو بھی توجہ نہیں الا ما شاء اللہ۔ تو اسلام کامل یہ ہوا کہ عقائد بھی درست اور کتاب وسنت کے موافق ہوں اور اعمال یعنی دیانات ومعاملات گواہی وکالت تجارت زراعت وغیرہ۔ اور معاشرت مثلاً کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا اور اخلاق باطنہ صبر وشکر واخلاص یہ سب کے سب موافق شریعت کے ہوں۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا تام اسلام کامل ہے اگر ان میں سے ایک جزو بھی کم ہو تو وہ اسلام ایسا ہے جیسا کوئی شخص حسین ہو لیکن اس کے ناک نہ ہو اس تقریر سے آپ کو اسلام کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی۔ اب غور کیجئے کہ ہم نے مسلم کہلانے کا استحقاق کس درجہ تک حاصل کیا ہے واقعی ہماری وہ حالت ہے کہ؎

طاؤس را بہ نقش ونگار یکہ ہست خلق ٭ تحسیں کنند او خجل از زشت پائے خویش

(مور کے بدن پر جو کچھ پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں مخلوق اس کی تعریف کرتی ہے۔ اور وہ اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہے)

اے مسلمانو! اگر تمہیں کسی نے مولوی کہدیا یا شاہ صاحب کہہ دیا یا رفارمر کہہ دیا تو مغرور نہ ہو جانا کہ ہم بھی کچھ ہوں گے۔

صاحبو! خود بھی تو اپنی حالت کو دیکھو کہ ہم واقع میں کیا ہیں۔ ہماری وہ حالت ہے جیسا ایک قصہ ہے کہ کسی شخص کے پاس ایک عیبی گھوڑا تھا اس نے ایک چابک سوار سے کہا کہ میرا گھوڑا بیچ دو۔ اس نے بازار میں کھڑا کر کے بیچنے کے لئے خلاف واقع اس کی بہت کچھ تعریف کرنی شروع کی، مالک نے جو سُنا تو کہنے لگا کہ جب یہ ایسا ہے تو لاؤ مجھی کو دے دو۔ احمق نے چابک سوار کی حکایت کو تو سُنا اور اس سے دھوکا ہوا۔ مگر یہ خبر نہ ہوئی کہ گھوڑا تو میرا ہی ہے۔ میں نے ہی پانچ برس تک خود اس کو رکھا ہے اور بیچ رہا ہوں۔ اسی طرح ہم کو اگر کوئی مولوی یا لیڈر کہتا ہے تو ہماری ہی تلبیس سے تو پھر اپنے مشاہدے کو غلط سمجھنا اور خوشامدیوں کی روایت کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے ان خوشامدیوں کے باب میں اور ہمارا دھوکا کھانے کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست ازاں شد خار جاں

از فریب داخلان و خارجاں

اینش گوید نے منم ہمراز تو ٭ آنش گوید نے منم انباز تو

او چو بیند خلق را سرمست خویش ٭ از تکبر میرود از دست خویش

(بدن روح کے لئے ایک پنجرے کی صورت رکھتا ہے مگر یہ اپنے گھر والوں اور دیگر متعلقین کے فریب کے سبب اس کے لئے کانٹا بنا ہوا ہے۔ ایک کہتا ہے میں تو تیرے راز جان ہی نہیں سکتا۔ دوسرا کہتا ہے آپ کے سامنے بھلا ہماری کیا مجال اور وہ جب مخلوق کو اپنے اوپر فریفتہ دیکھتا ہے تو تکبر کی وجہ سے اپنے آپ میں نہیں رہتا)

حالانکہ آدمی سے اپنی حالت مخفی رہ نہیں سکتی خدا تعالیٰ فرماتے ہیں بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ (انسان اپنے نفس کی علتوں سے خوب واقف ہے اگرچہ عذر بناتا رہے) میری تقریر گو مختصر ہے مگر یہ ایک کافی میزان ہے ہم لوگوں کی حالت کی۔

اب میں مختصراً ان امراض کا علاج بیان کرتا ہوں:

ہمارے ان امراض کے دو سبب ہیں ایک تو قلت علم۔ دوسرے ضعف ہمت۔ یعنی بعض خرابیاں تو قلتِ علم سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض خرابیاں باوجود جاننے کے قلتِ ہمت سے اور قلت ہمت قلت خشیت سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً سردی کے وقت نماز کا قضا کر دینا اس کا سبب قلت خشیت اور قلت ہمت ہے۔ نفس کہتا ہے کہ اس وقت سردی میں تکلیف ہو گی صبح کو قضا پڑھ لینا بھی تو ممکن ہے تو ان اسباب کو دور کرنا چاہیئے۔ یعنی اول تو بقدر ضرورت علمِ دین پڑھنا چاہیئے اگر اصطلاحی عالم بنے تو بہت ہی اچھا ہے۔

رہا دنیا داروں کا اس پر یہ شبہ کہ اصطلاحی عالم بن کر پھر لوگ کھائیں گے کہاں سے یہ واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کیونکہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جو شخص کسی جماعت کی خدمت میں محبوس ہو اُس کا نفقہ اُس شخص کے ذمہ ہے اور جب یہ بات ہے تو یہ کہنا کہ کہاں سے کھاؤ گے واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے یہ سوال تو علماء کر سکتے تھے کہ یہ کہاں سے کھائیں گے۔ مگر وہ تو خدا پر نظر کر کے بیٹھ رہے۔ اب یہ خود یاد دلاتے ہیں کہ ہم میں ایک عیب ہے کہ باوجود ہمارے ذمہ ہونے کے ہم خیال نہیں کرتے۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ قوم کے ذمہ ہے کہ ان لوگوں کے اخراجات کی متکفل ہو۔ مگر علماء کو یہ چاہیئے کہ وہ قوم پر ہرگز نظر نہ کریں بلکہ ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(تو جو بھی اپنا معشوق رکھتا ہے اسی میں دل لگا کر دوسری تمام دنیا سے آنکھیں بند کر)
اور ہر وقت اس کو پیش نظر رکھیں وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں زمین کے خزانے)

اکبر بادشاہ کی حکایت مشہور ہے کہ یہ ایک مرتبہ شکار میں گئے اور ساتھیوں سے بچھڑ کر کہیں دور نکل گئے ایک دیہاتی نے ان کو مہمان رکھا۔ اکبر اس سے بہت خوش ہوئے اور کہا دارالسلطنت میں آنا' چنانچہ وہ دہلی آیا اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگی دیہاتی نے یہ حالت دیکھی جب دعا سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے اکبر نے کہا کہ خدا تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا اور مراد مانگ رہا تھا کہنے لگا کیا تم کو بھی مانگنے کی ضرورت ہوتی ہے اکبر نے کہا کہ بیشک کہنے لگا کہ پھر میں اسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے تم کو بھی ضرورت مانگنے کی ہوتی ہے۔ اہل علم کو چاہئے کہ اگر خدمت دین کریں تو نہ اس لئے کہ ہم کو نذرانہ ملے گا۔ خدا کی قسم خدا کا نام دونوں عالم سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ خوب کہا ہے۔ ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تو اپنی قیمت دونوں عالم کو بتلاتا ہے اور قیمت بڑھاؤ' ابھی تو بہت سستا ہے)

غرض مولویت کے درجے تک اگر پہونچیں تو بہت ہی اچھا ہے لیکن اگر کوئی مولوی نہ بنے تو بقدر ضرورت علم دین ضرور حاصل کر لینا چاہئے اور ضروریات یہ ہیں۔ عقائد دیانات' معاملات' معاشرت' اخلاق اس کے بعد خواہ انگریزی پڑھو یا صنعت سیکھو جو چاہو کرو۔ نیز اگر کوئی ذی استعداد ہو تو اس کو علاوہ اجزائے مذکورہ کے وہ کتابیں بھی پڑھا دی جائیں جن میں ملحدین کے اعتراضات علی الاسلام والمسلمین کا جواب دیا گیا ہے یہ تو خواندہ ہی لوگوں کی تحصیل علم کا طریقہ ہے۔ رہے بے پڑھے لوگ ان کی تعلیم کی یہ تدبیر ہے کہ کوئی عالم ہفتے میں ایک دو بار عام لوگوں کو کسی

مسجد وغیرہ میں جمع کرکے احکام سنا دیا کرے اور سمجھا دیا کرے اور عورتوں کی تعلیم یوں ہوسکتی ہے کہ ان کے گھروں کے مرد روزانہ دینی رسائل ان کو پڑھ پڑھ کر سنا دیا کریں اور جو علماء سے سنیں وہ اُن کے کان میں ڈالتے رہیں اور اگر کوئی محلے میں خواندہ عورت ہو کبھی کبھی اُس سے کتاب پڑھوا کر سن لیا کریں یہ وہ طریقہ ہے کہ اس سے عام اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم ہوسکتی ہے۔

رہا ضعف ہمت و قلتِ خشیت اس کا علاج یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کرکے اس میں یہ سوچا کرو کہ ہم کو خدا تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں دی ہیں اور ہم نے کیا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے۔ کچھ سوچو کہ حشر کا میدان ہوگا اور ہم خدا تعالیٰ کے سامنے ہوں گے اور ہم سے ان سب نعمتوں اور ہمارے معاصی کی نسبت سوال کیا جائے گا پھر خدا تعالیٰ کے عذابوں کو یاد کرو اور اس وقت خدا تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر کر خوب گڑگڑا کر دعا کرو اور استغفار کرو۔ اگر اس کو نباہ کروگے تو ایک ہفتے میں ان شاء اللہ تعالیٰ عظیم الشان تغیر حالت میں ہوگا اور اس سے ہر وقت جائز و ناجائز کی فکر ہوگی۔ اور ایک کام یہ کرو کہ اہل اللہ کی خدمت میں جایا کرو۔ لیکن کسی ایسے کے پاس جاؤ جو کہ بقدر ضرورت عالم ہوں اور اگر ایسا میسر نہ ہو تو بزرگوں کی حکایات و نصائح دیکھا کرو یہ علاج ہے قلتِ علم و ضعفِ ہمت کا اور پھر اس حالت پر دوام رکھو جب تم اس حالت پر دائم رکھوگے تو لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (مرنا تو مسلمان ہی مرنا) پر پورا عمل ہوجائے گا۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ توفیق عمل دیں۔ آمین

ناظرین وعظ سے التماس ہے کہ جامع (ناشر) وعظ کے لئے بھی خاتمہ وحصول رضائے باری کی دعا فرمائیں اور تاقید حیات حصول استقامت کی۔

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رَوَاہُ البُخَارِیُّ)

دعوات عبدیت جلد سوم کا

دسواں وعظ ملقّب بہ

ترکُ المعَاصِی

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ——— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلدسوم کا

دسواں وعظ ملقب بہ

تَرکُ المعَاصِی

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
کراچی بندر مسجد گاڑی احاطہ	۲۵ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ہجری	ایک گھنٹہ	کھڑے ہوکر	ترکُ المعاصی ظاہرہ وباطنہ	مولوی سعید احمد صاحب	تقریبًا ۴۰۰ آدمی	اکثر عوام الناس تھے اور کچھ تعلیم یافتہ تھے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ (الانعام: ۱۲۰)

اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی عنقریب

یہ ایک مختصر سی آیت ہے اس میں خدا تعالےٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کو ایک نہایت عظیم الشان اور بڑے ضرر کی چیز سے بچایا ہے جس سے خدا تعالیٰ کی رحمت کاملہ اپنے بندوں پر معلوم ہوتی ہے یہ بات ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ محتاج نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کا کوئی کام بندوں کی اصلاح پر موقوف نہیں ہے اس کی سلطنت مثل سلاطین دنیا کے نہیں ہے کہ اگر رعایا مطیع اور فرمانبردار ہے تو وہ بادشاہ ہیں اور اگر نافرمان باغی ہو جائے تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کے سلاطین کی سلطنت کا مدار ہی اطاعت رعایا پر ہے۔ اس لئے اگر کوئی بادشاہ دنیا کا رعایا کو کچھ مصلحت کی بات بتلائے تو اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اپنی مصلحت کے لئے بتلا رہا ہے تاکہ بغاوت نہ ہو اور ہمارے ملک میں ضعف نہ آئے لیکن خدا تعالیٰ کی وہ سلطنت ہے اگر سب کے سب مل کر بھی بغاوت کریں تو اس میں ذرہ برابر کمی نہیں آسکتی اس لئے کہ اس کی تمام صفات قدیم ہیں جن پر زوال ممتنع ہے مسئلہ مسلمہ ہے مَاثَبَتَ قِدَمُہٗ امْتَنَعَ عَدَمُہٗ یعنی جو چیز قدیم ہوگی اُس کا عدم ممتنع ہوگا تو چونکہ خدا تعالےٰ کی صفت سلطنت اور ملک وحکومت کی قدیم ہے اس لئے اُس کو زوال ہو ہی نہیں سکتا نہ اس میں کوئی تغیر آسکتا ہے۔ تو اس حالت میں اگر خدا تعالیٰ کوئی بات مصلحت کی بتلائیگے تو وہ سراسر ہماری مصلحت کے لئے ہوگی اس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ اپنی منفعت کے لئے بتلایا ہوگا۔ پس اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی کہ بلاغرض نفع رسانی ہو دنیا میں اگر کوئی نفع پہونچاتا ہے تو اس میں اپنا بھی نفع ملحوظ رکھتا ہے جیسا مثال مذکور سے معلوم ہوا اور بعض کی نفع رسانی میں اگرچہ کوئی ظاہری مصلحت اس شخص کی معلوم نہ ہو جیسے طبیب کا نسخہ تجویز کرنا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس میں بھی اپنی کوئی غرض مخفی ضرور ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اس شخص سے ہم کو مال حاصل ہوگا یا اس کے ذریعہ سے ہماری شہرت ہوگی یا کم از کم اگر کچھ بھی توقع نہ ہو اور کوئی بہت ہی بڑا دیندار ہو تو اس کو ثواب کی توقع تو ضرور ہی ہوگی اور یہ بہت ہی بڑی غرض ہے کہ دوسری تمام اغراض اس کے سامنے گرد ہیں اگرچہ یہ غرض مذموم نہیں بلکہ محمود و

مطلوب ہے لیکن غرض تو ضرور ہے اور غرض بھی بہت بڑی ہے طالب ثواب کو
یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بے غرض نفع رسانی کی اور اگر کوئی شخص ایسا رحم دل ہے
کہ اس کی نیت حصول ثواب کی بھی نہ ہو جیسے ماں باپ کی پرورش کہ بلا نیت ثواب
ہوتی ہے گو اس پر ثواب بھی مرتب ہو جائے۔ یا مثلاً طبیب کا اپنے بچے کو دوا
پلانا کہ بلا قصد ثواب ہوتا ہے وہ بھی غرض سے خالی نہیں کم سے کم اپنے نفس
کی راحت رسانی تو ضرور مقصود ہے یعنی بچے کی تکلیف دیکھ کر جو اپنے کو تکلیف
ہوتی ہے اس علاج اور تجویز نسخہ سے اپنی اس تکلیف کا دفع کرنا اور اپنے کو راحت
پہونچانا ہی مقصود ہے۔ اسی طرح اگر اجنبی کے ساتھ ہمدردی کی تو وہاں بھی ازالہ
رقت جنسیت کا مقصود ہے غرض کوئی عاقل صدہا برس تک بھی سوچے تو وہ ایسی
مثال نہیں بتلا سکتا جس میں کسی شخص نے دوسرے کو بلا اپنی کسی غرض کے نفع پہونچایا
ہو۔ بر خلاف خدا تعالیٰ کے کہ ان کو کسی کی احتیاج نہیں نہ مال کی ضرورت نہ جاہ
کی طلب نہ جوش طبیعت مثل مادر و پدر کے کیونکہ انفعال سے خدا تعالیٰ بالکل
پاک ہیں ان پر کوئی چیز مؤثر نہیں اور اس کی رحمت اختیاری ہے اس کا غصہ
بھی مثل غصہ اہل دنیا کے نہیں کہ وہ بے چین ہو جاتے ہوں بلکہ انتقام عین ارادہ
اس کے غصے کا حاصل ہے اور انفعال کے امتناع کی وجہ یہ ہے کہ اس پر کوئی
حاکم نہیں نہ اس پر کوئی قادر اور مؤثر متأثر سے زوردار ہوتا ہے تو اگر خدا
تعالیٰ پر کوئی چیز مؤثر ہو سکے تو خدا خدا نہ رہے گا۔ غرض یہ اہل اسلام کا عقیدہ
اور مسلمہ مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ پر کوئی چیز قادر و مؤثر نہیں تو رحمت کے بھی یہ معنی
نہیں کہ اس کو جوش ہوتا ہے جیسے مادر شفیق کو۔ بلکہ وہ صرف ارادے سے کرتے
ہیں اور جب ایسا ہے تو وہاں یہ نفع بھی مطلوب نہیں کہ ہم کو راحت ہو گی۔ پس
وہ جو شفقت کریں گے تو بالکل بے غرض شفقت ہو گی۔ وہ ہر طرح بے نیاز
اور ہم ہر طرح محتاج ہیں۔ اب دیکھئے کہ اگر دنیا میں دو شخصوں میں ایسا علاقہ
ہو کہ زید کو عمرو کی کوئی حاجت نہ ہو اور عمر کو زید کی حاجت ہو تو حالت یہ ہوتی ہے

کہ محتاج الیہ منہ بھی نہیں لگایا کرتا اور محتاج اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا ہے تو اگر خدا تعالیٰ بھی اپنے استغنا اور مخلوق کی احتیاج کے اِس مقتضائے مذکور پر عمل کرتے تو وہ بھی توجہ نہ کرتے۔ اللہ اکبر اتنی مستغنی ذات اور پھر اتنی بڑی رحمت کہ ہم کو ہمارے ضرر سے مطلع فرماتے ہیں اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی اسی رحمت کے مقتضا پر اس آیت میں ہم کو ہماری ایک ضرورت پر مطلع کیا ہے جس سے ہم کو اس کی رحمت کا ممنون ہونا چاہئے کیونکہ قاعدہ شریف طبائع کا یہ ہوتا ہے کہ جس قدر کسی کی عنایت دیکھتے ہیں اسی قدر اس کے سامنے پگھل جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ (انسان غلام ہے احسان کرنے والے کا) مگر عجیب بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت کو سن کر ہماری اور زیادہ سرکشی بڑھتی ہے اور لوگ اور زیادہ جری ہو جاتے ہیں چاہیئے تو یہ تھا کہ رحمت اور مغفرت کی آیتوں کو سن کر اور زیادہ اطاعت کرتے اور معاصی پر جرأت نہ کرتے کیونکہ یہ آیات اس لئے نہیں فرمائی گئیں کہ سب بے فکر ہو جائیں بلکہ سبب اس کا یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو تمام عالم جہل سے پر تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طریقۂ نجات ارشاد فرمایا تو سلیم الطبع لوگوں نے اس کو سمجھا اور مانا لیکن ان کو یہ شبہ ہوا جس کو بعض نے خود آکر عرض بھی کیا کہ تمام عمر تو نافرمانی میں گذری ہے اب توبہ کر لینے سے اور اطاعت کرنے سے وہ نافرمانی کیونکر دُھل جائے گی اور اس کا اثر کیسے جاتا رہے گا تو پھر اپنے آبائی مذہب کو بھی کیوں چھوڑا ان حضرات نے خدا تعالےٰ کے معاملے کو دنیا کے لوگوں کے معاملے پر قیاس کیا کیونکہ خدا تعالےٰ کی رحمت کا علم ان کو نہ تھا وہ خدا کو پورا پہچانتے نہ تھے اور یہی وجہ تھی اُن کے شرک میں مبتلا ہونے کی کہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ مثل شاہانِ دنیا کے ہوں گے کہ جس طرح شاہانِ دنیا تن تنہا سلطنت کے کام کو نہیں سنبھال سکتے بلکہ ہر کام کا عملہ الگ ہوتا ہے اور ہر کام کے لئے کارکُن جُدا مقرر ہوتے ہیں ایسے ہی وہ سمجھے کہ خدا تو ایک ہے

وہ سارے کام کیسے کرے گا تو ایک عملہ گڑھا اور نائب مقرر کرلئے کہ چھوٹے چھوٹے کام ان سے نکال لیں گے اور بڑے بڑے کام خدا تعالیٰ سے چنانچہ اُن کے اس خیال کو قرآن مجید کی اس آیت میں ظاہر کیا گیا ہے اِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ الخ (جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں خلوص دل کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں) نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا کہ سات ہیں ایک آسمان میں اور چھ زمین میں۔ آپؐ نے پوچھا بڑے کاموں کے لئے کس کو تجویز کیا ہے کہا کہ آسمان والے کو غرض وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا تعالےٰ ایسے ہی ہیں جیسے شاہانِ دنیا اس قیاسِ فاسد سے ان کو یہ بھی شبہ ہوا کہ اسلام لانے پر بھی شاید پچھلے جرائم باقی رہیں جیسے مثلاً فرض کرو اگر کوئی کسی کے باپ کو قتل کر دے اور پھر بیٹے سے معاف کرائے تو گو وہ معاف بھی کر دے مگر دل کا میل نہیں جا سکتا تو انھوں نے بھی یہی سمجھا کہ جب معاف یا خوش ہونے کی امید نہیں پھر ماں باپ اور قدیم مذہب کو بھی کیوں چھوڑا اور یہی شبہ آکر پیش کیا کہ اگر ہم مسلمان ہوں تو ہمارے گناہ کیسے معاف ہوں گے اور اگر نہ معاف ہوئے تو مسلمان ہونے سے فائدہ کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے بندوں سے کہدیجئے کہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو وہ سب معاف کر دے گا تم توبہ کر لو اُس میں خاصیت یہ ہے کہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں گو ہر گناہ کی معافی کے قوانین الگ الگ ہیں جس کی تفصیل کتب شرعیہ میں ہے۔ تو آیات رحمت سے مقصود یہ ہوا کہ شکستہ دل لوگوں کو تسکین ہو نہ یہ کہ عام لوگوں کو اور جری کر دیا جائے۔ غرض رحمت کے ذکر سے زیادہ متاثر اور مطیع ہونا چاہیئے۔

اس آیت سے یہ بھی ایک بڑی رحمت ثابت ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو مضرت سے بچنے کی تعلیم دی ہے پس ہم کو چاہیئے کہ اور زیادہ مطیع ہو جائیں اور

اس مضرت سے بچنے کی کوشش کریں۔ اب سمجھئے کہ وہ مضرت کیا ہے۔ سو اس کی تعیین آیت کے ترجمہ ہی سے ہو جائے گی۔ ترجمہ یہ ہے کہ اے مسلمانو! چھوڑ دو ظاہر گناہ کو اور باطن گناہ کو تو وہ مضرت گناہ ہے۔ اور ظاہر اور باطن فرمانا اشارہ ہے تعمیم کی طرف یعنی ہر قسم کے گناہ کو چھوڑ دو یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ امر کا صیغہ وجوب کے لئے ہوتا ہے اور یہاں خدا تعالےٰ نے بصیغۂ امر فرمایا ہے تو ہر قسم کے گناہ کا ترک واجب ہوا پھر لفظِ اِثم فرما کر اس وجوب کو اور بھی مؤکد کر دیا ہے۔ یعنی اگر کسی فعل کے ترک کو واجب کہا جائے پس واجب کہنا اس فعل کے گناہ ہونے پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے اور جو اس کے ساتھ اس فعل کو گناہ بھی کہا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے اور زیادہ تاکید ہو جائے گی۔ غرض معلوم ہوا ہو گا کہ وہ مضرت گناہ کرنا ہے۔ رہا یہ شبہ کہ ہم کو تو گناہ کرنے سے کوئی مضرت نہیں معلوم ہوتی نہ کبھی کوئی سزا ہوتی ہے تو سمجھئے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں کہ جن کا وجدان صحیح نہیں ہے اور ان کو کسی قسم کی مضرت محسوس نہیں ہوتی ان کے لئے تو جواب یہ ہے کہ نصوص میں دیکھ لو گناہ میں آخرت کی کیا کیا سزائیں مقرر ہیں چنانچہ فرماتے ہیں سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ یعنی انکو آخرت میں بہت جلد سزا ہو گی تو کیا یہ سزا کوئی چھوٹی مضرت ہے ہرگز نہیں۔ دیکھئے دنیا کی مضرت اگر آپ کی سمجھ میں آجاتی تو اس کو آپ بھی مضرت سمجھتے تو آخرت کی سزا تو اس سے زیادہ ہی ہے چنانچہ دنیا کی مضرت میں اور آخرت کی مضرت میں فرق یہ ہے کہ دنیا کی کیسی ہی مضرت ہو اس میں منفعت کا شائبہ ضرور ہوتا ہے اگر سر میں درد ہے تو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ پیٹ میں نہیں اگر مال جاتا رہا تو یہ کتنی بڑی منفعت ہے کہ آبرو نہیں گئی۔ نیز ایک درد کے ساتھ دس دردمند ہیں۔ باپ۔ بیٹے احباب۔ وغیرہ تو کیا اس سے تسلی نہیں ہوتی ضرور ہوتی ہے اور دکھ درد میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے۔ پس دنیا میں ہر مضرت کے ساتھ ایک منفعت ضرور ہوتی ہے۔ اور ایک بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں

اسی تکلیف کے بہت سے مبتلا بھی نظر آتے ہیں اور مشہور ہے اَلْبَلِیَّۃُ اِذَا عَمَّتْ خَفَّتْ (جو مصیبت عام ہو جاتی ہے ہلکی معلوم ہوتی ہے) اور طبعی امر بھی ہے کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بعض اوقات درد اور تکلیف میں لذّت محسوس ہونے لگتی ہے خوب کہا ہے۔ ؎

پای در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

(دوستوں کے ساتھ قید میں رہنا بھی غیروں کے ساتھ باغ میں رہنے سے بہتر ہے)

پھر بعض اوقات اُس کے ازالے کے اسباب بھی اختیار میں ہوتے ہیں اور اگر اُن سے زوال نہیں ہوتا تو بعض اوقات کچھ سکون ہی ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اگر شدّت ہوتی ہے تو اتنی کہ سہار ہو سکے چنانچہ شدت تکلیف میں نیند کا آجانا اس کی دلیل ہے کہ تکلیف قابل برداشت ہے۔ اکثر اوقات دل بھی بٹ جاتا ہے غرض دنیا کی تکلیف کی تو یہ کیفیت ہے۔ اب آخرت کے عذاب کو دیکھئے کہ اس میں راحت کا نام بھی نہیں ہے سر سے پانوں تک تکلیف ہی میں غرق ہوگا کہ نہ سر کو چین نہ پیر کو نہ ہاتھ کو۔ ایک شخص جس کو سب سے کم عذاب ہوگا اس کی بابت حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کو آگ کی جوتیاں پیر میں پہنا دی جائیں گی مگر شدت کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا سر مثل دیگ کے پکتا ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کوئی عذاب میں نہیں۔ صاحبو! کیا یہ کچھ کم مضرت ہے اور اگر اب بھی اس کا احساس نہیں ہوا تو امتحان کے لئے اپنی انگلی آگ کے اندر رکھ کر دیکھ لیجئے اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ اس عذاب کی کیا کیفیت ہوگی جو دنیا کی آگ سے ستر درجے زیادہ ہے کیونکہ جب اس آگ میں ایک منٹ بھی انگلی نہیں رکھی جاتی تو اس آگ کا برسوں تحمل کیسے ہوگا بلکہ اگر بہت ہی کم مثلاً ایک ہی دن کی اُس میں قید ہوگئی تو اس کا بھی تحمل کیسے کیا جاوے گا بالخصوص جبکہ وہ دن بھی ہزار برس کے برابر ہو۔ چنانچہ خود ارشاد ہے۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (تحقیق وہ دن تیرے رب کے نزدیک تمہاری شمار کے لحاظ سے ہزار برس کے برابر ہوگا) اس پر شاید لوگوں کو تعجب ہو بلکہ عجب نہیں کہ ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ جماعت کو

اس پر ہنسی آئے کہ ایک دن ہزار برس کا کیسا ہوگا۔ لیکن واقع میں یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے دیکھو دنیا میں بھی عرض تشعین میں چھ ماہ کا ایک دن ہوتا ہے تو جیسا دنیا میں اتنا بڑا دن موجود ہے تو اگر اُس عالم کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہو تو کیا تعجب ہے کیونکہ معظم معمورہ اور ارض تشعین تو پھر بھی اس عالم کے اجزاء ہیں جب ایک ایک عالم کے اجزاء ہو کے خواص میں اس قدر تفاوت ہے تو جہاں عالم ہی بدل گیا وہاں اگر اس سے زیادہ تفاوت ہو جائے تو تعجب کیا ہے۔ تو اگر وہاں ایک دن کی سزا بھی ہو گئی تو کمیۃً یہاں کے ہزار برس کے سزا کی برابر ہے۔ اور کیفاً اس سے بھی زیادہ۔ دوسرے دنیا میں یہ راحت تھی کہ ہمدرد غمخوار موجود تھے وہاں یہ حالت ہوگی کہ کوئی بھی نہ پوچھے گا پھر یہ کہ یہاں تو اپنے سے زیادہ تکلیف میں دوسرے کو مبتلا دیکھ کر تسلی بھی کر لیتا ہے اور وہاں ہر شخص کو یہ خیال ہوگا کہ مجھ سے زیادہ کوئی تکلیف میں مبتلا نہیں ہے۔ اور اگر خدانخواستہ عذاب ابدی ہوا تو غضب ہی ہے کیونکہ وہاں کبھی موت بھی نہ آئے گی بلکہ یہ حالت ہوگی کہ

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ

(جب ان کی کھال جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو ہم ان کی دوسری کھال بدل دیتے ہیں۔ تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں)

تو تعجب ہے مسلمان پر کہ دنیا کی اتنی ہلکی تکلیف کو تو تکلیف سمجھے۔ اور اتنی بڑی مضرت پر نظر نہ کرے یہ تو جواب اُن لوگوں کے لئے تھا کہ اُن کا وجدان صحیح نہیں ہے کہ اُن کو گناہ کی مضرت عاجلہ محسوس نہیں ہوتی اور وجدان کے بُطلان کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ گناہ کا یہ بھی خاصہ ہے کہ انسان کی عقل اور سلامت فطرت اِس سے بالکل برباد ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کا ادراک صحیح ہے اُن کے لئے اس سوال کا کہ گناہ میں کیا مضرت ہے علاوہ جواب مضرتِ آخرت کے یہ بھی جواب ہے کہ گناہ میں مضرتِ عاجلہ بھی ہے لیکن ہم اپنی بے تمیزی سے اُس مضرت کو لذت سمجھتے ہیں۔ میں ابھی اس کو عرض کروں گا لیکن اول ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

مشہور ہے کہ ایک غیر ملکی وحشی ہندوستان میں آیا اتفاق سے آپ ایک حلوائی کی دکان سے گذرے وہاں گرم گرم حلوا رکھا ہوا تھا خوشبو سونگھ کر طبیعت للچائی۔ درم و دام کچھ پاس نہ تھے۔ آپ نے اس میں سے ایک لب بھر کر حلوا اٹھایا اور کھا گئے۔ حلوائی نے رپٹ لکھوائی افسر نے چالان کو غلیجان سمجھ کر تنبیہ کے لئے حکم دیا کہ اس کو گدھے پر سوار کر کے اس کے پیچھے لڑکے ڈفلی کھنجری بجاتے ہوئے تشہیر کرتے ہوئے شہر بدر کر دیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ جب یہ اپنے ملک واپس ہوا لوگوں نے ہندوستان کا حال پوچھا۔ آپ فرماتے ہیں۔ ہندوستان خوب ملک ست حلوا خوردن مفت ست سواری خر مفت ست فوج طفلان مفت ست ڈم ڈم مفت ست ہندوستان خوب ملک ست۔ تو جیسا اس وحشی نے غایت غباوت سے اس سامانِ ذلت کو سامانِ عزت قرار دیا تھا ایسا ہی ہم بھی اپنے سامانِ کلفت کو سامان لذّت سمجھتے ہیں۔ یہ تو مثال تھی مگر میں مثال پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اس کی حقیقت بتلاتا ہوں غور کیجئے اور غور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو آپ نے سامانِ لذت سمجھ رکھا ہے کبھی اس سے گذر کر اُس کے متضاد حالت پر بھی نظر کیجئے تب آپ کو اس لذّتِ ظاہری کے کلفتِ حقیقیہ ہونے کا احساس ہو کیونکہ ادراک کے غلط ہو جانے کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اس سامان کے مقابل کو نہیں دیکھا قاعدہ مقررہ ہے کہ اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِهَا (ہر قسم کی چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) دیکھو جو مینڈک کیچڑ میں رہتا ہو اور اُسی میں پیدا ہوا ہو وہ چونکہ شفّاف پانی سے واقف نہیں اس لئے اُس کے نزدیک وہ سڑا ہوا کیچڑ ہی شفاف پانی ہے لیکن اگر کسی شفاف شیریں خوش ذائقہ خوش رنگ چشمہ پر اس کا گذر ہو تو اس کو حقیقت اس کیچڑ کی معلوم ہو سکتی ہے۔ تو ہم نے چونکہ ہوش کدورات ہی میں سنبھالا ہے اس لئے ہم کو اِس کی برائی یا اچھائی کی اطلاع نہیں۔ امتحان کے لئے یہ کیجئے کہ ایک ہفتہ بھر کے لئے گناہ کو چھوڑ دیجئے اور اپنے دنیوی کاموں کا کوئی بند و بست کر کے اور ان

ایام میں تلاوت اور ذکر اللہ میں مشغول رہئے اور کسی قسم کی نافرمانی اس زمانے میں نہ کیجئے صرف ایک ہفتہ بھر ایسا کر لیجئے۔ اس کے بعد اپنے قلب کو دیکھئے کہ کیا حالت ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالے اپنے قلب میں ایک بہار اور شگفتگی پائیں گے اور اس کے بعد پہلی حالت معصیت پر تو آپ خود بخود آہی جائیں گے۔ اس کے بعد جب ایک دو دن معصیت میں گذر چکیں پھر دیکھئے قلب کو کہ کیا حالت ہے اور پہلی حالت سے موازنہ کیجئے۔ واللہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ جمعیت تھی اور یہ تشویش ہے وہ راحت تھی یہ کلفت ہے وہ لذّت تھی یہ مصیبت ہے اس وقت آپ کو گناہ کر کے ایسی تکلیف ہوگی جیسے کسی کانٹے کے لگ جانے سے ہوتی ہے۔ بخدا جو لوگ گناہ سے بچتے ہیں ان کو گناہ سے ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے بلکہ اگر بلا ضرورت نافرمان کے پاس بھی بیٹھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی کم ہمتی سے یہ امتحان بھی نہ کرنا چاہے کہ اس میں چندے فارغ للطاعات ہونا پڑتا ہے تو میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بحالتِ موجودہ ہی غور کر لیجئے کہ آپ کو کبھی سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے یا ہر وقت تکلیف اور پریشانی ہی میں گذرتی ہے اگر اس کا بھی اندازہ نہ ہو تو اور آسان بتلاتا ہوں کہ اہل اللہ کے پاس جائیے اور اہل اللہ سے مراد خاص وہ لوگ نہیں ہیں کہ ان کے بیوی بچے کچھ بھی نہ ہوں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کو اصلی محبت صرف خدا سے ہے اگرچہ بیوی بچے بھی اُن کے ہیں تو ایسوں کے پاس جائیے اور دیکھئے کہ مصیبت میں اُن کی کیا حالت ہوتی ہے اور راحت میں کیا حالت ہوتی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مصیبت و راحت دونوں میں ان کی یہ حالت ہے کہ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔ ایک بزرگ کی خدمت میں کسی نے ایک نہایت قیمتی موتی بھیجا جب ان کے پاس پہونچا تو فرمایا الحمد للہ اُس کے بعد وہ موتی گم ہو گیا آپ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا الحمد للہ۔ خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ اجتماع المتضادین کیسا کہ آنے پر بھی خوشی

اور گم ہونے پر بھی خوشی۔ فرمایا اصل خوشی آنے جانے پر نہیں ہوئی بلکہ ایک دوسری بات پر ہوئی وہ یہ کہ جب یہ موتی آیا تھا تو میں نے اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ اس کے ساتھ قلب کو زیادہ تعلق تو نہیں ہوا مگر معلوم ہوا کہ نہیں میں نے خدا کا شکر کیا۔ اس کے بعد جب یہ گم ہو گیا تو میں نے قلب کو دیکھا کہ اس میں غم کا اثر تو نہیں ہوا معلوم ہوا کہ نہیں۔ اس پر میں نے پھر خدا کا شکر کیا تو یہ الحمدللہ اس پر تھا کہ نہ آنے سے خوشی ہوئی اور نہ جانے سے غم ہوا۔

اسی طرح حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آئینہ چینی لایا گیا آپ نے خادم کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ جب ہم طلب کیا کریں تو لایا کرو۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ آئینہ خادم سے ٹوٹ گیا۔ وہ نہایت خوف زدہ ہوا اور سہم گیا اور عرض کیا کہ ازقضا آئینہ چینی شکست۔ آپ نے فرمایا کہ خوب شد اسباب خود بینی شکست گویا محض مزاح میں اس کو اڑا دیا اور کچھ بھی اثر یا تغیّر مزاج مبارک پر نہ ہوا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جتنی پریشانی ہوتی ہے تعلق ماسوی اللہ سے ہوتی ہے اور جن لوگوں کو خدا سے تعلق نہیں ہے وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں اور وجہ ان کی اس پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر امر کے متعلق ایک خاص تجویز اپنے ذہنوں میں تراش لیتے ہیں جیسے شیخ چلی کا تجویز کردہ خاندان تھا۔ تو ہم سب اس بلا میں مبتلا ہیں کہ ہر وقت بیٹھ کر یہ دُھن لگایا کرتے ہیں کہ یوں تجارت ہو گی، اتنا نفع اس میں ہو گا، یوں ہم بنک میں روپیہ داخل کریں گے۔ اور یہ تجربہ کی بات ہے کہ ہر تمنا پوری ہوتی نہیں تو سارے رنج کی بات یہ ہے کہ آرزو کرتا ہے اور وہ پوری ہوتی نہیں۔ کوئی دنیا دار کسی وقت آرزو سے خالی نہیں ہے تو ہر وقت کسی نہ کسی تمنا میں رہتا ہے اور تمنا پوری ہونا ضروری نہیں اس لئے پریشانی ہوتی ہے تو کوئی دنیا دار پریشانی سے خالی نہیں۔ اور اہل اللہ کی راحت کا راز یہ ہے کہ ہر کام اُنھوں نے مفوّض بحق کر دیا ہے۔ اپنی کچھ تجویز نہیں کرتے تو جو کچھ ہوتا ہے ان کے لئے ایذاء دہ نہیں ہوتا۔

حضرت بہلول نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے کہنے لگے کہ اس شخص کے مزاج کی کیا کیفیت پوچھتے ہو کہ دنیا کا ہر کام اُس کی خواہش کے موافق ہوتا ہو۔ حضرت بہلول نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے وہ کہنے لگے کہ یہ تو عقیدہ ہی ہے کہ کوئی کام خدا کی خواہش کے خلاف نہیں ہوتا تو جس نے اپنی خواہش کو بالکل خدا تعالیٰ کی خواہش میں فنا کردیا ہو تو جس طرح ہر کام خدا کی خواہش کے موافق ہوگا اس طرح اس شخص کی خواہش کے موافق بھی ہوگا کوئی بات اُس کی خواہش کے خلاف نہ ہوگی اور جب یہ نہیں تو اس کو رنج کیوں ہوگا۔ یہ راز ہے اس کا کہ اہلِ دنیا کو کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی اور اہل اللہ کو کبھی رنج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو اہل اللہ کو مریض ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اُن پر مختلف انواع کے صدمات بھی پڑتے ہیں تو صاحبو میں نے الم یعنی دکھ کی نفی نہیں کی اُن کو الم ہوتا ہے لیکن پریشانی و کوفت نہیں ہوتی اُس الم کی ایسی مثال ہے جیسے فرض کرو کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہے اور ایک مدت کے بعد محبوب کی زیارت اس کو نصیب ہوئی اور اس کو دیکھ کر بالکل از خود رفتہ ہوگیا۔ اِسی حالت میں محبوب کو سلام کیا اس نے بجائے جواب دینے کے دوڑ کر اس کو گلے سے لگالیا اور خوب زور سے دبایا کہ اس کا ارمان پورا ہوجائے۔ عاشق چونکہ فراق کی تکلیف میں بالکل ہی گھل چکا تھا اس کے دبانے پر لگیں ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے عین اس دبانے کی حالت میں اتفاقاً ایک رقیب آگیا اس کو دیکھ کر محبوب نے کہا کہ اگر میرے دبانے سے تم کو تکلیف ہوتی ہو تو تم کو چھوڑ کر اس کو دبالوں۔ اب غور کیجئے کہ وہ عاشق اس کا کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا نصیبہ ایسا نہ ہو کہ وہ تیری تلوار کا مقتول ہو خدا کرے یہ سعادت تیرے عشاق کی قسمت میں ہی آئے اور دوستوں کا سر سلامت چاہیئے کہ اپنے خنجر کو آزماتا ہے)

اور یہ کہے گا۔ ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند
شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی تیری قید سے رہائی کی خواہش نہ کرے گا تیرا شکار پھندے سے نکلنا پسند نہ کرے گا)

اور یہ کہے گا کہ ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار دلبرم

(اگر تو دو سو زنجیریں بھی لگائیگا تو میں ان کو توڑ دوں گا سوائے اس معشوق کی زلف کے جو میرے دل کو لے جانے والا ہے)

کیا اس قید کو وہ گراں سمجھے گا ہرگز نہیں ہاں تکلیف جسمانی ضرور ہوگی مگر قلب کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس میں راحت بھری ہوئی ہوگی بلکہ زبان سے یہ نکلتا ہوگا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

اسی طرح اہل اللہ کو اگر تکلیف پہونچتی ہے تو جسمی مگر قلب اُن کا ہر وقت راحت میں ہے۔ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ گناہ کرنے والے کیسی تکلیف میں ہیں کہ کسی وقت راحت نصیب نہیں تو گناہ سے یہ فوری مضرت ہوتی ہے نیز اس کے سوا ایک اور بھی تکلیف ہوتی ہے اور ہے وہ بھی عاجل مگر فعل کے بعد ہوتی ہے اور یہ مذکورہ بالا فعل کے ساتھ تھی وہ یہ ہے کہ جتنے گناہ کرنے والے ہیں وہ ہمیشہ کسی نہ کسی آفاقی مصیبت میں بتلا رہتے ہیں جیسے یہ مذکورہ کلفت مصیبت انفسی تھی ارشاد خداوندی ہے اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (اور کیا ان کو نہیں دکھلائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں مگر بھی باز نہیں آتے اور نہ کچھ سمجھتے ہیں)

مگر لوگ اس قسم کے مصائب کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسے وقت کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کونسا گناہ ہوا تھا جس کے سبب یہ تکلیف جھیلنی پڑی۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں تکلیف گناہ کے سبب ہوا کرتی ہے مگر تعجب صرف اس پر ہے کہ کونسا گناہ ہم سے ہوگیا تھا۔ مجھے لوگوں کے اس تعجب ہی پر تعجب ہے کیونکہ ہم میں وہ ایسا کون ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا نہیں رہتا اور جب ہر وقت گناہ میں مبتلا رہیں تو تعجب تو آفات میں مبتلا نہ ہونے پر کرنا چاہیئے تھا۔ بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ گناہ کرنے سے دنیا کی بھی پریشانی ہوتی ہے اور آخرت کی الگ رہی۔ اب خدا تعالےٰ کی رحمت کو دیکھئے کہ فرماتے ہیں کہ اس مضرت سے بچو۔ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو) آپنے دیکھا کہ کتنی بڑی مضرت سے خدا تعالےٰ نے بچایا ہے۔ اور میں نے اِس کے بیان کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس کے متعلق ہم میں چند طرح کی کوتاہیاں ہیں ایک تو یہ کہ ہم میں اکثر کو تو دین ہی کی خبر نہیں اُن کا تو یہ مذہب ہے کہ ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کیوں صاحب اگر کوئی شخص آپ کو زہر بھرا لڈو لا کر دے تو کیا اسی اپنے قول کے موافق وہاں بھی عمل کرو گے کہ کل کے دن کیا خبر کیا گذرے اب تو لڈو کھانے کو ملتا ہے یا کہ اس کے انجام بد پر نظر کر کے اس کو ترک کر دو گے۔ تو کیا قیامت آپ کے نزدیک کل سے کچھ زیادہ دور ہے۔ صاحبو! کل کے چار بجے تو ۲۴ گھنٹے یقینی ہیں اور قیامت کے متعلق تو ۲۴ منٹ کی بھی خبر نہیں اس لئے کہ شاید ہیں نَفَس نَفَسِ واپسیں بود (شاید یہ ہی سانس آخری سانس ہو) موت کا کوئی مقرر اور معین وقت نہیں۔ لوگ اس دھوکے میں ہیں کہ ابھی تو ہم جوان ہیں۔ صاحبو! لوگوں کو اس طرح موت آگئی ہے کہ خود ان کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ اب ہم مرجائیں گے۔

کانپور میں ایک صاحب گھر میں آئے کھانا مانگا۔ ماما کھانا اتار کر لائی دیکھا تو آقا صاحب ختم ہو چکے۔ غرض موت کا کوئی قاعدہ اور وقت مقرر نہیں ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض آپ سو برس کے بھی ہو گئے تو کیا ہوگا۔ وہ سو برس بھی جب گذر جائیں گے تو ایک دن کی برابر بھی نہیں معلوم ہوں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے جن کی عمر قریب ڈیڑھ ہزار برس کے ہوئی حضرت عزرائیل علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ نے دنیا کو کیسا پایا، فرمایا جیسا دو دروازے والا ایک گھر ہو کہ ایک دروازے سے داخل ہوا اور گذرتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل جائے اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ آپ کی عمر کے مثلاً چالیس چالیس پچاس پچاس برس گذر گئے ہیں مگر غور کر کے دیکھو کہ یہ اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا جیسے آیندہ کل کا دن تو موت کو مدید اور بعید سمجھنا بڑی غلطی کی بات ہے۔ جب وہ آئے گی تو یہ حالت ہوگی جیسے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں قَالَ کَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّیْنَ (ارشاد ہوگا کہ اچھا یہ بتلاؤ تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین پر رہے ہوگے وہ جواب دیں گے کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہوں گے اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں سو گننے والوں سے پوچھ لیجئے) خیال تو کیجئے اتنی بڑی بڑی عمریں اور جب پوچھا جائے گا تو ایک دن سے بھی کم معلوم ہوں گی تو جب یہ حالت ہے تو پھر کاہے پر ادھار کھائے ہوئے بیٹھے ہو۔ صاحبو! جس وقت ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے تو جیل خانہ کو بہت بعید سمجھتا ہے لیکن جب سزا کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قریب تھا۔ تو یہ کہنا کہ اب تو آرام سے گذرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے کتنی بڑی غلطی کی بات ہے۔ حضرت خدا تعالیٰ تو جانتا ہی ہے عاقبت کی خبر لیکن جس کو خدا بتلا دے وہ بھی جانتا ہے۔ اگر کوئی مریض کہے کہ طبیب جانے کہ اس غذا میں کیا نقصان ہے تو اُس سے کیا کہو گے یہی کہ بھائی طبیب تو بے شک جانتا ہے لیکن جب اس نے تمہیں بتلا دیا تو اب تو تم بھی جانتے ہو اسی طرح عاقبت کی حالت جب خدا تعالیٰ نے تم کو بتلا دی تو تم بھی تو جان گئے

پھر غفلت اور جرأت کیسی اور بہت لوگ جو دنیا کے پیچھے پڑے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ موت اور عاقبت کو بھول گئے ہیں۔اسی لئے حدیث میں آیا ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَھَاذِمِ اللَّذَّاتِ اَلْمَوْتُ (دنیا کی لذتوں اور مزوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھو) ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اس مراقبہ کا دوام کرے اور سوتے وقت اس طرح غور کرے کہ مرنے کے بعد یہ خدم وحشم سب چھوٹ جائے گا اور میں اکیلا رہ جاؤں گا اور صرف باز پرس رہ جائے گی اور سوچے کہ حضرت سیوطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اگر ہزار تلوار لگیں تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی جان کے نکلنے میں ہوتی ہے اور ظاہر بھی ہے کہ ذرا بدن کا ایک رُواں توڑ کر دیکھیے تو کس قدر تکلیف ہوتی ہے تو جب فرشتہ پوری جان نکالے گا اس وقت کیا عالم ہوگا۔اسی طرح سوچو کہ حشر ونشر کے وقت کیا حالت ہوگی جب اس طرح سوچو گے تو دنیا سے دل سرد ہو جائے گا میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم تجارت زراعت کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کسی کام میں دل نہ لگاؤ۔ ایک قطعہ مجھے اس مضمون کے مناسب ایک ناصح کا یاد آیا فرماتے ہیں ؎

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملکِ روس اور کیا سرزمین طوس ہے
گر میسّر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرف آوازِ طبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

یہ تو ہوس کا فتوے تھا آگے کہتے ہیں کہ ؎

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے

اور کیا تماشا دکھلایا کہ ؎

لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف

جس جگہ جانِ تمنا سوطرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا اور یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ وحشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی اِن کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

خیال فرمایئے بڑے بڑے ملوک اور سلاطین گذر گئے مگر اُن کا کہیں نشان بھی باقی نہیں ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ بادشاہوں کا تو کہیں تاج بھی باقی نہیں لیکن بزرگوں کی جوتیاں تک بھی تبرکاً باقی ہیں اس سے موازنہ کرنا چاہیئے طلب دنیا اور طلبِ حق کے اثر ہیں۔ غرض ایک کوتاہی تو ہم میں یہ تھی کہ دین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور دوسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر توجہ کرتے ہیں تو بے ترتیبی سے کرتے ہیں ترتیب موافق عقل اور شرع کے یہ ہے کہ جلبِ منفعت سے دفع مضرت اہم ہے چنانچہ اطبا کا اتفاق ہے کہ علاج سے زیادہ ضروری پرہیز ہے تو اس وقت اگر توجہ بھی ہوتی ہے تو وظائف کی طرف اوراد کی طرف جو کہ جالبِ منفعت ثواب ہے اور آجکل اسی کا نام لوگوں نے بزرگی رکھا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا دین دار ہے کہ ایک قرآن شریف روزہ پڑھتا ہے۔ رات بھر جاگتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ دین نہیں اپنے مرتبہ میں یہ بھی دین ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ضروری کوئی چیز ہے اور وہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ گناہ کی چیزوں سے بچے جو کہ دفع مضرت ہے اس وقت اس کا مطلقاً خیال نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک تسبیح بھی نہ پڑھے مگر گناہ چھوڑ دے غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے اور غیر خدا کی محبت سے دل کو خالی کردے ور ایک نفل بھی نہ پڑھے ایک تو ایسا ہو اور دوسرا ایسا ہو کہ ساری رات جاگے عبادت کرے قرآن شریف پڑھے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو حقیر

سمجھے ان کو تکلیف پہونچائے اور بھی گناہ کرے تو خوب سمجھ لو کہ پہلا ناجی ہے اور دوسرا ناری ہے خدا تعالیٰ نفلوں کو نہیں دیکھتے۔ حدیث میں ہے لَاتَعْدِلْ بِالرِّعَةِ یعنی ورع کی برابر کسی عمل کو نہ سمجھو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ذکر کیا کہ فلاں عورت بہت روزے رکھتی ہے لٰکِنْ تُؤْذِیْ جِیْرَانَهَا (لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے) فرمایا هِیَ فِی النَّارِ (وہ دوزخی ہے) پھر ایک دوسری عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ بہت زیادہ عبادت (یعنی نفل وغیرہ) نہیں کرتی لَا لٰکِنْ تُؤْذِیْ جِیْرَانَهَا (لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی) فرمایا هِیَ فِی الْجَنَّةِ (وہ جنت میں ہے) آجکل ہمارے دین دار بھی دین کی وہ چیزیں لیتے ہیں جن کی کوئی صورت محسوس ہے یعنی وجودی عبادت اور جس کی کوئی صورت محسوس نہ ہو جیسے ترک معصیت کا اس کا اہتمام کم کرتے ہیں حالانکہ اس میں نفس کا کید ہے کہ وجودی عبادت میں لوگوں کی نظروں میں عزت و وقعت ہوتی ہے اور ترک میں کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا مثلاً اگر ایک شخص ساری عمر کسی کی غیبت نہ کرے تو دوسروں کو پتہ بھی نہیں چل سکتا کیونکہ وہ تو ترک ہے اور ترکِ فعل نظر میں نہیں آیا کرتا نظر میں تو کسی فعل کا ارتکاب ہی آتا ہے یہی وجہ ہے کہ وجودی عبادت تو کرتے ہیں مگر گناہ کو نہیں چھوڑتے اور اگر چھوڑا بھی تو بعض کو اور یہ بعض کا چھوڑنا بعض کا نہ چھوڑنا تو نہ چھوڑنے ہی کے حکم میں ہے۔ مثلاً اگر ہم نے غیبت کو نہ چھوڑا اور گالی کو چھوڑ دیا تو من وجہٍ نہ چھوڑنا ہی ہے۔ کیونکہ گالی وغیرہ کو ہم نے اس لئے چھوڑا ہے کہ اس میں بدنامی کا اندیشہ ہے۔ تو راز اس میں بھی وہی ہے کہ ایک گناہ مضرِ جاہ ہے اور دوسرا نہیں ورنہ اگر خدا کے خوف سے چھوڑا جاتا تو سب گناہ چھوڑ دینے چاہئیں تھے۔

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر گناہ کو چھوڑتے ہیں تو بعض کو اور بعض کو نہیں جیسا پہلے ضمناً عرض کیا اور اگر کوئی بزعم خود سارے گناہوں کو بھی

چھوڑے تو اس میں کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ ظاہری گناہوں کو جو کہ ہاتھ پیر کے ہیں اُن کو چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ گناہ انہی کو سمجھتے ہیں اگر کسی سے پوچھا جائے کہ گناہ کیا کیا ہیں تو وہ انہی کو گنوائے گا۔ کبھی ریا اور کینہ وغیرہ کا نام بھی نہ لے گا وجہ یہی ہے کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ خدا تعالیٰ نے ان سب کوتاہیوں کا علاج اس میں فرمایا ہے کہ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ط (تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو) پس اس میں یہ بات بھی بتلادی کہ بڑی بات یہ ہے کہ گناہ کو چھوڑا جائے اور سب کو چھوڑا جائے، اور یہ بھی بتلا دیا کہ گناہ دو قسم کے ہیں ظاہری اور باطنی یعنی جوارح کے متعلق بھی اور قلب کے متعلق بھی۔

گناہ کی فہرست تو بہت بڑی ہے مگر میں مثال کے طور پر مختصراً کہتا ہوں کہ مثلاً آنکھ کا گناہ ہے، کسی نامحرم کو دیکھنا اَمرد کا دیکھنا یا اجنبی کا ایسا بدن دیکھنا کہ اس کا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے جیسے عورت کے سر کے بال اور یہ مسئلہ عورتوں کو بھی بتلانا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اس میں بہت مبتلا ہیں۔ ایک گناہ آنکھ کا یہ ہے کہ کسی کی چیز دیکھ کر حرص کرے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ

(ہرگز مت اٹھاؤ اپنی آنکھوں کو اس چیز کی طرف جو ہم نے کفار کو ان کی آزمائش کے لئے نفع کے واسطے دی ہیں یعنی دنیا کی رونق وغیرہ)

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ مال حاصل نہ کرو بلکہ مطلب یہی ہے کہ مال کو قبلہ وکعبہ نہ بناؤ کہ اس کی بدولت دین ہی ہاتھ سے جاتا رہے۔ اسی طرح زبان کا گناہ چغلخوری ہے، غیبت ہے جھوٹ بولنا ہے آج کل کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاءاللہ اس کا علاج یہ ہے کہ جو کچھ بولو سوچ کر بولو کہ میں

کیا کہوں گا اور وہ بات خلاف مرضیٔ حق تو نہ ہوگی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ زبان کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ کان کا گناہ یہ ہے کہ چھپ چھپ کر کسی کی بات سُننے گا نا سُننے۔ ہاتھ کا گناہ یہ ہے کہ کسی نامحرم کو چھوئے کوئی ناجائز مضمون لکھے پیر کا گناہ یہ ہے کہ کسی ناجائز موقع پر چلا جائے۔ اور ایک پیٹ کا گناہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزی حلال مل ہی نہیں سکتی۔ جب حلال نہیں مل سکتی تو حرام حرام سب برابر پھر کہاں تک بچیں۔ صاحبو! یہ گمان بالکل غلط ہے جس کو فقہ حلال کہدے وہ بلاشبہ حلال ہے۔ لوگ علماء سے پوچھتے نہیں ورنہ بہت سی حلال صورتیں نکل آئیں۔ افسوس ہے معاملات میں وکلاء سے تو مشورہ کیا جاتا ہے مگر اہل علم سے کبھی مشورہ نہ کریں گے اور یہ نہ پوچھیں گے کہ یہ ناجائز ہے یا جائز۔ صاحبو! اگر عمل کی بھی توفیق نہ ہو تب بھی ہر معاملہ کو پوچھ تو ضرور ہی لو۔ اگر آتشک ہو تو اس کا نسخہ تو ضرور ہی یاد کر لو اگرچہ اس کو برتو نہیں کیونکہ معلوم ہوگا تو کبھی تو توفیق ہو ہی جائے گی۔ اسی طرح تمام بدن کے متعلق ایک گناہ ہے کہ لباس کفار کے مشابہ پہنا جائے۔ صاحبو! اگر تمہارے نزدیک مذہبی حکم کوئی چیز نہیں تو اسلامی غیرت تو ہونی چاہیئے۔ کیا یہ غیرت کی بات نہیں آخر قومی امتیاز بھی کوئی چیز ہے اور اگر ہے تو اس کا کیا طریقہ ہے۔ غضب ہے کہ اکثر ہندو تو ایسی وضع اختیار کرنے لگے ہیں۔ جیسے مسلمان کی ہونی چاہئے۔ اور مسلمان ہندوؤں کی وضع اختیار کرنے لگے ہیں۔ میرے بھائی کے پاس ایک تحصیلدار اور ایک سب انسپکٹر آئے۔ تحصیلدار ہندو مگر ریش بروت مسلمانوں کا سا۔ اور سب انسپکٹر صاحب مسلمان مگر چہرہ ہندوؤں کا۔ خدمت گار نے پان تحصیلدار کے سامنے رکھدیئے تو سب انسپکٹر ہنسے، تحصیلدار صاحب بھی ہنسے، نوکر سمجھ گیا اور پان سب انسپکٹر کے سامنے رکھدیئے۔ بھائی

نے کہا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک نوکر آپ کو ہندو سمجھے۔ صاحبو! غیرت کرنی چاہیئے اور ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس تبدّلِ ہیئت میں مصلحت کیا ہے بجز اس کے کہ یہ ایک غیر مسلم قوم کا لباس ہے تو گویا نعوذ باللہ یہ مطلب ہوا کہ لاؤ ہم بھی کافر بنیں اگرچہ صورۃً ہی ہوں مجھے ایک ظریف کا قول یاد آیا کہنے لگے کہ اس وقت نوجوانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر اہل یورپ کسی مصلحت سے اپنی ناک کٹوالے لگیں تو یہ نوجوان بغیر سوچے سمجھے اپنی ناک بھی کٹوانے لگیں گے اور در اصل وجہ یہ ہے کہ اس تبدّل ہیئت کو باعثِ شوکت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ وضع اہل حکومت کی ہے۔ لیکن صاحبو! اگر شوکت بھی ہوئی تو نتیجہ کیا، شوکت تو اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ اغیار کے مقابلے میں اس سے کام لیا جائے نہ اس لئے کہ اپنوں ہی پر رعب جماویں پھر اوپر سے یہ لوگ ہمدردی قومی کے بھی مدعی ہیں یاد رکھو ہمدردی اور نفع رسانی اس شخص سے ممکن ہے کہ وہ قوم سے اختلاط و مناسبت پیدا کرے نہ کہ ان سے نفور ہو اور ان کو اپنے سے متوحش بنا دے بعض لوگ اس مسئلے میں یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم اس لباس سے کافر ہو جائیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر آپ عورت کا لباس پہن لیں تو کیا آپ عورت ہو جائیں گے، اور جب نہ ہو جائیں گے تو اس کو بھی کیوں اختیار نہیں کیا جاتا اور بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان کو شوکت سے بھی کوئی تعلق نہیں مثلاً تصویر رکھنا، کتا پالنا، ڈاڑھی منڈانا۔ مجھے ایک اپنی اور ایک دوسرے صاحب کی حکایت یاد آئی۔ اپنی تو یہ کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا کہ ایک جنٹلمین جو کتا لئے ہوئے تھے مجھ سے فرمانے لگے کہ کتے میں ایسے ایسے اوصاف ہیں پھر اس کو پالنا کیوں منع کیا گیا۔ میں نے کہا کہ صاحب اس کا ایک تو عام جواب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ جواب ہزاروں شبہات کا ہے۔ دوسرا جواب خاص جواب ہے جو اس باب کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ اس میں باوجود ان صفات کے ایک ایسا عیب ہے کہ جس نے سب

اوصاف کو گرد کردیا اور یہ وہ ہے کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں اس لئے اس کا پالنا منع ہے۔ بس چپ ہی تو ہو گئے اور خوش ہو کر تسلیم کیا۔ اور دوسرے کی حکایت یہ ہے کہ ایک صاحب کتّا بغل میں دبائے بیٹھے تھے کسی نے کہا کہ اس میں کیا مصلحت ہے کہنے لگے تاکہ فرشتہ موت کا نہ آئے۔ انھوں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں آخر دنیا میں کتے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ اُن کی جان نکالتا ہے وہی تمہاری بھی نکالے گا۔ اور پہلی حکایت میں جو میں نے دوسرا جواب دیا تھا جس سے وہ بہت خوش ہوئے تھے واقع میں وہ کوئی بڑی بات نہیں بات اصلی تو وہی تھی کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے غرض بعضے گناہ میں تو بالکل ہی ضرورت ومصلحت کا کوئی درجہ نہیں گو جن کو ضروری سمجھا جاتا ہے بایں معنی کہ ان کے نہ کرنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے اور اُن کے لئے نفس کچھ حیلہ نکال لیتا ہے عقل صحیح کے سامنے وہ بھی لغو ہیں لیکن اس وضع کے بدلنے میں تو کسی درجے کا بھی نفع نہیں اور اس کے چھوڑنے میں کونسی تکلیف ہے تو یہ گناہ بالکل گناہ بے لذّت ہوا اور اگر بالفرض کوئی لذت وضرورت ہو بھی تو خدا کے حکم کے سامنے اپنی مصلحت کیا چیز ہے یہ تو ظاہری گناہ تھے اور باطنی گناہ یہ ہیں کہ مثلاً اہل دنیا تو دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور دیندار اس پیرایہ میں تو نہیں لیکن وہ اپنے کو بزرگ سمجھ کر دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ خوب کہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ کہاں کی بزرگی یہ کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکبِ مردانِ مردِ راہ
در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

(غافل مت رہ کہ جو لوگ منزلوں کو طے کرنے والے ہیں اُن کے گھوڑے پتھریلے راستوں کو بھی میدان کی طرح طے کر لیتے ہیں)

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(نا امید بھی مت ہو جاؤ کہ شراب عشق سے مست لوگ ایک آواز میں منزل پر پہونچ جاتے ہیں)

یہ گناہوں کی مختصر سی تفصیل ہے اب اس کا طریقہ سمجھئے کہ یہ کس طرح چھوٹیں۔ سو طریقہ یہ ہے

کہ سوچا کرو کم از کم سونے کے وقت آج ہم نے کیا کیا شرارتیں کی ہیں اس کے بعد سوچو کہ ان پر کیا سزا ہونے والی ہے اس کے بعد سوچو کہ ہم نے اس سزا سے بچنے کی کیا تدبیر کی ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو توبہ کرو اور خوب روؤ اسی طرح روزانہ کیجئے پھر ایک چلّے کے بعد دیکھئے کہ کتنی کایا پلٹ جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کیجئے کہ آپ کو گناہوں کی مفصل فہرست معلوم ہو جائے۔ آپ نے آج تک شاید سنا بھی نہ ہو کہ اگر ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرے اور بیس سیر اسباب ہو تو بغیر محصول دیئے لیجانا حرام ہے تو آپ کو ضروری ہے کہ علم دین حاصل کریں خواہ اردو ہی کی کتابیں ہوں مگر ہر رطب و یابس دیکھنے کے قابل نہیں بلکہ محقق علماء سے انتخاب کرا کے کتابیں دیکھو ہر قسم کی کتابیں نہ دیکھو بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب دیکھنے میں کیا حرج ہے تو صاحبو! حرج یہ ہے کہ آدمی ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے اور یہی راز ہے تقلید کا کہ اس تذبذب سے محفوظ رہے تو ہر قسم کی کتابیں نہ دیکھو بلکہ جو علماء محقق بے غرض ہیں ان کی کتابیں دیکھو۔ دوسرے یہ کہ ان کو کسی عالم سے پڑھ لو اور اگر پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو خود دیکھ لو مگر اس طرح کہ جہاں ذرا بھی شبہ رہے فوراً اس پر نشان بنا دو اور کسی عالم سے اس کو پوچھ کر حل کر لو۔ اور جیسے کھانے کی روزانہ ضرورت ہے اسی طرح اس کو بھی ساری عمر کے لئے ایک ضرورت کی چیز سمجھو اور مطالعہ کرو اور جو پڑھ نہیں سکتے وہ پڑھے ہوؤں سے سن لیا کریں اس طریقے سے ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں تمام امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افراد باخبر ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ وہ مراقبہ مفید ہوگا جو اوپر مذکور ہوا اس ترتیب کے ساتھ اگر کریں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد سب گناہ چھوٹ جائیں گے خدا تعالیٰ نے تھوڑے سے لفظوں میں ان سب کو بتلا دیا ہے کہ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۝

(تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں اُن کو ان کے کئے کی عنقریب سزا ملے گی)

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو وہ توفیق عمل عطا فرمائیں آمین یا رب العالمین۔

بالخــــــــــــــــــــــــیر